

ابنِ اَنَس

عَمَارَتِہ



ترتیب

| نمبر شمار | تفصیل | صفحہ نمبر |
|-----------|---------------------------|-----------|
| 1 | استاد مرحوم | 13 |
| 2 | فیض اور میں | 23 |
| 3 | جنتری نئے سال کی | 27 |
| 4 | نجات کا طالب غالب | 31 |
| 5 | ناول مینو-چکرچم کمپنی | 37 |
| 6 | مکمل باورچی خانہ جدید | 41 |
| 7 | ہماری کمرشل سروس | 44 |
| 8 | چند غیر ضروری اعلانات | 47 |
| 9 | اشتبہارات ضرور نہیں ہے کے | 50 |
| 10 | ہم مہمان خصوصی بنے | 53 |
| 11 | ہم پھر مہمان خصوصی بنے | 58 |
| 12 | چند اشتہار | 61 |

| صفحہ نمبر | تفصیل | نمبر شمار |
|-----------|--------------------------------------|-----------|
| 64 | شادیاں بھی سلیس | 13 |
| 68 | آپ سے ملیے | 14 |
| 72 | ایک سپانہ ایک بے لوث کارکن کی طرف سے | 15 |
| 75 | چچہ اور نکٹ، کچھ اور امیدوار | 16 |
| 78 | چند مطالبات | 17 |
| 81 | ذرا فون کر لوں؟ | 18 |
| 85 | اے مرد مجاہد | 19 |
| 88 | آج کچھ قلموں کے بارے میں | 20 |
| 93 | قلم دیکھئے اور ثواب دارین حاصل کیجئے | 21 |
| 98 | قلم مائی کا ال سنسروتی ہے | 22 |
| 102 | ربائی سے رکابی تک | 23 |
| 104 | شاعی میرے کا فقیری سرزمہ | 24 |
| 108 | ذکر ایک موز شناس کا | 25 |
| 111 | ذکر حضرت مرثیہ الملت کا | 26 |
| 115 | تعمیری شاعری | 27 |
| 117 | انٹرویو علم دریاؤں سے | 28 |
| 120 | اخبار کل اور آج کے | 29 |
| 124 | سورج کا ذبیہ گول ہو گیا | 30 |
| 127 | باعث تحریر آنکھ | 31 |
| 129 | حکیم نقل بطور | 32 |

| نمبر شمار | تفصیل | صفحہ نمبر |
|-----------|---------------------------------------|-----------|
| 33 | سرکاری یوم اقبال | 132 |
| 34 | اک ذرا چاند تک | 135 |
| 35 | یونیورسٹی میں شعبہ حماقت کھل گیا | 138 |
| 36 | یہ پاگل پاگل پاگل پاگل فلمی دنیا | 141 |
| 37 | انجمن معین الاموات | 144 |
| 38 | دراصل ہم صوفی ہیں | 147 |
| 39 | یونیورسٹی پروفیسر اور طوطے کی توپ | 149 |
| 40 | چڑیا گھر کے دروازے صحافیوں پر کھل گئے | 151 |
| 41 | سائل اور گدا | 153 |
| 42 | میلہ مویشیاں میں شاعر کو انعام | 155 |
| 43 | اُردو ادب میں ہمارا مقام | 157 |
| 44 | نکٹوں کے کاٹنے کے اوقات | 158 |
| 45 | آگئے قوم کی بے لوث خدمت کرنے والے | 159 |
| 46 | انٹرویو رضیہ بٹ کا | 163 |
| 47 | سپاسنامے بند مت کیجئے | 166 |
| 48 | نیکس | 169 |
| 49 | صدارت | 171 |
| 50 | ہم نے افسانہ نگاری کیوں ترک کی | 175 |
| 51 | عدالت کی بے بی نے جھپی کر دی | 178 |
| 52 | کسٹم کا مشاعرہ | 181 |
| 53 | خطبہ صدارت حضرت ابن انشاء | 187 |

| صفحہ نمبر | تفصیل | نمبر شمار |
|-----------|--------------------------------------|-----------|
| 194 | دعوتوں پر پابندی (1) | 54 |
| 196 | بیٹر کی نہاری | 55 |
| 200 | روپیہ کمانا | 56 |
| 203 | مسئلہ بچوں کے ناموں کا | 57 |
| 206 | خطبہ حضرت بھینس الملک | 58 |
| 209 | ایک انا رو صد بیمار | 59 |
| 213 | دعوتوں پر پابندی (2) | 60 |
| 216 | کوڑے والی گلی سے کوچہ ابن انشاء تک | 61 |
| 218 | آئین پر ہماری رائے تو لی ہی نہیں گئی | 62 |
| 221 | اب موسم کا حال سنئے | 63 |

خوشہ اول

یہ مضمون اور خاکے انشاجی نے اس زمانے میں لکھے تھے جب پاکستانی قوم اپنی ساکھ بحال کرنے میں مشغول تھی۔ ان دنوں ہم لوگ ہنسنے ہنسانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ خوش رہنے یا خوش رکھنے کو شریفوں کا فعل نہ سمجھتے تھے اور اب جب کہ یہ مضمون کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہیں پاکستانی قوم پہلے سے زیادہ سخت اور کڑی ہو گئی ہے اور اپنے آپ پر ہنسنے یا دوسروں کی حماقتوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اپنی بیشتر توجہ، احتساب عام، پر صرف کرنے میں مصروف ہے۔ آدمی جب اس طرح کے تشنج میں مبتلا ہوتا ہے تو معالج عام طور پر اسے تن بہ تقدیر چھوڑ دیا کرتے ہیں لیکن انشاجی اپنے عہد کے وہ واحد ”جمع کثیر“ ہیں جنہوں نے اپنی ذاتی قربا دین سے خود پر ہنسنے کے نئے نئے نسخے دریافت کر کے بڑے بڑے جبرابند لوگوں کو زندہ رہنے پر مجبور کر دیا ہے

اپنے آپ پر ہنسنے کے لئے بڑے وقار اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو شخص اصل کا خاص شریف ہو اور شرافت محض اس کا پہناوا نہ ہو، وہی ایسی ہنسی کا کھیل کھیل سکتا ہے۔ اوروں پر ہنسا، دوسروں کا خاکہ اڑانا اور طنز کی تیغ سے کشتوں کے پستے لگانا بڑا آسان کام ہے۔ ہر متکبر اسی طرح سے کیا کرتا ہے لیکن یہ مزاح نگار کا کام نہیں۔ مزاح نگار تو انشاجی ایسا ہوتا ہے کہ جس کے ریشے میں تکبر نام کی کوئی چیز موجود ہی نہ ہو۔ نہ اصل زندگی میں نہ تحریر کے وجود میں۔

ان ہنسنے بولنے مضامین میں آپ کو بس ایک ہی دست تلی کی تھپکی ملے گی کہ انسان کبھی بھی

انسانی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا اور ہر حالت میں انسان کی حد تک ہی رہتا ہے۔ اس کی بڑائی، عظمت اور سر بلندی کے دعوے فقط اپنے آپ کو خوش کرنے اور تشفی دینے کے لئے ہوتے ہیں ورنہ حقیقت میں ہوتا انسان ہی ہے اور یہ جو اس کی کبھی کبھار کی ڈیگ ہے تو محض خسارِ گندم کی وجہ سے ہے اور جو کہیں یہ خسار نہ ہو تو خود بھی بڑے آرام میں رہے اور دوسروں کو بھی آرام سے رہنے دے۔ انشاجی کا اپنا ایک فلسفہ تھا کہ زندگی اور زندگی کے مسائل کا کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کیونکہ نتیجہ کچھ لکھتا ہی نہیں۔ حاصل کچھ ہوتا ہی نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ حاصل تو صرف حساب کے سوالوں کا ہوتا ہے اور زندگی نہ حساب ہے نہ سوال!

جن دنوں یہ مضمون رسالوں میں چھپا کرتے تھے ہم انشاجی کو منع کرتے تھے کہ ایسے عام فہم، سادہ اور ”دل خوش کن“ مضمون نہ لکھا کریں۔ ایسے مضمونوں کی اشاعت سے ہم سب دوستوں کے تحریر علمی کی بیٹی ہوتی تھی اور لوگ ہمیں بھی عام فہم قسم کے ادیب سمجھنے لگے تھے۔ ہمارے بار بار زور دینے پر کہ آخر ہم کو بھی زندہ رہنا ہے اور تاریخِ ادب کے ایوان میں اپنے لئے مناسب گوشہ فراہم کرنا ہے، انشاجی نے اوپر سے دل سے ہماری بات مان لی تھی۔ لیکن وعدہ کرنے کے باوجود انہوں نے ہماری اس درخواست پر کبھی بنجیدگی کے ساتھ عمل نہ کیا۔ ایسے ہی لکھتے رہے اور اس طرح لکھتے چلے گئے۔

اشفاق احمد

حرف آغاز

میں انشاجی کا بھائی اور ان کی متعدد تصانیف کا ناشر ہوں۔ یہ بات کہہ دینا، بظاہر کتنا آسان سا لگتا ہے۔ مگر ان سطور کا آغاز کرتے وقت مجھے جن مشکلوں سے گزرنا پڑا ہے، اس کا ادراک کم کم ہی کسی کو ہوگا۔ میرے دل و دماغ کی فضا پر ایک عجیب سی اداسی مسلط ہے۔ میں جس اندوہناک کیفیت سے دوچار ہوں، اس کے بیان سے حرف و صوت کے سارے قواعد جزو داری ہیں۔

انشاجی کی زندگی میں ان کی کچھ تصانیف میرے ادارے سے شائع ہوئیں (اور کچھ کراچی سے) ان تمام کتب کی کتابت، تصحیح، سرورق کی تزئین، غرضیکہ طباعت و اشاعت کے قریباً سبھی مراحل مرحوم کی ذاتی نگرانی میں انجام پاتے تھے۔ بحیثیت ناشر میرا کام صرف کاغذ کی خرید و اور کتابت شدہ مسودے کو پریس پہنچانے تک محدود ہوتا تھا۔

انشاجی کی وفات کے بعد چھپ کر آنے والی زیر نظر کتاب ”نمار گندم“ مرحوم کی ذاتی نگرانی سے محروم رہی ہے۔ بدیں باعث اس کی کتابت و طباعت کے سارے مراحل میری ذمہ داری میں طے پائے ہیں۔ اس میں تمام کوتاہیوں کی ذمہ داری بھی مجھ پر عائد ہوتی ہے، لہذا انشاجی کے مداحوں سے میری صمیمانہ گزارش ہے کہ ازراہ التفات ان سے صرف نظر فرمائیں اور اس کی تمام خوبیوں کو انشاجی مرحوم کی ذہنی کاوشوں اور کاہشوں ہی کا ثمر جانیں۔

انشاجی کی رحلت کے بعد اپنے خاندان میں سن و سال کے اعتبار سے بڑا ہونے کے باعث

اُن ساری ذمہ داریوں کا بار مجھ پر آں پڑا، جن کا میں اہل نہ تھا۔ بیسیوں مسائل قدم قدم پر وجہ آزار بنے۔ یہی سبب تھا کہ میں مرحوم کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کو یکجا کرنے کی جانب توجہ نہ دے سکا۔ کچھ عرصہ قبل میری تحریک پر چھوٹے بھائی محمود ریاض نے اس سلسلے میں کام کا آغاز کیا۔ چنانچہ اسی کوشش کے نتیجہ میں ”نخار گندم“ قارئین کے سامنے پیش کرنے کی ہمیں سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

اس مجموعے کے بعض مضامین کا تعلق انشاجی کی ابتدائی ادبی زندگی سے ہے اور بعض ان کی زندگی کے آخری چند برسوں کی یادگار ہیں۔

موخر الذکر مضامین اخبار جہاں اور روزنامہ جنگ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ البتہ اول الذکر مختلف جرائد میں طبع ہوئے۔ زیر نظر مجموعے کا نام خود مرحوم ہی نے منتخب کیا ہوا ہے۔

قارئین کرام کے لئے یہ اطلاع یقیناً خوش کن ہوگی کہ انشاجی کے مزاحیہ مضامین اور سفر ناموں پر مشتمل چند اور کتابوں کے علاوہ ان کی منظومات پر مشتمل ایک مجموعہ بھی ترتیب و تدوین کے مراحل میں ہے۔ انشاء اللہ العزیز ان سب کی اشاعت جلد تکمیل کو پہنچ جائے گی۔

سردار محمود

استاد مرحوم

الہ دین نام تھا اور چراغِ مخلص۔ وطن مالوف ریواڑی جو گڑ گاؤں کے مردم خیز ضلع میں اہل کمال کی ایک بستی ہے اور آم کے اچار کے لئے مشہور۔ وہاں دھنیوں کے محلے میں ان کی خاندانی حویلی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ نگز دادان کے اپنے فن کے خاتم تھے۔ شاہ غازی اور نگ زیب عالمگیر نے شہرہ سنا تو خلعت و پار چدے کر دئی بلوایا اور اپنی مجلس اس کے لحاف بھرنے پر مامور کیا۔ اللہ دیا نام تھا۔ لیکن غداً ف الملک کے خطاب سے مشہور تھے۔ دئی میں یہ بارہ برس رہے۔

وجاہت خاندانی کے ساتھ دولتِ روحانی بھی استاد مرحوم کو دورے میں ملی تھی۔ نخیال کی طرف سے سولہویں پشت میں ان کا سلسلہ حسبِ نو گزے پیرے جا ملتا ہے۔ جن کا مزار اقدس پاکستان اور ہندوستان کے قریب قریب ہر بڑے شہر میں موجود ہے۔ اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ انہی دونوں نسبتوں کا ذکر کر کے کبھی کبھی کہا کرتے کہ شاعری میرے لئے ذریعہ عزت نہیں۔ اپنے نام کے ساتھ تنگ اسلاف ضرور لکھا کرتے۔ دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی انہیں یہی لکھنا شروع کر دیا۔

استاد مرحوم کہ پورا نام ان کا حضرت شاہ الہ دین چراغ چشتی نظامی ریواڑی تھا، ہمیں ہائی اسکول میں اُردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ وطن کی نسبت سے اردو تو ان کے گھر کی لونڈی تھی ہی فارسی میں کمال کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ پچیس پشت پہلے ان کے مورث اعلیٰ خراسان سے آئے تھے۔ کیوں آئے تھے؟ یہ سوال راقم کے دل میں بھی اکثر اٹھتا تھا۔ آخر ایک روز موقع دیکھ کر پوچھ لیا اور احتیاطاً وضاحت کر دی کہ مقصد اعتراض نہیں، دریافت معلومات ہے۔ فرمایا۔ بابر کیوں آیا تھا؟ احمد شاہ ابدالی کیوں آیا تھا؟ اب جو راقم نے اس سوال نما جواب کی بلاغت پر غور کیا تو اپنی کم فہمی پر بیحد شرمندگی ہوئی۔ بابر نہ آتا تو ابراہیم لودھی کس سے شکست کھاتا؟ خاندان مغلیہ کہاں سے آتا؟ اتنی صدیاں ہندوستان کی رعایا بادشاہوں کے بغیر کیا کرتی؟ مالہ اور خراج کس کو دیتی؟ کچھ ایسی ہی حکمت استاد مرحوم کے مورث اعلیٰ کے ہندوستان آنے میں ضرور ہوگی، جس تک معمولی ذہن کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ خیر یہ ذکر تو ضمناً آ گیا۔ مقصود کلام یہ کہ خراسان کی نسبت سے فارسی ایک طرح ان کے گھر کی زبان تھی۔ عربی کے بھی فاضل

تھے، اگرچہ باقاعدہ نہ پڑھی تھی۔ عزیزم اسرار احمد کا نکاح خان بہادر ولایت علی کی پوتی سے ہوا تو استاد مرحوم ہی نے نکاح پڑھایا تھا، اور کوئی کاغذ پرچہ سامنے رکھے بغیر۔

ماشاء اللہ، استغفر اللہ، نعوذ باللہ، 'لاحول ولا قوۃ الا باللہ' اور ایسے ہی کئی اور عربی کے جملے بے مکان بولتے تھے۔ خیر خراسان بھی کہیں عرب ہی کی طرف کو ہے۔ لہذا عربی پران کا عبور جائے تعجب نہیں۔ ہاں انگریزی کی لیاقت جو انہوں نے از خود پیدا کی تھی، اس پر راقم کو بھی حیرت ہوتی تھی۔ ایک بار ایک دیہاتی منہ اٹھائے ان کی کلاس میں کھس آیا، حضرت نے فوراً انگریزی میں حکم دیا۔ گٹ آؤٹ۔ اسے قہقہہ کرتے ہی بنی۔ علاقے کا مال افسر انگریز تھا۔ ایک روز اسکول میں نکل آیا اور آدھا گھنٹہ گفتگو کرتا رہا۔ استاد مرحوم برابر سمجھتے گئے اور سر ہلاتے گئے۔ سچ میں موقع بہ موقع یس یس اور پلیز پلیز بھی کہتے جاتے تھے۔ پرانے بزرگوں سرسید، حالی، شبلی وغیرہ کے متعلق سنا ہے کہ انگریزی سمجھتے خوب تھے لیکن بولنا پسند نہ کرتے تھے۔ ہمارے استاد کا بھی یہی عمل تھا۔ ہمیں انگریزی میں ان کے تجربہ کا پہلے علم نہ تھا۔ ہوا یہ کہ ایک روز ہماری انگریزی کی کلاس میں نکل آئے اور پوچھا لڑکو بتاؤ تو ماش کی دال کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟ سب چپ۔ کون بتاتا۔ پھر سوال کیا۔ کریلے کی انگریزی کیا ہے؟ یہ بھی کوئی نہ بتا سکا۔ سب ایک دوسرے کا منہ ہنسنے لگے۔ آخر استاد مرحوم نے بتایا اور "انگلش میچر" کھول کر اس کی تصدیق بھی کرادی۔ یہ کتاب جو انگریزی کے علم کا قاموس ہے، سفر و حضر میں استاد مرحوم کے ساتھ رہتی تھی اور بڑے بڑے انگریزی دان ان کے سامنے آتے کتراتے تھے کہ جانے کب کس ترکیب کا انگریزی نام پوچھ لیں۔ انگریزی کی تحریر پران کی قدرت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ دستخط انگریزی ہی میں کرتے تھے۔

استاد مرحوم نے اہل زبان ہونے کی وجہ سے طبیعت بھی موزوں پائی تھی اور ہر طرح کا شعر کہنے پر قادر تھے۔ اردو فارسی میں ان کے کلام کا بڑا ذخیرہ موجود ہے جو غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے اگلی نسلوں کے کام آئے گا۔ اس علم و فضل کے باوجود انکسار کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اسکول میگزین میں جس کے یہ نگران تھے، ایڈیٹر نے استاد مرحوم کے متعلق لکھ دیا کہ وہ سعدی کے ہم پلہ ہیں۔ انہوں نے فوراً اس کی تردید کی۔ اسکول میگزین کا یہ پرچہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے اور ایک ایک کو دکھاتے کہ دیکھو لوگوں کی میرے متعلق یہ رائے ہے، حالانکہ من آنم کہ من دانم۔ ایڈیٹر کو بھی جو دسویں جماعت کا طالب علم تھا، بلا کر فہمائش کی کہ انگریزی یہ زمانہ اور طرح کا ہے۔ ایسی باتیں نہیں لکھا کرتے۔ لوگ مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ حسد کے مارے جانے کیا کیا کہتے پھریں گے۔

اہل علم خصوصاً شعرا کے متعلق اکثر یہ سنا ہے کہ معصروں اور پیشروؤں کے کمال کا اعتراف کرنے میں بغل سے کام لیتے ہیں۔ استاد مرحوم میں یہ بات بھی بہت فراخ دل تھی۔ فرماتے، غالب اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت اچھا لکھتا تھا۔ میر کے بعض اشعار کی بھی تعریف کرتے۔ امیر خسرو کے بھی سترف تھے۔ برملا کہتے کہ ذہین آدمی تھے۔ اور ان کی کہہ مکر نیاں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ امیر خسرو کی ایک غزل استاد مرحوم کی ایک غزل کی زمین میں ہے۔ فرماتے، انصاف یہ ہے کہ پہلی نظر میں فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سی بہتر ہے۔ پھر بتاتے کہ امیر خسرو مرحوم سے کہاں کہاں محاورے کی لغزش ہوئی ہے۔ اقبال کے متعلق کہتے تھے کہ سیالکوٹ میں ایسا شاعر اب تک پیدا نہ ہوا تھا۔ اس شہر کو ان کی ذات پر فخر کرنا چاہیے۔ ایک بار بتایا کہ اقبال سے میری خط و کتابت بھی رہی ہے دو تین خط علامہ مرحوم کو انہوں نے لکھے تھے کہ کسی کو ثالث بنا کر مجھ سے شاعری کا مقابلہ کر لیجئے۔ راقم نے پوچھا نہیں کہ ان کا جواب آیا کہ نہیں۔

استاد مرحوم کو عموماً شعروں میں نہیں بلایا جاتا تھا کیونکہ سب پر چھا جاتے تھے اور اچھے اچھے شاعروں کو خفیف ہونا پڑتا۔ خود بھی نہ جاتے تھے کہ مجھ فقیر کو ان ہنگاموں سے کیا مطلب۔ البتہ جو ملی کا مشاعرہ ہوا تو ہمارے اصرار پر اس میں شریک ہوئے اور ہر چند کہ مدعو نہ تھے منتظمین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دیوانہ کسمندوی۔ خیال گڑگانوی اور حسرت بانس بریلوی جیسے اساتذہ اسٹیج پر موجود تھے۔ اس کے باوجود استاد مرحوم کو سب سے پہلے پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ وہ منظر اب تک راقم کی آنکھوں میں ہے کہ استاد نہایت تمکنت سے ہوئے ہوئے قدم اٹھاتے مائیک پر پہنچے اور ترنم سے اپنی مشہور غزل پڑھنی شروع کی ہے

ہے رشتہ غم اور دل مجبور کی گردن

ہے اپنے لئے اب یہ بڑی دور کی گردن

ہال میں ایک سنانا چھا گیا۔ لوگوں نے سانس روک لئے۔ استاد مرحوم نے داد کے لئے صاحب صدر کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ ابھی تشریف نہ لائے تھے، کرسی صدارت خالی پڑی تھی۔ دوسرا شعر اس سے بھی زوردار تھا

صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

اور دار پہ ہے حضرت منصور کی گردن

دوسرا مصرع تمام نہ ہوا تھا کہ داد کا طوفان پھٹ پڑا۔ مشاعرے کی حجت اڑنا ضرور

تھا، دیکھنے کا اتفاق آج ہوا۔ اب تک شعراً ایک شعر میں ایک مضمون باندھتے رہے ہیں وہ بھی
 بشکل۔ اس شعر میں استاد مرحوم نے ہر مصرع میں ایک مکمل مضمون باندھا ہے۔ اور خوب باندھا ہے۔ لوگ
 اسٹج کی طرف دوڑے۔ غالباً استاد مرحوم کی پابوی کیلئے۔ لیکن رضا کاروں نے انہیں باز رکھا۔ اسٹج پر بیٹھے
 استادوں نے جو یہ رنگ دیکھا تو اپنی غزلیں پھاڑ دیں اور اٹھ گئے۔ جان گئے تھے کہ اب ہمارا رنگ کیا
 جھے گا۔ ادھر لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ تیسرے شعر پر ہی فرمائش ہونے لگی۔ مقطع پڑھے مقطع
 پڑھے..... چوتھے شعر پر مجمع بے قابو ہو رہا تھا کہ صدر جلسہ کی سواری آگئی اور منتظمین نے بہت بہت
 شکریہ ادا کر کے استاد مرحوم کو غلطی دروازے کے باہر چھوڑ کر اجازت چاہی۔ اب ضمناً ایک لطیفہ سن لیجئے
 جس سے اخبار والوں کی ذہنیت عیاں ہوتی ہے۔ دوسری صبح روزنامہ ”چنگ“ کے رپورٹر نے لکھا کہ جن
 استادوں نے غزلیں پھاڑ دی تھیں، وہ یہ کہتے بھی سنے گئے کہ عجب نامعقول مشاعرے میں آگئے ہیں۔
 لوگوں کی بے محابا داکو اس بد باطن نے ہونگ کا نام دیا اور استاد مرحوم کے اس مصرع کو صدحیف کہ مجنوں
 کا قدم اٹھ نہیں سکتا۔ یوہی لاعلمی یا شرارت بجائے تو ارد کے سر قہ قرار دیا۔ بات فقط اتنی تھی کہ منتظمین نے
 ایڈیٹر چنگ، کے اہل خانہ کو مشاعرے کے پاس معقول تعداد میں نہ بھیجے تھے۔ اگر یہ بات تھی تو اسے
 منتظمین کے خلاف لکھنا چاہئے تھا نہ کہ استاد مرحوم کے خلاف۔ اور پھر اس قسم کے فقروں کا کیا جواز ہے
 کہ استاد چراغ شعر نہیں پڑھ رہے تھے روئی دھن رہے تھے۔ صحیح محاورہ روئی دھنا نہیں روئی
 دھنکا ہے۔

اُس دن کے بعد سے مشاعرے والے استاد مرحوم کا ایسا ادب کرنے لگے کہ اگر استاد اپنی
 کریم النفسی سے مجبور ہو کر پیغام بھجوادیجے کہ میں شریک ہونے کے لئے آ رہا ہوں تو وہ خود معذرت
 کرنے کے لئے دوڑے آتے کہ آپ کی صحت اور مصروفیات اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ استاد تو استاد
 ہیں۔ ہمیں ان کے ناچیز شاگردوں کو بھی رقعہ آجاتا کہ معمولی مشاعرہ ہے۔ آپ کے لائق نہیں۔ زحمت
 نہ فرمائیں۔

استاد مرحوم کو رباعی، قصیدہ، غزل وغیرہ کے علاوہ قضیہ میں سے خاص دلچسپی تھی۔ میونسپلٹی کے
 چرمین کے بچے کے ختنے پر جو دھوم دھامی مشاعرہ ہوا۔ اسکے لئے آپ نے غالب کی غزل کی خمس میں
 قضیہ کی تھی۔ اس پر بے انتہا داد ملی۔ جب یہ بند کے چوتھے اور پانچویں مصرع پڑاتے لوگ سبحان اللہ
 اور جزاک اللہ کے ڈونگرے برساتے۔

یہ سچ ہے کہ استاد مرحوم کا نام اتنا مشہور نہ ہوا جتنا ان کے معصروں اقبال، حفیظ، جوش وغیرہ کا۔ بات یہ ہے کہ یہ زمانہ پروپیگنڈے کا ہے اور استاد مرحوم نام و نمود اور چھپنے چھپانے کے قائل نہ تھے۔ ایک بار راقم نے استاد مرحوم کے ایما پر ان کی کچھ غزلیں مختلف رسالوں کو بھجوائی تھیں۔ ان میں سے ایک لالہ چونی لال خستہ کے ریواڑی گزٹ میں آب و تاب سے چھپی لیکن باقی واپس آگئیں۔ آئندہ کیلئے منع کر دیا اور اپنی طرف اشارہ کر کے یہ شعر پڑھا۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

یہی حال ان کے مجموعوں کا ہوا۔ اپنا کام مضبوط و لائق کاغذ پر لکھتے تھے۔ اور جب پورا رچرچ ہو جاتا تو اس کی جلد بندھوا کر جلد اول، جلد دوم وغیرہ لکھ کر الماری میں سجا دیتے۔ مولانا کے ہاں مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اور ایک بات میں تو یہ ذخیرہ برٹش میوزیم، انڈیا آفس، خدابخش لاہوری وغیرہ کے ذخیروں سے بھی تمیز اور فائق سمجھنا چاہئے۔ ان کتب خانوں میں سب مخطوطات پرانے زمانے کے ہیں۔ بعض تو ہزار ہزار سال پرانے۔ خستہ اور بدرنگ۔ ہاتھ لگاؤ تو مٹی ہو جائیں لیکن استاد مرحوم کے سبھی مخطوطات نہایت اچھی شکل میں تھے۔ اور زیادہ تر ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے۔ بیسویں صدی کے مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ غالباً کسی کے پاس نہ ہوگا۔ استاد کی چیزیں جو طباعت کے عیب سے آلودہ نہ ہوئیں، اسے بھی راقم مصلحت خداوندی سمجھتا ہے۔ اگر کبھی چیزیں چھپ جایا کریں تو قلمی نسخے کہاں سے آیا کریں۔ اور قلمی نسخے نہ ہوں تو لوگ ریسرچ کس چیز پر کریں۔ اور ریسرچ نہ ہو تو ادب کی ترقی رک جائے اور پی ایچ ڈی تھا و پیدا ہونے بند ہو جائیں۔

راقم نے ایک بار عرض کیا کہ ان نواور کو تو کسی ریسرچ لائبریری میں ہونا چاہئے۔ فرمایا۔ میرا اپنا یہی خیال تھا، اور میں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو لکھا بھی تھا۔ اور مسودات کی فہرست منسلک کی تھی۔ ان بچاروں نے شکریہ ادا کیا۔ لیکن معذرت کی کہ فی الحال ہماری لائبریری میں جگہ کی کمی ہے۔ البتہ نعمت اللہ کبازئی مرحوم کہ دہلی کے ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اکثر ان کے گھر کے چکر کاٹتے تھے اور مخطوطات جدیدہ و مفیدہ کا یہ سارا ذخیرہ اٹھانے کو تیار تھے۔ لہذا بی یعنی استاد مرحوم کی منجھلی اہلیہ نے کئی بار کہا بھی کہ اس وقت اچھا بھاؤ جا رہا ہے، ٹلو اور لیکن استاد مرحوم نے کبھی لالچ گوارہ نہ کیا۔ جواب دیا تو یہی کہ میرا مقصد جلب منفعت نہیں، خدمت ادب ہے۔

استاد مرحوم کا خط نہایت پاکیزہ اور شگفتہ تھا۔ کسی خاص صنعت میں لکھتے تھے۔ جس کا نام اس

وقت راقم کے ذہن سے اتر گیا ہے۔ خوبی اس کی یہ ہے کہ صرف لکھنے والا اسے پڑھ سکتا ہے۔ راقم التحریر کے املا میں بھی جو لوگوں کو یہ خصوصیت نظر آتی ہے، ادھر ہی کا فیضان ہے۔

طبیعت میں ایجاد کا مادہ تھا۔ لکیر کے فقیر نہ تھے۔ اب اسی لفظ فیضان کو لیجئے۔ اسے وہ نظ سے لکھتے تھے۔ ایک بار طوطا رام سیاد نے اس پر اعتراض بھی کیا۔ یہ صاحب ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ اور معمولی تعلیم یافتہ تھے۔ استاد مرحوم نے چمک کر جواب دیا۔ یہ ہماری زبان ہے پیارے۔ ہم جیسا لکھیں گے وہی سند ہوگا۔ ماسٹر جی اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ بعد میں راقم کو استاد مرحوم نے ایک مستند قلمی نسخے میں فیضانِ ظ سے لکھا ہوا دکھایا۔ اس نسخے کا نام یاد نہیں۔ لیکن کم از کم پچیس سال پرانا ہوگا اور خود استاد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ ان شہادتوں کے باوجود وسیع القلب اتنے تھے کہ آخر عمر میں فرمایا کرتے۔ ص سے لکھنا بھی غلط نہیں۔ اسی طرح بہت سے اور الفاظ تھے۔ جن کا تلفظ اور الامادہ رواج عام سے ہٹ کر کرتے تھے۔ کوئی انگشت نمائی کرتا تو جواب دیتے کہ ہمارے گڑ گاؤں میں یونہی لکھتے اور بولتے ہیں۔ معترض چپ ہو جاتا۔

استاد مرحوم کے اوصاف حمیدہ کا حال لکھنے کیلئے ایک دفتر چاہئے۔ اس مضمون میں اس کی منجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ دریا دل آدمی تھے۔ کوئی شخص کوئی چیز پیش کرتا تو کبھی انکار نہ کرتے۔ دوسری طرف اس بات کا خیال رکھتے کہ کسی کے جذبات کو نہیں نہ لگے۔ کوئی سائل یا حاجتمند آتا تو نہ صرف یہ کہ خود کچھ نہ دیتے۔ دوسروں کو بھی منع کر دیتے تھے کہ یہ بھی تمھاری طرح انسان ہے۔ اس کی خود داری مجروح ہوگی۔ اس شخص کو پند و نصائح سے مطمئن کر کے بھیج دیتے۔

استاد مرحوم کی طبیعت خوشامد سے نفور تھی۔ راقم کو معلوم نہیں کہ محکمہ تعلیم کے افسروں اور ڈپٹی کمشنر کے علاوہ، کہ حاکم ضلع ہونے کے لحاظ سے اولوالامر کی تعریف میں آتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کا قصیدہ کہا ہو البتہ کسی افسر یا سیٹھ کے ہاں شادی ہو تو سہرا کہہ کر لے جاتے اور ترنم سے پڑھ کر سناتے۔ فرماتے یہ وضع داری ہے۔ اس کا انعام کسی نے دید یا تو لے لیا ورنہ اصرار نہ کرتے۔ اشاعت تعلیم سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب اور انسپکٹر تعلیمات کے بچوں کو پڑھانے جایا کرتے تھے۔

استاد مرحوم کا مسلک صلح کل تھا۔ جس زمانے میں مولوی محمد عمر انسپکٹر تعلیمات تھے یہ تنظیم اہل سنت کے جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ ان کی جگہ قل حسنین امر وہی آئے تو ان کو تعظیم سے شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ اور اثنا عشری مسجد میں دیکھے جانے لگے۔ اہل بیت کے جو مرہے ان کے

دیوان میں ہیں، اسی زمانے کے ہیں۔ کچھ دنوں قاضی نور احمد کا تقرر بھی اس خدمت پر رہا۔ یہ قادیانی احمدی تھے۔ استاد مرحوم ان دنوں بر ملا فرماتے کہ مجھے تو اگر اسلام کی سچی روح کہیں نظر آتی ہے تو انہی کے ہاں۔ اس سال عید کی نماز انہوں نے احمدیوں کی مسجد میں پڑھی۔ فرماتے بھی خدا کے گھر ہیں۔ کوئی فرق نہیں۔ پنڈت رادھہ شyam ہیڈ ماسٹران سے ہمیشہ خوش رہے۔ انہیں استاد مرحوم ہی سے معلوم ہوا تھا کہ کرشن جی باقاعدہ نبی تھے اور تورات میں ان کی آمد کا ذکر ہے۔

موسیقی سے شغف تھا اور گلے میں نور بھی تھا۔ لیکن محلے والے اچھے نہیں تھے۔ استاد کی خواہش تھی کہ شہر سے باہر تنہا کوئی مکان ہو تو دل جمعی سے تکمیل شوق کریں۔ ویسے کبھی کبھی محفل میں ہارمونیم لیکر بیٹھ جاتے تھے کہ یہی ان کا محبوب ساز تھا۔ اور سہگل مرحوم کی مشہور رنزل نکتہ جیسے ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے، سنانی شروع کر دیتے۔ ایسے موقع پر نکتہ شناس لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر کے ایک ایک کر کے اٹھ جاتے کیونکہ اس فن کے ریاض کیلئے تنہائی ضروری ہے۔

استاد مرحوم ہاتھ دیکھنے میں ید طولی رکھتے تھے اور طبیب حاذق بھی تھے۔ آخر میں طبابت تو انہوں نے ترک کر دی تھی۔ کیونکہ ایک مریض کے رشتہ داروں نے جوان کے زیر علاج تھا اور ان کی تیر بہدف دوا کئی کی ایک خوراک کھانے کے بعد خالق حقیقی سے ملا تھا، بے وجہ ایک فساد کھڑا کر دیا تھا اور نوبت پولیس تھانے تک پہنچی تھی۔ دست شناسی کا شوق البتہ جاری رہا۔ طبابت کی طرح اس فن میں بھی نہ کسی کے شاگرد تھے نہ کوئی کتاب پڑھی۔ خود فرماتے مبداء فیاض کی دین ہے۔ ماضی کا حال نہایت صحت سے بتاتے۔ لیکن اجنبیوں کا ہاتھ دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ انہی سے کھلتے جن سے دیرینہ واقفیت اور رسم وراہ ہوتی۔ مستقبل کے بارے میں ان کا اصول تھا کہ لوگوں کو صحیح بات نہ بتانی چاہئے۔ ورنہ ان کا تقدیر اور عالم غیب پر سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔ اس فن سے ان کی آمدنی خاصی تھی۔ اور اسی پر قانع تھے۔ اسکول کی تنخواہ بچا کر خدا کی راہ میں لوگوں کو سود پر دے دیتے تھے۔

ایسی دیدہ زیب شخصیتیں چشم فلک نے کم ہی دیکھی ہوں گی جیسے استاد چراغ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ قد پانچ فٹ سے بھی نکلتا ہوا۔ جسم بھرا بھرا خصوصاً کمر کے آس پاس۔ سر پر میل خورے کپڑے کی ٹوپی اور اس کے ساتھ کی شیر وانی۔ راتم نے کبھی ان کو ٹوپی کے بغیر نہ دیکھا۔ ایک بار خود ہی فرمایا کہ ایک تو یہ خلاف تہذیب ہے۔ دوسرے کوئے غولگیں مارتے ہیں۔ ناگلئیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ جس کی وجہ سے چال میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ رنگ سرمئی۔ آنکھیں سرخ و سفید اور پھر جلال ایسا کہ مائیں دیکھ کر

بچوں کو چھپا لیتی تھیں۔ دانت تمباکو خوری کی کثرت سے شہید ہو گئے تھے۔ لہذا تمباکو چھوڑ دیا تھا۔ فقط نسوار کا شوق رکھا تھا۔ چشمہ لگاتے تھے۔ لیکن ہماری طرح چشمے کے غلام نہ تھے۔ بالعموم اس کے اوپر سے دیکھتے تھے۔ سرخ کمر بند میں چابیوں کا گچھا چاندی کے گھنگھر دوں کی طرح بجتا۔ دور ہی سے معلوم ہو جاتا کہ حضرت تشریف لارہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں چھانگلیاں تھیں۔ اس لئے عیارہ تک با آسانی گن لیتے تھے۔ حواس پر ایسا قابو تھا کہ جس محفل میں چاہتے بیٹھے بیٹھے سو جاتے اور خزانے لینے لگتے۔ پھر آپ ہی آپ اٹھ بھی بیٹھتے۔ کھانے کا شوق ہمیشہ سے تھا۔ خصوصاً دعوتوں میں۔ فرماتے کھانے میں دوخو بیاں ہونی چاہئیں۔ اچھا ہوا اور بہت ہو۔ کھانے کے آداب کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ سب سے پہلے شروع کرو اور سب سے آخر میں ختم کرو۔ جس ضیافت میں استاد مرحوم ہوتے، لوگ کھاتے کم اور ان کی طرف رشک سے دیکھتے زیادہ تھے۔ لیکن یہ جوانی کی باتیں ہیں۔ آخر عمر میں پرہیزی کھانا کھانے لگے۔ میزبان کے ہاں پہلے سے کہلوادیتے کہ بخنی وغیرہ کا انتظام کر لینا اور بیٹھے میں سوائے حلوے کے اور کچھ نہ ہو۔ چوزے کے متعلق فرماتے کہ زود ہضم ہے۔ خون صالح پیدا کرتا ہے۔ دال سے احتراز فرماتے کہ نفخ پیدا کرتی ہے۔

بذلہ سخی استاد مرحوم کی طبیعت میں ایسے تھی جیسے بابے میں راگ، جیسے تلوار میں جوہر۔ ”لطائف بیرہل و ملا دو پیازہ“ کے سب لطیفہ نوک زبان تھے۔ ان سے مخفلوں کو گرہ ماتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ لطیفوں کی تخصیص نہیں۔ لوگ انکی دوسری باتوں پر بھی ہنستے تھے۔

ایسا بڑا آدمی اور سادگی کا یہ عالم کہ کبھی خیال نہ کیا کہ لباس میلا ہے یا پیوند لگا ہے۔ فرماتے انسان کا من اُجلا ہونا چاہئے تن تو ایک عارضی چولا ہے۔ اس مضمون کا کثیر کا ایک دو با بھی پڑھتے۔ کپڑا پہننے کا سلیقہ تھا۔ ایک کالی اپکن کو پورے بیس سال تک چلایا۔ جب سردی آتی۔ اسی کو جھڑ کر پہن لیتے۔ فرماتے کپڑے کے دشمن دو ہیں۔ دھوبی اور استری۔ واقعی سچ ہے۔ یہ اپکن جو آخر میں سلجیہ رنگ کی ہو گئی تھی اور دور سے چری نظر آتی تھی، دھوبی اور استری کے ہتھے چڑھ جاتی تو کبھی کی عارت ہو گئی ہوتی۔ ایک روز اسے پہنے راقم کے ہمراہ کسی قوالی میں جا رہے تھے۔ قوالی کر رہے نہیں، سننے، کہ چوراہے پر رکن پڑا۔ ایک مرد شریف نے نہ جانے کیا خیال کر کے ان کے ہاتھ پر نکار کھ دیا۔ راقم کچھ کہنے کو تھا کہ استاد مرحوم نے اشارے سے منع کر دیا۔ اور نکا جیب میں ڈال لیا۔ یہی حال جوتے کا تھا۔ فرماتے جوتا ایسی چیز ہے کہ کبھی ناکارہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تھلا پھٹ جاتا تو نیا لگوا لیتے۔ اوپر کا حصہ پھٹ جاتا تو اسے بدلوا لیتے۔ داڑھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرح پر زعب، گھنی اور لمبی۔ اسے ترشواتے نہیں تھے۔ فرماتے خدا کا نور

ہے۔ بعض لوگوں کو گمان تھا کہ پیسہ بچانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔ ان کے پاس پیسے بہت تھے اور جمع کرنے کا شوق بھی تھا۔ لیکن پیسے کی طرح ان میں نہ تھی۔

استاد مرحوم یوں تو اپنے سبھی شاگردوں سے محبت کرتے تھے۔ حاجی امام دین سوختہ بیکری والے۔ غلیغہ اے۔ ڈی۔ مقرض مالک جنٹلمین ہیر کٹنگ سیلون۔ حسین بخش مدعی، عرائض نویس وغیرہ سبھی ان کے اخلاق حسنہ اور الطاف عمیم کی گواہی دیں گے لیکن راقم سے ان کو ربط خاص تھا۔ فرماتے میرے علم و فضل کا صحیح جائزہ تو ہوگا۔ رات کا کھانا اکثر راقم کے ساتھ کھاتے اور وقت کی پابندی کا لحاظ اس درجہ تھا کہ ادھر ہم دسترخوان پر بیٹھے ادھر استاد مرحوم بھانک سے نمودار ہوئے۔ بچوں سے لگاؤ تھا۔ جو بچہ ہمت کر کے ان کے قریب آتا انعام پاتا۔ ایک بار راقم کے بڑے بھتیجے کو ایک انٹی دی تھی۔ وہ اب تک استاد مرحوم کی یادگار کے طور پر رکھے ہوئے ہے۔

ایک دن فرمایا۔ ایک بات کہوں؟ راقم نے عرض کیا۔ فرمائیے۔ بولے جھوٹ تو نہ سمجھو گے؟ راقم نے کہا۔ خانہ زاد کی کیا مجال! فرمایا۔ تو کان کھول کر سنو۔ میری نظر میں تم جوش، جگر وغیرہ بلکہ آج کل کے سبھی شاعروں سے اچھا لکھتے ہو۔ راقم نے آبدیدہ ہو کر ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ سب آپ کا فیض ہے۔ ورنہ بندہ کچھ بھی نہ تھا۔ قارئین اسی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ استاد مرحوم کی نظر کتنی گہری تھی اور رائے کتنی صائب۔ ان کا یہ قول راقم نے اکثر لوگوں کو سنایا۔ بعضوں نے جو انصاف پسند تھے، اعتراف کیا کہ ہاں ایسے استاد کا ایسا شاگرد کیوں نہ ہو۔ کچھ ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے کہا کہ یہ بات شاید استاد نے فقط تمہارا دل بڑھانے کو کہی ہو۔ ان سے راقم کیا بحث کرتا۔ یہی کہا کہ آپ جو فرمائیں بجا ہے۔ لیکن دل میں سوچا کہ جس شخص کو زندگی بھر تعلق اور زمانہ سازی سے واسطہ نہ رہا ہو وہ اس بات میں کیوں مبالغہ کرنے لگا۔ اور پھر اپنے ایک ادنیٰ شاگرد کے سنے؟

۱۹۶۳ء عجب ظالم سال تھا۔ اس میں دنیا کو ایک طرف صدر کینیڈا کا داغ دیکھنا پڑا اور دوسری طرف علم و فضل اور جود و سخا کا یہ آفتاب جس نے واقعی چراغ بن کر زمانے کو روشن کیا تھا، غروب ہو گیا۔ عمر عزیز کے ۸۲ برس ابھی پورے نہ ہوئے تھے۔ کچھ دن باقی ہی تھے ہائے استاد

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و دستد کے
کرنا ملک الموت تھا ضا کوئی دن اور

وصال تا ند لیا نوالہ ہی میں ہوا جہاں استاد مرحوم پاکستان بننے کے بعد مقیم ہو گئے تھے اور گھی کی آڑھت کرتے تھے۔ سنا ہے معمولی بخار ہوا تھا۔ اور ہر چند کہ اپنے ہی مجربات سے علاج کیا، طبیعت گبڑتی ہی گئی۔ راقم کو خبر ملی تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا۔ ”ہائے الہ دین کا

چراغ بجھ گیا۔“ عدد گئے تو پورے ۱۳۸۳ھ کیسی برجستہ اور سہل متنوع تاریخ ہے۔ آج استاد مرحوم زندہ ہوتے تو اس کی داد دیتے۔ استاد کے خاندان کی کیفیت بھی مختصر الفاظ میں عرض کر دوں۔ چار شادیاں تھیں۔ پانچویں عمر بھر نہ کی۔ کیونکہ شرع سے انحراف منظور نہ تھا۔ آہ بھر کر فرماتے جب تک چاروں زندہ ہیں۔ ایک اور کیسے کر لوں۔ شرع میں چار کی اجازت بھی اس شرط کے ساتھ ہے کہ سلوک یکساں ہو۔ سو الحمد للہ کہ چاروں کا سلوک ان سے یکساں تھا۔ لیکن استاد بھی ایسے صابر تھے کہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ اولاد صرف ایک سے ہوئی۔ امید ہے کہ عزیز مکرم ہدایت علی ان کے فرزند اکبر جو خود بھی موزوں طبع ہیں اور فراغِ تخلص کرتے ہیں، اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ رسمی تعلیم ان کی زیادہ نہیں۔ صفائے باطن کے مراحل فقیروں کے تکیوں اور قوالی کی محفلوں میں طے کئے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ استاد مرحوم کے وصال کے بعد سرعام شراب پینا انہوں نے ترک کر دیا ہے۔ اور ارقم بھی اب اعتدال سے کھاتے ہیں۔ یہ بھی اپنے نامی والد کی طرح روپے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ لہذا تقریر کے خط کے جواب میں فوراً پانچ سو روپے منگوا بیٹھے۔ راقم نے لکھا کہ عزیزی اس خانوادے پر متاعِ دل و جان غار کر چکا ہوں۔ روپیہ کیا پیچھے رہ گیا؟ تم یوں کرو کہ استاد مرحوم کی قبر پر سبز چادر چڑھا کر بیٹھ جاؤ۔ خدا برکت دے گا۔ اور وہیں رزق پہنچا دیا کرے گا۔ اور اگر فتح علی مبارک علی راضی ہو جائیں تو سبحان اللہ۔ سال کے سال عرس سراپا قدس کا اہتمام بھی کرو۔ معلوم نہیں یہ خط ان کو ملا کہ نہیں کیونکہ پھر جواب نہیں آیا اور راقم کو بھی مکروہات دینی سے اتنی فرصت نہ ملی کہ دوبارہ خط لکھتا۔

فیض اور میں

(انکار کے فیض نمبر کے لئے)

بڑے لوگوں کے دوستوں اور ہم جلیسوں میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس دوستی اور ہم جلیسی کا اشتہار دے کر خود بھی ناموری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ عجز و فروتنی کے پتلے جو شہرت سے بھاگتے ہیں۔ کم از کم اپنے مدوح کی زندگی میں۔ ہاں اس کے بعد رسالوں کے ایڈیٹروں کے پر زور اصرار پر انہیں اپنے تعلقات کو الم نشر کرنا پڑے تو دوسری بات ہے۔

ڈاکٹر لکیر الدین فقیر کو لیجئے۔ جیسے اور پروفیسر ہوتے ہیں ویسے ہی یہ تھے۔ لوگ فقط اتنا جانتے تھے کہ علامہ اقبالؒ کے ہاں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ سو یہ بھی خصوصیت کی کوئی بات نہیں۔ یہ انکشاف علامہ کے انتقال کے بعد ہوا کہ جب کوئی فلسفہ کا دقیق مسئلہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تو انہی سے رجوع کرتے تھے۔ ڈاکٹر لکیر الدین فقیر نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز آدھی رات کو میں چونک کر اٹھا اور کھڑکی میں سے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ مرحوم کا خادم خاص علی بخش ہے۔ میں نے پوچھا ”خیریت؟ جواب ملا ”علامہ صاحب نے یاد فرمایا ہے“۔ میں نے کہا۔ ”اس وقت؟“۔ بولا ”جی ہاں اس وقت اور تاکید کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آنا“۔ میں حاضر ہوا تو اپنے لحاف میں جگہ دی اور فرمایا۔ ”آج ایک صاحب نے گفتگو میں رازیؒ کا ذکر کیا۔ تم جانتے ہو میں تو شاعر آدمی ہوں۔ آخر کیا کیا پڑھوں؟ اس وقت یہ پوچھنے کو تکلیف دی ہے کہ یہ رازیؒ کون صاحب تھے اور ان کا فلسفہ کیا تھا۔“ میں دل ہی دل میں ہنسا کہ دیکھو اللہ والے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ بہر حال تعمیل ارشاد میں میں نے امام فخر الدین رازیؒ اور ان کے مکتب فکر کا سیر حاصل احاطہ کیا اور اجازت چاہی۔ علامہ صاحب دروازے تک آئے، آبدیدہ ہو کر رخصت کیا اور کہا ”تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب اس شہر میں اور کون رہ گیا ہے جس سے کچھ پوچھ سکوں۔“

اگلی اتوار کو زمیندار کا پرچہ کھولا تو صفحہ اول پر علامہ موصوف کی نظم تھی جس میں وہ مصرع ہے۔

غریب اگرچہ ہیں رازنی کے نکتہ ہائے دقیق

ہر چند میں نے واضح کر دیا تھا کہ رازنی کا فلسفہ خاصاً پیش پا افتادہ ہے۔ دقیق ہرگز نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ علامہ مرحوم کو ایسا ہی لگا۔

مدرسہ علمیہ شرطیہ موجی دروازے کے پرنسپل مرزا اللہ دہ خیال نے جو چھ ماہ میں میٹرک اور دو سال میں بی۔ اے پاس کرانے کی گارنٹی لیتے ہیں، ماہ نامہ ”تصویر بیتاں“ میں پہلی بار اس بات کا اعتراف کیا کہ علامہ مرحوم کو مثنوی مولانا روم کے بعض مقامات میں الجھن ہوتی تو مجھے یاد فرماتے تھے۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ آپ مثنیٰ فاضل کیوں نہیں کر لیتے۔ تمام علوم آپ کے لئے پانی ہو جائیں گے۔ بولے۔ ”اس عمر میں اتنی سخت شافقت نہیں کر سکتا“۔ بعد میں میں نے سوچا کہ واقعی شعر اتلا میذ الرحمن ہوتے ہیں۔ ان کو علم اور لیسرچ کے جھیلوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ یہ تو ہم جیسے سر پھروں کا کام ہے۔

علامہ کے ایک جگہری دوست رنجور فیروز پوری کو بھی لوگ گوشہ گمنامی سے نکال لائے۔ ایک بصیرت افروز مضمون میں آپ نے لکھا۔ ”خاکسار نے اپنے لئے شاعری کو کبھی ذریعہ عزت نہیں جانا۔ بزرگ ہمیشہ نیچے بندی کرتے آئے تھے۔ اس میں خدا نے مجھے برکت دی۔ جو ٹوٹا پھوٹا کلام ہسیل ارتجال کہتا تھا، علامہ صاحب کی نذر کر دیتا تھا۔ اب بھی دیکھتا ہوں کہ ارمغان حجاز وغیرہ کتابوں میں سینکڑوں ہی مصرعے جو اس بیچ مدائج کج زبان نے علامہ کے گوش گزار کئے تھے، گینوں کی طرح چمک رہے ہیں۔

حکیم سراج رائی مصلیٰ مصنف طب بقراطی نے نمائندہ ”صبح و شام“ کو انٹرویو دیا تو بتایا کہ ایک زمانے میں حکیم الامت کو کبھی طب کا شوق ہوا۔ بندہ نسخہ لکھتا اور علامہ مرحوم پڑیاں بناتے اور جو شاندارے کوٹے چھانتے۔ اس دوران اگر فکر خن میں مستغرق ہو جاتے تو کبھی کبھی ہاؤن دستے میں اپنے انگوٹھا پھوڑ بیٹھتے۔ دوسرے روز عقیدہ مند پوچھتے کہ یہ کیا ہوا، تو فقط مسکرا کر انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کر دیتے۔

عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ علامہ مرحوم آخری سالوں میں کبوتر بازی اور پہلوانی نہیں کرتے تھے اور مینڈھے لڑانے کا شوق بھی ترک کر دیا تھا۔ صحیح صورت حال سے میاں معراج دین گوجرانوالوی نے رسالہ ”غزل الغزلات“ کے اقبال نمبر میں پردہ اٹھایا۔ پھر علامہ مذکور کے احوال میں اکثر آیا ہے کہ فلاں بات سنی اور آبدیدہ ہو گئے۔ فلاں ذکر ہوا اور آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ اس کا بھید بھی علامہ مرحوم کے ایک اور قریبی دوست ڈاکٹر عین الدین ماہر امراض چشم نے کھولا۔

اسی زمرے میں ڈاکٹر محمد موسیٰ پرنسپل بانگ درا ابو میو پیتھک کانج گڑھی شاہ پور کھئے۔ جنہوں

نے علامہ اقبال مرحوم کی زندگی کے ایک اور غیر معروف گوشے کو بے نقاب کیا۔ اپنی کتاب ”تسہیل الہو میویتی“ کے دیباچے میں رقم طراز ہیں۔ ”لوگوں کا یہ گمان غلط ہے کہ ڈاکٹر اقبال فقط نام کے ڈاکٹر تھے۔ اس عاجز کا مطالعہ اتنا نہیں کہ ان کے شاعرانہ مقام پر گفتگو کر سکے۔ ہاں اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مرض کی تشخیص میں اپنے بعد میں نے انہی کو دیکھا۔ بعض اوقات دواؤں کے ضمن میں بھی ایسے قابل قدر مشورے دیتے کہ یہ عاجز اپنے تجربہ علمی کے باوجود حیران رہ جاتا۔ بہر حال شاعر تو ہمارے ہاں اب بھی اچھے اچھے پائے جاتے ہیں، میرے نزدیک علامہ مرحوم کی رحلت ہو میویتی طبی طب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ میں مریضوں پر توجہ دیتا اور وہ ایک کونے میں بیٹھے حقہ پیتے رہتے۔ تاہم اس عاجز کے مطب کی کامیابی میں جو مایوس مریضوں کی آخری امید گاہ ہے، اور جہاں خالص جرمن ادویات بکفایت فراہم کی جاتی ہیں، ان کے نام نامی کا بڑا دخل تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ نے اپنی ایک مشہور تصنیف کا نام بھی عاجز کے مطب کے نام پر رکھا۔

فیض صاحب کے متعلق کچھ لکھتے ہوئے مجھے تامل ہوتا ہے۔ دنیا حاسدان بد سے خالی نہیں۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ ہم نے تو اس شخص کو کبھی فیض صاحب کے پاس اٹھتے بیٹھتے نہیں دیکھا تو کون ان کا قلم پکڑ سکتا ہے۔ احباب پر زور اصرار نہ کرتے تو یہ بندہ بھی اپنے گوشہ گمانی میں مست رہتا۔ پھر بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ لکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ آیا یہ لکھنے کی ہیں بھی یا نہیں۔ مثلاً یہی کہ فیض صاحب جس زمانے میں پاکستان ٹائمر کے ایڈیٹر تھے، کوئی ادارہ اس وقت تک پریس میں نہ دیتے تھے جب تک مجھے دکھانہ لیتے۔ کئی بار عرض کیا کہ ماشاء اللہ آپ خود اچھی انگریزی لکھ لیتے ہیں لیکن وہ نہ مانتے اور اگر میں کوئی لفظ یا فقرہ بدل دیتا تو ایسے ممنون ہوتے کہ خود مجھے شرمندگی ہونے لگتی۔ پھر فیض صاحب کے تعلق سے وہ باتیں یاد آتی ہیں جب فیض ہی نہیں بخاری، سالک، خلیفہ عبدالکیم وغیرہ ہم سبھی ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست راوی کے کنارے ٹہلتے رہتے اور ساتھ ہی ساتھ علم و ادب کی باتیں بھی ہوتی رہتیں۔ یہ حضرات مختلف زادیوں سے سوال کرتے اور یہ بندہ اپنی فہم کے مطابق جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتا۔ اور یہ بات تو سبجا حال کی ہے کہ ایک روز فیض صاحب نے صبح مجھے آن پکڑا اور کہا ”ایک کام سے آیا ہوں۔ ایک تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یورپ میں آج کل آرٹ کے کیا رجحانات ہیں اور آرٹ پیپر کیا چیز ہوتی ہے۔ دوسرے میں وائرکھر اور آئیکل بیننگ کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ٹھہری اور وادرا کا فرق بھی چند لفظوں میں بیان کر دیں تو اچھا ہے۔“ میں نے چائے پیتے پیتے سب کچھ عرض کر دیا۔ اٹھتے

اٹھتے پوچھنے لگے۔ ”ایک اور سوال ہے۔ غالب کس زمانے کا شاعر تھا اور کس زبان میں لکھتا تھا؟“ وہ بھی میں نے بتایا۔ اس کے کئی ماہ بعد تک ملاقات نہ ہوئی۔ ہاں اخبار میں پڑھا کر لاہور میں آرٹ کونسل کے ڈائریکٹر ہو گئے ہیں۔ غالب اس فوکری کے انٹرویو میں اس قسم کے سوال پوچھے جاتے ہوں گے۔

اکثر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ نقش فریادی کا رنگ کلام اور ہے اور فیض صاحب کے بعد کے جموں ”دست صبا“ اور ”زنداں نامہ“ کا اور۔ اب چونکہ اس کا پس منظر راز نہیں رہا اور بعض حلقوں میں بات پھیل گئی ہے، لہذا اسے چھپانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ فیض صاحب جب جیل گئے ہیں تو ویسے تو ان کو زیادہ تکلیف نہیں ہوئی لیکن کاغذ قلم ان کو نہیں دیتے تھے اور نہ شعر لکھنے کی اجازت تھی۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ان کی آتش نوائی پر قدغن رہے اور لوگ انہیں بھول بھال جائیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں۔ تدبیر کند بندہ تقدیر زندہ خندہ۔ فیض صاحب جیل سے باہر آئے تو سالم تا نگہ لے کر سیدھے میرے پاس تشریف لائے۔ در ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے۔ ”اور تو سب ٹھیک ہے لیکن سوچتا ہوں۔ میرے ادبی مستقبل کا اب کیا ہوگا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے میز کی دراز میں سے کچھ مسودے نکالے اور کہا یہ میری طرف سے نذر ہیں۔ پڑھتے جاتے تھے۔ اور حیران ہوتے جاتے تھے۔ فرمایا۔ ”بالکل یہی جذبات میرے دل میں آتے تھے۔ لیکن ان کو قلم بند نہ کر سکتا تھا۔ آپ نے اس خوبصورتی سے نالے کو پابند نے کیا ہے کہ مجھے اپنا ہی کلام معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”برادر عزیز! بنی آدم اعضاء یک دیگر اند۔ تم پر جیل میں جو گزرتی تھی۔ اسے میں یہاں بیٹھنے بیٹھے محسوس کر لیتا تھا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ بہر حال اب اس کلام کو اپنا ہی سمجھو بلکہ اس میں میں نے تخلص بھی تمہارا ہی باندھا ہے اور ہاں نام بھی میں تجویز کئے دیتا ہوں۔ آدھے کلام کو دست صبا کے نام سے شائع کرو اور آدھے کو ”زنداں نامہ“ کا نام دو۔ اس پر بھی ان کو تامل رہا۔ بولے ”یہ برا سا لگتا ہے کہ ایسا کلام جس پر ایک محب صادق نے اپنا خون جگر نچایا ہو اپنے نام سے منسوب کر دوں۔“ میں نے کہا۔ ”فیض میاں دنیا میں چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے شیکسپیر بھی تو کسی سے لکھوایا کرتا تھا۔ اس سے اس کی عظمت میں کیا فرق آیا؟“ اس پر لا جواب ہو گئے اور رقت طاری ہو گئی۔

فیض صاحب میں ایک اور بات میں نے دیکھی۔ وہ بڑے ظرف کے آدمی ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے کسی پر شکھی یہ راز افشا نہ کیا کہ یہ مجھ سے ان کا نتیجہ فکر نہیں۔ دوسری طرف جب انہیں انعام لے کر آئے تو تمغہ اور آدھے روپے میرے سامنے ڈھیر کر دیئے کہ اس کے اصل حق دار آپ ہیں۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں۔ بیان کرنے لگوں تو کتاب ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا نمود و نمائش سے اس بندے کی طبیعت ہمیشہ نفور رہی ہے۔ و اما فیقی الا باللہ۔

جنتی نئے سال کی

ع آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج۔ یعنی بلبل بولتا تھا یا بولتی تھی تو لوگ جان لیتے تھے کہ بہار آگئی ہے۔ ہم نئے سال کی آمد کی فال جنتیوں سے لیتے ہیں۔ ابھی سال کا آغاز دور ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مشہور عالم، مفید عالم جنتیاں دکانوں پر آن موجود ہوتی ہیں۔ بعض لوگ جنتی نہیں خریدتے۔ خدا جانے سال کیسے گزارتے ہیں۔ اپنی قسمت کا حال، اپنے خوابوں کی تعبیر، اپنا ستارہ (چاند سورج وغیرہ بھی) کیسے معلوم کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جنتی اپنی ذات سے قاموس ہوتی ہے۔ ایک جنتی خرید لو اور دنیا بھر کی کتابوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ فہرست تعطیلات اس میں، نماز عید، اور نماز جنازہ پڑھنے کی تراکیب، جانوروں کی بولیاں، داکٹی کیلنڈر، محبت کے تعویذ، انبیائے کرام کی عمریں، اولیا ءے کرام کی کرامتیں، لکڑی کی پیمائش کے طریقے، کون سا دن کس کام کیلئے موزوں ہے۔ فہرست عرس ہائے بزرگان دین، صابن سازی کے گر، شیخ سعدی کے اقوال، چینی کے برتن توڑنے اور شیشے کے برتن جوڑنے کے نسخے، اعضاء پھڑکنے کے نتائج۔ کرہ ارض کی آبادی، تاریخ وفات نکالنے کے طریقے۔ یہ محض چند مضامین کا حال ہے۔ کوزے میں دریا بند ہوتا ہے اور دریا میں کوزہ، یوں تو سبھی جنتیاں مفید مضامین کی پوٹ ہوتی ہیں، جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے لیکن روشضمیر جنتی (جیسی) کو خاص شہرت حاصل ہے، اس وقت ہمارے سامنے اسی کا تازہ ترین ایڈیشن ہے۔ ایک باب اس میں ہے ”کون سا دن کون سے کام کیلئے موزوں ہے“۔

ہفتہ:- سفر کرنے، بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کیلئے۔

اتوار:- شادی کرنے، افسروں سے ملاقات کرنے کے لئے۔

بدھ:- نیالباس پہننے، غسل صحت کیلئے۔

جمعرات:- حجامت بنانے، دعوت احباب کیلئے۔

جمعہ:- غسل اور شادی وغیرہ کرنے کیلئے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ اندھا دھند جس دن جو کام چاہیں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ جنتی سب کے پاس ہو تو زندگی میں انضباط آجائے۔ ہفتے کا دن آیا اور سبھی لوگ سوٹ کیس اٹھا کر سفر پر نکل

گئے۔ چونہ جاسکے وہ بچوں کو اسکول میں داخل کرانے پہنچ گئے۔ اس سے غرض نہیں کہ اسکول کھلے ہیں یا نہیں یا کسی کے بچے ہیں بھی یا نہیں۔ جدھر دیکھو بھینز لگی ہے۔ اتور کو ہر گھر کے سامنے چھو لداریاں تتی ہیں۔ اور ڈھولک بج رہی ہے۔ لوگ سہرے باندھنے کے بعد جنتری ہاتھ میں لئے افسروں سے ملاقات کرنے چلے جا رہے ہیں۔ بدھ کو کبھی حماموں میں پہنچ گئے۔ اور جمہرات کو کبھی نے حجامت ہوائی، اور دوستوں کے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں کہ ہمارے ہاں آکر دعوت کھا جائیو۔ جمد کو نکاح ثانی کا نمبر ہے۔ جو لوگ اس منزل سے گزر چکے ہیں وہ دن بھر نل کے نیچے بیٹھ کر نہائیں کہ ستاروں کا یہی حکم ہے۔

ہم جو خواب دیکھتے ہیں وہ بالعموم عام قسم کے ہوتے ہیں اور صبح تک یاد بھی نہیں رہتے۔ جنتری سے معلوم ہوا کہ خوابوں میں بھی بڑے تنوع کی گنجائش ہے۔ خواب میں پھانسی پانے کا مطلب ہے بلند مرتبہ حاصل ہونا۔ افسوس کہ ہم نے خواب تو کیا اصل زندگی میں بھی پھانسی بھی نہ پائی۔ بلند مرتبہ نہ مل سکے کی اصل وجہ اب معلوم ہوئی۔ من نہ کروم شاذر نکیند۔ اسی طرح گھوڑا دیکھنے کا مطلب ہے دولت حاصل کرنا۔ قیاس کہتا ہے کہ مطلب و کنوریہ کے گھوڑے سے نہیں، رلیں کے گھوڑے سے ہے۔ خچر دیکھنے سے مراد ہے سفر پیش آنا۔ جو لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں انکو ہوائی جہاز دیکھنا چاہئے۔ بلی کا بچہ مارنا بیماری کے آنے کی علامت ہے۔ سانپ کا گوشت کھانا دشمن کا مال حاصل ہونے کی۔ خواب میں کان میں چیونٹی گھس آئے تو سمجھئے موت قریب ہے۔ (خواب کے علاوہ گھس آئے تو چنداں حرج نہیں، سرسوں کا تیل ڈالنے نکل آئے گی) اپنے سر کو گدھے کا سر دیکھنے کا مطلب ہے عقل کا جاتے رہنا۔ یہ تعبیر ہم خود سوچ سکتے تھے۔ کوئی آدمی اپنے سر کو گدھے کا سر (خواب میں بھی) دیکھے گا، اس کے متعلق کیا کہا جاسکتا ہے؟ خواب میں مردے سے مصافحہ کرنے کی تعبیر ہے درازی عمر، خدا جانے یہاں عمر فانی سے مراد ہے یا عمر جاودانی سے۔

ایک باب اس میں جسم کے اعضا کے پھڑکنے اور ان کے عواقب کے بارے میں بھی ہے۔ آنکھ پھڑکنا تو ایک عام بات ہے۔ زرخار، شانہ راست، گوش چپ، انگشت چہارم، زبان، گلہ، گردن، بجانب چپ، ٹھوڑی، بغل راست وغیرہ، ان پچاسی اعضا میں سے ہیں جن کے پھڑکنے پر نظر رکھنی چاہئے۔ ان میں بعض کے نتائج ایسے ہیں کہ ہم نقل کروں تو فاشی کی زد میں آجائیں۔ ایک دو امور البتہ فاضل مرتبین نظر انداز کر گئے۔ ننگ انتخاب کی پہلی پھڑک اٹھنا استادوں کے کلام میں آیا ہے۔ اس کا نتیجہ نہیں دیا گیا۔ ہماری رگ حمیت بھی کبھی کبھی پھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے عواقب کی طرف بھی یہ جنتری رہنمائی نہیں کرتی۔ یہ تھا نص رفع ہونے چاہئیں۔

یہ معلومات تو شاید کہیں اور بھی مل جائیں لیکن اس جنتری کا مغز محبت کے عملیات اور تعویذات ہیں جو حکمی تاثیر رکھتے ہیں۔ قیس میاں کی نظر سے کوئی ایسی جنتری گزری ہوتی تو جنگلوں میں مارے مارے نہ پھرتے۔ ایک نسخہ حاضر ہے۔

”محبت کے مارے کو چاہئے کہ ۱۲ مارچ کو بوقت ایک گھڑی بعد طلوع آفتاب مشرق کی طرف منہ کر کے نقش ذیل کو نام مطلوب بمع والدہ مطلوب اُنکو کے خون سے لکھ کر اپنے دہنے بازو پر باندھے اور مطلوب کو ۲۰ مارچ بوقت صبح ایک گھڑی ۴۵ پل پر بعد طلوع آفتاب اپنا سایہ دے۔ مطلوب فوراً مشتاق ہو جائے گا۔

۹۱، ۱۱، ۱۰، ۱۱، ۱۱، ۱۱

نام مطلوب مع والدہ مطلوب، اپنا نام مع نام والدہ

یہاں بعض باتیں جی میں آتی ہیں۔ اگر مطلوب یا محبوب بات نہیں کرتا تو اس کی والدہ اور دیگر رشتہ داروں کے نام کیسے معلوم کیے جائیں؟ پھر اُنکو کیسے پکڑا جائے اور ۲۰ مارچ کو بوقت صبح عین ایک گھڑی ۴۵ پل بعد طلوع آفتاب مطلوب کو کیسے مجبور کیا جائے کہ طالب کے سایے میں آئے۔ ان باتوں کا جنتری میں کوئی ذکر نہیں۔ ہاں جنتری کے پبلشر نے جنتر منتر مکمل نامی جو کتاب بقیہ چھ روپے شائع کی ہے۔ اس میں ان کی تفصیل ملے گی۔

جو لوگ ہماری طرح تن آسان ہیں، محبت میں اتنا کشت نہیں اٹھا سکتے ان کے لئے مرتبہ جنتری نے کچھ آسان تر عمل بھی دیے ہیں جن کی بدولت محبوب قدموں پر تو آ کر خیر نہیں گرتا لیکن مائل ضرور ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تعویذ ہے جسے ہر روز کاغذ کے چالیس ٹکڑوں پر لکھ کر اور نیچے طالب و مطلوب کے نام درج کر کے آٹے کی گولیوں میں لپیٹ کر دریا میں ڈالنا چاہئے۔ اور چالیس دن تک یہی کرنا چاہیے۔ ہم نے حساب لگایا ہے۔ ازراہ کفایت آدھے تولے کی گولی بھی بنائی جائے تو ایک پاؤ روزانہ یعنی دس سیر آٹے میں محبوب کو راضی کیا جاسکتا ہے۔ جو حضرت اس میں بھی خست کریں اور اپنی محبت کو بالکل پاک رکھنا چاہیں، وہ ایک اور عمل کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ جب بھی محبوب سامنے آئے، آہستہ سے دل میں بسم اللہ الصمد، دس بار پڑھیں اور آخر میں محبوب کی طرف منہ کر کے پھونک ماریں۔ اس طرح کہ منہ کی ہوا اس کے کپڑوں کو چھو سکے۔ پندرہ بیس مرتبہ ایسا کرنے سے اس کے دل میں قرار واقعی محبت پیدا ہو جائے گی۔

یہ عمل بظاہر تو آسان معلوم ہوتا ہے لیکن عملاً ایسا آسان بھی نہیں۔ اول تو محبوب کو اتنی دیر

سامنے کھڑا رہنے پر مجبور کرنا کہ آپ دس بار عمل پڑھ کر پھونکیں مار سکیں اور وہ بھاگے نہیں، اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے۔ پھر آپ جو پھونکیں ماریں گے، اس بنا پر محبوب کیا رائے قائم کرے گا، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ شوقین مزاج ان دونوں سے قطع نظر کر کے ”محبت کا سرمہ“ استعمال کر سکتے ہیں جس کا بنانا تھوڑی محنت تو ضرور لے گا لیکن اس کا جادو بھی عالمگیر ہے۔ یعنی صرف محبوب ہی پر کاری اثر نہیں کرتا بلکہ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ یہ سرمہ ڈال کر ”جس کی طرف بھی صبح سویرے دیکھے وہی محبت میں مبتلا ہو جائے گا“۔

یہ سرمہ بنانے کیلئے حاجتمند کو ۱۹ فروری کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس روز وہ بوقت ”طلوع آفتاب پرانی داتن کو جلا کر اس کی راکھ میں چمکا دز کا خون ملائے اور اس سے یہ نقش بوقت صبح ایک گھڑی ۱۵ اپل بعد طلوع آفتاب لکھے اور اس پر سورۃ فلق گیارہ سو بار پڑھے۔ پھر نئے چراغ میں روغن کجد (تل کا تیل) ڈال کر جلائے اور اس کی سیاہی آنکھوں میں ڈالے“ حسب ہدایت ایک صاحب نے یہ سرمہ دنبالہ دار لگا یا تھا۔ اتنا ہم نے بھی دیکھا کہ محبوب انہیں دیکھتے ہی ہنس دیا۔ آگے کا حال ہمیں معلوم نہیں۔

یہی نہیں، صابن اور تیل تیار کرنے، بوٹ پالش بنانے، کھٹل اور مچھر مارنے اور مشہور عام ادویہ کی نقلیں تیار کرنے کی ترکیبیں بھی اس میں درج ہیں۔ لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں کہ اردو میں کوئی انسائیکلو پیڈیا نہیں۔ معلومات کی کتاب نہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کیا ہوتی ہے۔ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں۔ ہم نے انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا وغیرہ دیکھی ہیں۔ الم علم مضامین کا طومار ہے۔ اہل دل کے مطلب کی ایک بات بھی نہیں۔ نہ نسخے نہ تعویذ۔ نہ عرسوں کی تاریخیں نہ محبت کے عملیات نہ خواب نہ خوابوں کی تعبیریں۔ ہمارا یہ دستور ہو گیا ہے کہ باہر کی چیز کو ہمیشہ اچھا جانیں گے، اپنے ہاں کے سونے کو بھی مٹی گردانیں گے۔

نجات کا طالب، غالب (چند خطوط)

(۱)

”..... لومرزاتفتہ ایک بات لطیفہ کی سنو۔ کل ہرکارہ آیا تو تمھارے خط کے ساتھ ایک خط کراچی بندر سے منشی فیض احمد فیض کا بھی لایا جس میں لکھا ہے کہ ہم تمھاری صد سالہ بری مناتے ہیں۔ جلسہ ہوگا جس میں تمھاری شاعری پر لوگ مضمون پڑھیں گے۔ بحث کریں گے۔ تمھاری زندگی پر کتابیں چھپیں گی۔ ایک مشاعرہ بھی کرنا کارادہ ہے۔ تم بھی آؤ اور خرچہ آمدورفت کا پاؤ۔ دن کی روٹی اور رات کی شراب بھی ملے گی۔ بہت خیال دوڑایا، سمجھ میں نہ آیا کہ یہ صاحب کون ہیں۔ ان سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ اگر شاعر ہیں تو کس کے شاگرد ہیں۔ بارے منشی ہیرا سنگھ آئے اور دریافت ہوا کہ ادھر لاہور اور ملتان کی عملداری میں ان کا نام مشہور ہے۔ متوطن سیالکوٹ کے ہیں کہ لاہور سے آگے ایک بسسٹی ہے جہاں کھیلوں کا سامان اور شاعر اچھے بنتے ہیں۔ ایسے کہ نہ صرف ملک کے اندران کی مانگ ہے بلکہ دساور کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ان میاں فیض کے متعلق بھی منشی ہیرا سنگھ نے بتایا کہ اکثر یہاں سے دساور بھیجے جاتے ہیں۔ وہاں سے واپس کیے جاتے ہیں لیکن یہ پھر بھیجے جاتے ہیں۔ ادھر جو اورائے قفقاز روس کی سلطنت ہے وہاں کا والی ان کی بہت قدر کرتا ہے۔ اپنے ہاں انعام صد ہزاری بھی بخشا ہے کہ لیٹن انعام کہلاتا ہے اور کسی کسی کو ملتا ہے۔ یہ قصیدہ اچھا ہی کہتے ہوں گے۔ لیکن اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ دلی کا قلعہ آباد تھا تو بادشاہ کا قصیدہ اور جوان بخت کا سہرا ہم نے بھی لکھا تھا۔ غفران مآب نواب رامپور کی مدح میں بھی اکثر اشعار لکھے اور ملکہ وکنور یہ کا قصیدہ کہہ کر بھی لیفٹنٹ گورنر کے توسط سے گزرا نا لیکن کبھی اتنی یافت نہ ہوئی کہ ساہوکار کا قرضہ چیتا کرتے۔ اتنی سرکاریں دیکھیں، آمدنی اب بھی وہی ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے۔ فتوح کا اعتبار نہیں آئے آئے نہ آئے نہ آئے۔ منشی ہیرا سنگھ نے یہ بھی بتایا کہ یہ فیض احمد فیض انگریزی دان ہیں پھر بھی آدمی نیک اور شستہ ذات کے ہیں۔ کسی مدرسے میں لڑکے پڑھاتے ہیں۔ لڑکے پڑھانے والوں کے متعلق میری رائے اچھی نہیں۔ وہ مرد مجبول منشی امین الدین

قاطع والا بھی تو پٹیا لے میں راجا کے مدرسے میں مدرس تھا۔ لیکن خیر یہ آدمی اچھے ہی ہوں گے۔ خط تو بڑی محبت اور ارادت کا لکھا ہے۔ شروع خط میں چھاپے کے حرفوں میں ادارہ یادگار غالب بھی مرسوم ہے۔

اچھا ایک بات کل کے خط میں لکھنا بھول گیا تھا۔ منشی شیونرائن سے کہو کہ دیوان کا چھاپا روک دیں کہ ایک سوداگر کتاہوں کا بلا دی پنجاب سے آیا۔ ہوا ہے شیونرائن سے ہماری شرط تھی کہ وہ چھاپے تو پچاس نسخے احباب میں تقسیم کرنے اور صاحبان عالیشان کی نذر گزارنے کے لئے بایں تہی دستی دے زری اس سے قیمتا لیں گے تاکہ اس پر بار نہ پڑے لیکن یہ شخص اس شرط پر چھاپنے کو آمادہ ہے کہ ہمیں کچھ نہیں دینا پڑے گا۔ بلکہ وہ پانچ نسخے حق تصنیف میں ہم کو دے گا۔ جب کہ شیونرائن اور دوسرے مطبع والے ایک نسخہ دیتے تھے۔ بہت اخلاق کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آتے ہوئے دوشیشے شراب انگریزی کے بھی لایا تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے۔

ہاں تو وہ صدی والی بات رہی جاتی ہے۔ اسی سے دیکھ لو کہ عناصر میں اعتدال کی کیا حالت ہے۔ سوچتا ہوں، جاؤں کہ نہ جاؤں؟ ہنڈی بھیج دیتے تو کوئی بات بھی تھی۔ بعد میں یہ لوگ کرایہ آمدورفت بھی دیں یا نہ دیں نہیں بابا۔ نہیں جاتا۔ میں نہیں جاتا۔

نجات کا طالب
غالب

(۲)

سعادت و اقبال نشان مرزا علاؤ الدین خاں بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے۔ لو صاحب یہ تمہارا پوتا فرخ مرزا کا بیٹا مرزا جمیل الدین عالی انعام اور جاگیریں بانٹے لگا۔ یہ حال اکل الاخبار سے کھلا۔ تم نے تو نہ بتایا۔ لو ہارو سے میر اشرف علی آئے تو یہ بھی پتہ چلا کہ یہ عزیز لو ہارو چھوڑ ادھر کہیں سندھ میں جانو کر ہوا۔ پہلے سرکار عالی کی پیشی میں تھا۔ اب کسی سا ہو کارے کے کارخانے میں منصرم ہے۔ اتنی دور کیوں گئے دیا؟ نو ابوں اور زمینوں کے لڑکے سینھوں سا ہو کاروں کے مصدی ہوئے۔ ہاں صاحب شاہی لدھی تو کچھ بھی نہ رہا۔ عالی شانہ تخلص ہے۔ شعر کہتا ہوگا۔ اللہ ترقی دے۔ کس سے اصلاح لیتا ہے؟

ہاں تو وہ انعام جاگیر والی بات۔ اکل الاخبار والے مضمون میں تھا کہ سال بھر میں جو دیوان یا

قصہ کہانیاں وغیرہ از قسم داستان امیر حمزہ چھپتے ہیں۔ اسی عزیز کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ یہ انکو جانچنا ہے اور جو کلام پسندیدہ ٹھہرے اس پر انعام دیتا ہے۔ کسی کو پانچ ہزار، کسی کو دس ہزار، کسی کو کم بھی۔ ہزار دو ہزار بھی۔ یہ جو میرا اردو کا کلام کا پور میں چھاپا ہوا ہے، مطبع والے نے بامید انعام بھیج دیا تھا۔ وہ تو مصر تھا کہ اس کے ساتھ ایک قصیدہ بھی خوش خط لکھوا کر طلائی جدول کے ساتھ بھیجا جائے۔ لیکن میں نے اسے ضروری نہ جانا کہ تعلقات میرے تم لوگوں سے عزیز داری کے کسی سے مخفی نہیں۔ میں تو اس کے بعد

ہندو کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ الما مطبع والوں کے نام لفافہ آیا کہ فارم بھر کے بھیجو۔ چھ جلدیں داخل کرو اور پھر منصفوں کی کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کرو۔ یہ بھی لکھا تھا کہ مرزا جمیل الدین عالی فقط انعام کی رقم کا مانتدار ہے۔ فیصلے کا کچھ اور صاحبان علم کی رائے پر انحصار ہے۔ مطبع والے نے ان لوگوں کے نام دریافت کئے۔ اس کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔ اب اکل الاخبار کہتا ہے کہ ایک انعام سراج الدین ظفر کو ملا۔ میں سمجھا شاہ نے رنگوں میں کلام چھپوا کر بھیجا ہوگا۔ لیکن بات جی کو نہیں لگتی تھی کہ وہ سرکار تو انعام دینے والی تھی۔ اب وضاحت ہوئی کہ یہ اور صاحب ان کے ہمنام ہیں لیکن شاعر اچھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ ایک اور صاحب نے انعام پایا لیکن ناخوش ہو کر لوٹا دیا کہ مجھے ضرورت نہیں۔ اللہ اللہ کیسے مستغنی لوگ ہیں۔ پورے ایک ہزار کا انعام تھا۔

صاحب میں دوبارہ لکھتا ہوں کہ اب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر مقہر اداس سے قرض لیا۔ ادھر درباری مل کو مارا۔ ادھر خوب چند جین سکھ کی کوشی جالوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ۔ چاٹو۔ پھر کبھی خان نے کچھ دے دیا کبھی الور سے کچھ دلادیا۔ میرا مختار کار بنیا سو ماہ بماء چاہے۔ گویا سود جُدا۔ مول جُدا۔ چوکیدار جُدا۔ بی بی جُدا۔ بچے جُدا۔ شاگرد پیشہ جُدا۔ آمد وہی کہ تھی۔ اب کہ جو یہ بنیا پنشن کے مجمعہ دو ہزار لایا، اس نے اپنے پاس رکھ لئے کہ پہلے میرا حساب کیجئے۔ سات کم پندرہ سو روپے اس کے ہوئے۔ قرض متفرق گیارہ سو روپے۔ پندرہ اور گیارہ سو جھیس سو روپے۔ یعنی دو ہزار مل کر بھی چھ سو روپے گھانا۔ یہ جو ایک ہزار روپے ان شاعر مستغنی الاحوال نے اپنے مقام سے فروتر پا کر لوٹا دیئے ہیں، غالب غریب کو مل جاتے تو کم از کم اب تک کا قرض صاف ہو جاتا۔ شاعر سے بس یہی تو یافت تھی کہ قصیدہ لکھا، انعام پایا۔ اب وہ سرکاریں نہ رہیں۔ کتاب چھپاؤ تو مطبع والا مشکل سے راضی ہوتا ہے۔ کہتا ہے اتنی جلدیں خریدو۔ اپنے دوستوں کے پاس بکواؤ، تب ہاتھ لگاتا ہوں۔ یہ تصانیف پر انعام و کرام والا قصہ نیا ہے۔ اگر تم اس عزیز کو دو حرف لکھ دو تو بڑی بات ہو۔ اس بات کا میں نے نہیں مانتا کہ کلام ان کو یا ان کی کمیٹی کو پسند نہیں آیا۔ مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کسی اور سے نہ کہتا۔ تم سے واجب جان کر کہہ دیا کہ تا خیال

کرتے ہو۔ محبت کا دم بھرتے ہو۔

راقم
غالب

(۳)

”باہا با۔ میرا پیارا میر مہدی آیا۔ غزلوں کا پشتارہ لایا۔ ارے میاں بیٹھو۔ شعر و شاعری کا کیا ذکر ہے۔ یہاں تو مکان کی فکر ہے۔ یہ مکان چار روپے مہینے کا ہر چند کہ ڈھب کا نہ تھا لیکن اچھا تھا۔ شریفوں کا محلہ ہے۔ پہلے مالک نے بیچ دیا۔ نیا مالک اسے خالی کرانا چاہتا ہے۔ مدد لگا دی ہے۔ پاڑ باندھ دی ہے۔ اسی دو گز چوڑے صحن میں رات کو سوتا ہوں۔ پاڑ کیا ہے۔ پھانسی کی ٹکڑ نظر آتی ہے۔ نشی حبیب اللہ ذکا نے ایک کوٹھی کا پتہ دیا تھا جو شہر سے باہر ہے۔ سواڑ ہوا۔ گیا۔ مکان تو بڑا نضا تھا۔ احاطہ بھی۔ چمن اور گل بوئے بھی۔ لیکن حویلی اور محل سرا الگ الگ نہ تھے۔ ڈیوڑھی بھی نہ تھی۔ بس ایک پھانک تھا۔ کمرے اور کونھڑیاں خاصی۔ کمرے کے ساتھ کوٹھیاں میں چھینی مٹی کے چوبے بے سے بھی بنے تھے۔ معلوم ہوا بیت الخلا ہیں۔ صاحبان انگریز ان پر چڑھ کر بیٹھتے ہیں۔ ایک زنجیر کھینچتے ہی پانی کا تریزا آتا ہے۔ سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔ عجیب کا رخا نہ ہے۔ میں نے کرایہ پوچھا اور جھٹ کہا پانچ روپے منظور۔ ایک روپیہ زائد کی کچھ ایسی بات نہیں۔ لیکن مالک مکان کا کارندہ ہنسا اور بولا۔ پانچ روپے نہیں مرزا صاحب! پانچ سو روپے۔ میں نے کہا۔ خریدنا منظور نہیں۔ کرائے پر لینا ہے۔ وہ مردک سر ہلا کر کہنے لگا۔ پانچ سو کرایہ ہے اور دو سال کا بیٹھگی چاہیے یعنی بارہ ہزار رو اور آن اُتر دے۔ یہاں چٹلی قبر کے پاس دھنا سیٹھ نے حویلی ڈھا کر اُونچا اُونچا ایک مکان بنایا ہے۔ دو دو تین تین کمرے کے حصے ہیں۔ کلیان کو بھیجا تھا خبر لایا کہ وہ چڑی مانتے ہیں۔ میں حیران ہوا۔ انہیں معلوم ہے، میں چڑی عمامہ کچھ نہیں باندھتا۔ ٹوپی ہے ورنہ ننگے سر۔ لوہارو والوں کے ہاں سے جو چڑی پار سال ملی تھی، وہ نکلا کے بھوادی کہ دیکھ لیں اور اطمینان کر لیں کہ مکان ایک مرد معزز کو مطلوب ہے۔ وہ اُلٹے پاؤں آیا کہ یہ دستار نہیں چاہیے رقم مانگتے ہیں دس ہزار۔ کرایہ اس کے علاوہ ساٹھ روپے مہینہ۔ بڑے بد معاملہ لوگ ہیں۔ آخر چڑی پھر صندوق میں رکھوا دی۔ یہ مالک مکان کل آتا ہے۔ دیکھیے کیا کہتا ہے۔

میرن صاحب آئیں۔ شوق سے آئیں۔ لیکن یہ گانے بجانے والوں میں نوکری کا خیال ہمیں پسند نہیں۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن معلوم ہوا ہے کہ ایک کوٹھی میں مشینیں لگا کر اس کے سامنے لوگ گاتے ناچتے ہیں۔ شعر پڑھتے ہیں۔ تقریریں کرتے ہیں۔ لوگ اپنے گھروں میں ایک ڈبا سامنے رکھ کر سن لیتے ہیں بلکہ اب تو اور ترقی ہوئی ہے۔ ایک نیا ڈبہ انگریز کارگروں نے نکالا ہے۔ اس میں ایک گھنڈی ہے، اسے مروڑنے پر سننے کے علاوہ ان ارباب نشاط کی شکلیں بھی گھر بیٹھے دیکھ سکتے ہیں۔ ایک خط ان میں سے ایک جگہ سے میرے پاس بھی آیا تھا۔ آدمی تو یہیں کے ہیں۔ لیکن انگریزی میں لکھتے ہیں بہت دنوں رکھا رہا۔ آخر ایک انگریزی خواں سے پڑھوایا۔ مشاعرے کا دعوت نامہ تھا۔ کچھ حق الخدمت کا بھی ذکر تھا۔ میں تو گیا نہیں۔ دوبارہ انہوں نے یاد کیا نہیں۔ چونکہ پیسے دیتے ہیں۔ سرکاروں درباروں کی جگہ ان لوگوں نے لے لی ہے۔ جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ میرن صاحب مجھے جان سے عزیز لیکن ان لوگوں سے سفارش کیا کہہ کر کروں کہ سید زادہ ہے؟ اردو فارسی کا ذوق رکھتا ہے؟ اسے نوکر رکھو۔ اچھا رکھ بھی لیا تو کافی نوپوں میں رکھیں گے۔ میر مہدی یہ وہ زمانہ نہیں۔ اب تو انگریز کی پوچھ ہے یا پھر سفارش چاہئے۔

خط لکھ لیا اب محل سرائیں جاؤں گا۔ ایک روٹی شوربے کے ساتھ کھاؤں گا۔ شہر کا عجیب حال ہے۔ باہر نکلتا محال ہے۔ ابھی ہرکارہ آیا تھا۔ خبر لایا کہ ہڑتال ہو رہی ہے۔ ہاٹ بازار سب بند۔ لڑکے جلوس نکال رہے ہیں۔ نعرے لگا رہے ہیں۔ کبھی کبھی لڑکوں اور برتنداروں میں جھڑپ بھی ہو جاتی ہے۔ میر مہدی معلوم نہیں اس شہر میں کیا ہونے والا ہے۔ میرن کو وہیں روک لو۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کو دعو۔

نجات کا طالب
غالب

نشی صاحب میاں داد خاں سیاح یہ خط نواب غلام بابا خاں کے توسط سے بھیج رہا ہوں کہ تمہارا تحقیق نہیں اس وقت کہاں ہو۔ اشرف الاخبار تمہارے نام بھجوا یا تھا وہ والہاں آ گیا کہ مکتوب الیہ شہر میں موجود نہیں۔ اس اخبار کے مہتمم صاحب کل آئے تو کچھ اخبار بلا دے دیکر کے دے گئے کہ مرزا صاحب انہیں پڑھیے اور ہو سکے تو رنگ ان لوگوں کی تحریر کا اختیار کیجئے کہ آج کل اسی کی مانگ ہے۔ یہ اخبار لاہور اور کراچی بندر کے ہیں۔ کچھ سمجھ میں آئے کچھ نہیں آئے۔ آدھے آدھے صفحے تو تصویروں کے ہیں۔ دود رنگ کی چھپائی۔ موٹی موٹی سرخیاں۔ افرنگ کی خبریں۔ اگر بہت جلدی بھی آئیں تو مہینہ سوا مہینہ تو لگتا ہی ہے لیکن یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں کہ آج واردات ہوئی اور آج ہی اطلاع مل گئی۔ گویا لوگوں کو پرچا تے ہیں۔ بے پر کی اڑاتے ہیں۔ پھر ایک ہی اخبار میں کشیدہ کاری کے نمونے ہیں، ہنڈیا بھوننے کے نسخے ہیں۔ کھیل تماشوں کے اشتہار ہیں۔ ایک لمبا چوڑا مضمون دیکھا۔

”اداکارہ دیا کے چانغوزے کس نے چرائے“ سارا پڑھ گیا یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہوئی۔ کسی کی جیب سے کسی نے چانغوزے نکال لئے تو یہ کون سی خبر ہے۔ خیر یہ سب سہی، لطیفی کی بات اب کہتا ہوں۔ کراچی کے ایک اخبار میں میرے تین خط چھپے ہیں۔ ایک نشی ہر گوپال تفت کے نام ہے، ایک میں نواب علاقائی سے مخاطب اور ایک میر مہدی مجروح کے نام۔ میں حیران کہ ان لوگوں نے میرے خطوط اخبار والوں کو کیوں بھیجے۔ اب پڑھتا ہوں تو مضمون بھی اجنبی لگتا ہے۔ اب کہ جو شراب انگریزی سوداگر دے گیا ہے کچھ تیز ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی کیفیت اک گونہ بے خودی سے آگے کی ہو جاتی ہے۔ یا تو میں نے اس عالم میں لکھ اور کلیان اٹھا کر ڈاک میں ڈال آیا۔ یا پھر کسی نے میری طرف سے گھڑے ہیں اور انداز تحریر اڑانے کی کوشش کی ہے۔ کونے میں کسی کا نام بھی لکھا ہے۔ ”ابن انشا“۔ کچھ عجیب نہیں یہی صاحب اس شرارت کے بانی مہانی ہوں۔ نام سے عرب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کیا حرکت ہے۔ سرا سر دخل در معقولات ہے۔ اخبار نویسی میں ٹھنول کیا معنی؟ بیہنسی مجھے بات پسند نہیں آتی۔

امید ہے وہ وہیوں تم نے نواب صاحب کو پہنچا دی ہوں گی۔ نواب صاحب سے میرا بہت بہت سلام اور اشتیاق کہنا۔ میں سادات کا نیاز مند اور علی کا غلام ہوں۔

نجات کا طالب
غالب

ناول مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ

پاکستان ناول مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ ہونہار مصنفین اور یکہ تاز ناشرین کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے کا مسرت سے اعلان کرتی ہے۔ کارخانہ ہذا میں ناول جدید ترین آٹومیٹک مشینوں پر تیار کئے جاتے ہیں اور تیاری کے دوران انہیں ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا۔ ناول اسلامی ہو یا جاسوسی۔ تاریخی یا رومانی۔ مال عمدہ اور خالص لگایا جاتا ہے اس لئے یہ ناول مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ پڑھنے کے علاوہ بھی یہ کئی کام آتے ہیں۔ بچہ رو رہا ہو۔ ضد کر رہا ہو۔ دوسروں میں راہ راست پر آجائے گا۔ بلی نے دودھ یا کتے نے نعمت خانہ میں منہ ڈال دیا ہو۔ دور ہی سے تاک کر ماریے۔ پھر ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ بیٹھنے کی چوکی اور گھڑے کی گھڑوچی کے طور پر استعمال ہونے کے علاوہ یہ چوروں ڈاکوؤں کے مقابلے میں ڈھال کا کام بھی دیتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس کے مطالعے سے دل میں شجاعت کے جذبات خواہ مخواہ موجزن ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اپنی ضخامت اور پٹھے کی نوکیلی جلد کے باعث۔۔۔ خواتین کیلئے ہمارے ہاں واش اینڈ ویئر (WASH AND WEAR) ناول بھی موجود ہیں تاکہ ہیروئن کا نام بدل کر پلاٹ کو بار بار استعمال کیا جاسکے۔ ایک ہی پلاٹ برسوں چلتا ہے۔ پندرہ بیس ناولوں کے لئے کافی رہتا ہے۔

واش اینڈ ویئر کو الٹی ہمارے اسلامی تاریخی ناولوں میں بھی دستیاب ہے۔ آرڈر کے ساتھ اس امر سے مطلع کرنا ضروری ہے کہ کون سی قسم مطلوب ہے۔ ۶۵% رومان اور ۳۵% تاریخ والی یا ۶۵% تاریخ اور ۳۵% رومان والی۔ اجزائے ترکیبی عام طور پر حسب ذیل ہوں گے:-

۱۔ ہیروئن۔ کافر و شیزہ۔ تیر تفنگ، ہنٹ پنے اور بھیس بدلنے کی ماہر۔ دل ایمان کی روشنی سے منور۔ چھپ چھپ کر نماز پڑھنے والی۔

۲۔ کافر بادشاہ۔ ہماری ہیروئن کا باپ لیکن نہایت شقی القلب۔ انجام اس کا برا ہوگا۔

۳۔ لشکر کفار۔ جس کے سارے جرنیل کچیم شیم اور بزدل۔

۴۔ اہل اسلام کا لشکر۔ جس کا ہر سپاہی سوالا کھ پر بھاری۔ نیکی اور خدا پرستی کا پٹلا۔ پابند صوم و

- صلوٰۃ۔ قبول صورت بلکہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ بحر ظلمات میں کھوڑے دوڑانے والا۔
- ۵۔ ہیرو۔ لشکر متذکرہ صدر کا سردار۔ اُس حسن کی کیا تعریف کریں، کچھ کہتے ہوئے جی دڑتا ہے۔
- ۶۔ سبز پوش خوبہ خضر۔ جہاں پلاٹ رک جائے اور کچھ سمجھ میں نہ آئے، وہاں مشکل کشائی کرنے والا۔

۷۔ ہیرو کا جاں نثار ساتھی۔ نو جوان اور کنوارا تاکہ اس کی شادی بعد ازاں ہیروئن کی وفادار اور محرم راز خادمہ یا سہیلی سے ہو سکے۔

۸۔ کافر بادشاہ کا ایک چشم وزیر جو شہزادی سے اپنے بیٹی کی، بلکہ ممکن ہو تو اپنی شادی رچانے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ چونکہ ادھار محبت کی کی قینچی ہے۔ لہذا ہیروئن کے التفات سے محروم رہتا ہے۔

پلاٹ تو ہمارے ہاں کئی طرح کے ہیں لیکن ایک اسٹینڈرڈ ماڈل جو عام طور پر مقبول ہے یہ ہے کہ ایک قبیلے کا نو جوان دوسرے قبیلے کی دوشیزہ پر فدا ہوتا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ دوشیزہ لامحالہ دوسرے قبیلے کے سردار کی جیتی بٹی ہوتی ہے۔ پانچ انگلیاں پانچوں چراغ۔ خوبصورت، سلیقہ مند، عالم بے بدل۔ لاکھوں اشعار زبانی یاد۔ کرنا خدا کا کیا ہوتا ہے، اس سچ میں دونوں قبیلوں میں لڑائی ٹھن جاتی ہے۔ ہمارا ہیرو محبت کو فرض پر قربان کر کے شمشیر اٹھا لیتا ہے اور بہادری کے جوہر دکھاتا، کشتوں کے پستے لگا تا دشمن کی قید میں چلا جاتا ہے۔ محافظوں کی آنکھ میں دھول جھونک کر طالب و مطلوب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اشعار اور مکالموں کا تبادلہ ہوتا ہے اور ہیروئن بھی پہلے ایک جان سے پھر ہزار جان سے اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ راستے میں ظالم سماج کئی بار آتا ہے لیکن ہر دفعہ منہ کی کھاتا ہے۔ دانت پیتارہ جاتا ہے۔ آخر میں ناول حق کی فتح، محبت کی جیت، نعرہ نکبیر، شرعی نکاح، دونوں قبیلوں کے ملاپ اور مصنف کی طرف سے دعائے خیر کے ساتھ آئندہ ناول کی خوشخبری پر ختم ہوتا ہے۔

آرڈر دیتے وقت مصنف یا ناشر کو بتانا ہوگا کہ ناول پانچ سو صفحے کا چاہیے، ہزار صفحے کا یا پندرہ سو کا؟ وزن کا حساب بھی ہے۔ دوسری ناول۔ پانچ سیری ناول۔ سات سیری ناول۔ پندرہ تیس سیری بھی خاص آرڈر پر مل سکتے ہیں۔ گاہک کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ اسی پلاٹ کو برقرار رکھتے ہوئے ماحول کس ملک کا رکھا جائے۔ عراق کا؟ عرب کا؟ ایران کا؟ افغانستان کا؟ ہیرو اور ہیروئن کے نام بھی گاہک کی مرضی کے مطابق رکھے جاتے ہیں۔ ایک پلاٹ پر تین یا اس سے زیادہ ناول لینے پر ۳۳% رعایت۔

خواتین کیلئے بھی جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، گھریلو اور غیر گھریلو ہر طرح کے ناول بکفایت ہمارے ہاں سے مل سکتے ہیں۔ ان میں بھی محبت اور خانہ داری کا تناسب بالعموم

۶۵% اور ۳۵% کا ہوتا ہے۔ فرمائش پر گھنٹا یا بڑھایا جاسکتا ہے۔ خانہ داری سے مطلب ہے ناول کے کرداروں کے کپڑوں کا ذکر۔ خاندانی حویلی کا نقشہ۔ بیاہ شادی کی رسموں کا احوال۔ زیورات کی تفصیل وغیرہ۔ ہیر اور ہیر ورن کے چچا زاد بھائی اور بہنیں۔ سہیلیاں اور رقیب وغیرہ بھی مطلوبہ تعداد میں ناول میں ڈلوائے جاسکتے ہیں۔ ہمارے کارخانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ خواتین کے ناول مروجہ پاکستانی فلموں کو دیکھ کر لکھے جاتے ہیں تاکہ بعد ازاں فلسا حضرات ان پر مزید فلمیں بناسکیں۔ معمولی سی اجرت پر ان ناولوں میں گانے اور دو گانے وغیرہ بھی ڈالے جاسکتے ہیں۔ اس سے مصنف اور فلسا کا کام اور آسان ہو جاتا ہے۔ گاہک کو فقط ہیر ورن کا نام تجویز کر دینا چاہیے۔ باقی سارا کام ہمارے ذمے۔ مال کی گھر پر ڈلیوری کا انتظام ہے۔

بازار کے ناول بالعموم ایسے گنجان لکھے اور چھپے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھ پر برا اثر پڑتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ صفحے میں کم سے کم لفظ رہیں۔ مکالمے اور مکالمہ بولنے والے دونوں کیلئے الگ الگ سطر استعمال کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے:-

شہزادی سبز پری نے کہا:-

”پیارے گلغام“

پیارے گلغام نے کہا:-

”ہاں شہزادی گلغام۔ ارشاد“

شہزادی سبز پری:-

”ایک بات کہوں؟“

گلغام:-

”ہاں ہاں کہو“

شہزادی:-

”مجھے تم سے پیار ہے۔“

گلفام:-

”سچ“

شہزادی صاحبہ:-

”ہاں سچ“

گلفام:-

”تو پھر شکریہ“

شہزادی نے کہا:-

”پیارے گلفام۔ اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ یہ میرا انسانی فرض تھا۔“

ایک ضروری اعلان۔ ہمارے کارخانے نے ایک عمدہ آئی لوئن تیار کیا ہے جو رقت پیدا کرنے والے ناولوں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں ایسا سین آئے، رونے کے بعد دودھ قطرے ڈرا پر سے آنکھوں میں ڈال لیجئے۔ آنکھیں دھل جائیں گی۔ نظرتیز ہو جائے گی۔ مسلسل استعمال سے عینک کی عادت بھی چھوٹ جاتی ہے۔ فی شیشی دو روپے۔ تین شیشیوں پر محصول ڈاک معاف۔ آنکھیں پونچھنے کے لئے عمدہ رومال اور دوپٹے بھی ہمارے ہاں سے دستیاب ہیں۔

مکمل باورچی خانہ جدید (ایک ریویو)

جناب مطبخ مراد آبادی کی یہ کتاب مستطاب ہمارے پاس بغرض ریویو آئی ہے۔ جو صاحب یہ کتاب لائے وہ نمونہ طعام کے طور پر بگھارے بینکوں کی ایک پتیلی بھی چھوڑ گئے تھے۔ کتاب بھی اچھی نکلی۔ بینک بھی۔ قلت گنجائش کی وجہ سے آج ہم فقط کتاب پر ریویو دے رہے ہیں۔ بینکوں پر پھر کبھی سہی۔ اس سلسلے میں ہم اپنے کرفرماؤں کو ریویو کی یہ شرط یاد دلانا چاہتے ہیں کہ کتاب کی دو جلدیں آنی ضروری ہیں۔ اور سالن کی دو پتیلیاں۔

اس کتاب میں بہت سی باتیں اور ترکیبیں ایسی ہیں کہ ہر گھر میں معلوم نہ ہونی چاہئیں، مثلاً یہ کہ سالن میں نمک زیادہ ہو جائے تو کیا کیا جائے۔ ایک ترکیب تو اس کتاب کے بموجب یہ ہے کہ اس سالن کو پھینک کر دوبارہ نئے سرے سے سالن پکایا جائے۔ دوسری یہ کہ کونکے ڈال دیجئے۔ چولہے میں نہیں سالن میں۔ بعد ازاں نکال کر کھائیے۔ یہاں تھوڑا سا ابہام ہے۔ یہ وضاحت سے لکھنا چاہیے تھا کہ کونکے نکال کر سالن کھایا جائے یا سالن نکال کر کونکے نوش کیے جائیں۔ ہمارے خیال میں دونوں صورتیں آزمائی جاسکتی ہیں۔ اور پھر جو صورت پسند ہو اختیار کی جاسکتی ہے۔

کھیر پکانے کی ترکیب بھی شامل کتاب ہذا ہے۔ اس کے لئے ایک چرنے، ایک کتے، ایک ڈھول اور ایک ماچس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نسخہ امیر خسرو کے زمانے سے آزمودہ چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس میں ماچس کا ذکر نہ ہوتا تھا۔ خدا جانے چرنے کو کیسے جلاتے ہوں گے۔ نیزھی کھیر عام کھیر ہی کی طرح ہوتی ہے۔ فقط اس میں بگلا ڈالنا ہوتا ہے تاکہ حلق میں بھنس سکے۔ اس کتاب میں بعض ترکیبیں ہمیں آسانی کی وجہ سے پسند آئیں۔ مثلاً باداموں کا حلو ایوں بنایا جاسکتا ہے کہ حلو کیلئے اور اس میں

بادام چھیل کر ملا دیجئے۔ بادام کا حلوا تیار ہے۔ بیگن کا اچار ڈالنے کی ترکیب یہ لکھی ہے کہ بیگن لیجئے۔ اور بطریقہ معروف اچار ڈال لیجئے۔

چند اور اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

آلو چھیلنے کی ترکیب

سامان:- آلو، چھری، پلیٹ، ناول، ڈینول، پٹی۔

آلو لیجئے۔ اسے چھری سے چھیلے۔ جن صاحبوں کو گھاس چھیلنے کا تجربہ ہے۔ ان کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ چھلے ہوئے آلو ایک الگ پلیٹ میں رکھتے جائے۔ بعض صورتوں میں جہاں چھیلنے والا ناخواندہ ہو یہ عمل بالعموم نہیں ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن ہماری اکثر قارئین پر بھی لکھی ہیں لہذا آلو چھیلنے میں جاسوسی ناول یا فلمی پرچے ضرور پڑھتی ہوں گی۔ ڈینول انہی کے لئے ہے۔ جہاں جے کا لگا ڈینول میں انگلی ڈبوئی اور پٹی باندھ لی۔ ہمارے تجربے کے مطابق ڈینول کی ایک شیشی میں آدھ سیر آلو چھیلے جاسکتے ہیں۔ بعض جزیس اور سلیقہ مند خواتین سیر بھر بھی چھیل لیتی ہیں۔ جن بہنوں کو ڈینول پسند نہ ہو وہ ٹکچر یا ایسی ہی کوئی اور دوائی استعمال کر سکتی ہیں۔ نتیجہ یکساں رہے گا۔

حلوہ بے دودھ

اس حلوے کی ترکیب نہایت آسان ہے۔ حلوہ پکائیے۔ اور اس میں دودھ نہ ڈالئے۔ نہایت مزیدار حلوہ بے دودھ تیار ہے ورق لگائیے اور چمچے سے کھائیے۔

نہاری

کون ہے جس کے منہ میں نہاری کا لفظ سن کر پانی نہ بھر آئے۔ اس کا رواج دہلی اور لاہور میں زیادہ ہے۔ لیکن دونوں جگہ نسخے میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ دلی والے تلیاں، پائے، مغز اور بارہ مسالے ڈالتے ہیں۔ جس سے زبان فصیح اور با محاورہ ہو جاتی ہے۔ پنجاب والے بھوسی، بنولے اور پنے ڈالتے ہیں کہ طب میں مقوی چیزیں مانی گئی ہیں۔ گھوڑے اول الذکر نسخے کو چنداں پسند نہیں کرتے۔ جس میں کچھ دخل صوبائی تعصب کا بھی ہو سکتا ہے لیکن اس تعصب سے دلی والے بھی یکسر خالی نہیں۔ ان کے سامنے دوسرے۔ کی نہاری رکھی جائے تو رغبت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ بعض تو برا بھی مان جاتے ہیں۔ اس

بات میں فقط ایک احتیاط لازم ہے۔ کھانے والے سے پوچھ لینا چاہیے کہ وہ آدمی ہے یا گھوڑا۔
 لائق مصنف نے سنہ ۱۹۰۷ء میں، کربلوں کی کھیر اور تھالی کے بیٹنگن وغیرہ تیار کرنے اور انڈا
 اُبالنے وغیرہ کی ترکیبیں بھی دی ہیں لیکن ہم نے خود مکمل باورچی خانہ کی صرف ایک ترکیب آزمائی ہے۔
 وہ ہے روٹی پکانے کی۔ قارئین بھی اسے آزمائیں اور لطف اٹھائیں۔

سب سے پہلے آٹا لیجئے۔ آٹا آگیا؟۔ اب اس میں پانی ڈالئے۔ اب اسے گوندھیے۔
 گندھ گیا؟ شاباش۔ اب چولہے کے پاس اکڑوں بیٹھیے۔ بیٹھ گئے! خوب۔ اب پیڑا بنائیے۔ جس کی
 جسامت اس پر موقوف ہے کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں یا بنوں کے۔ اب کسی ترکیب سے اسے
 چپٹا اور گول کر کے توڑے پر ڈال دیجئے، اسی کا نام روٹی ہے۔ اگر یہ کچی رہ جائے تو ٹھیک ورنہ کونلوں پر
 ڈال دیجئے تا آنکہ جل جائے۔ اب اسے اٹھا کر رومال سے ڈھک کر ایک طرف رکھ دیجئے اور نوکر کے
 ذریعے تنور سے کچی پکائی دو روٹیاں منگا کر سالن کے ساتھ کھائیے۔ بڑی مزیدار ہوں گی۔

مصنف نے دیباچے میں اپنے خاندانی حالات بھی دیئے ہیں۔ اور شجرہ بھی منسلک کیا ہے۔
 انکا تعلق دو پیازہ کے گھرانے سے ہے۔ شاعر بھی ہیں۔ بیاہ شادیوں پر ان کی خدمات حاصل کی جاسکتی
 ہیں۔ دیکھیں پکانے کے لئے بھی۔ سہرا کہنے کیلئے بھی۔ ہر ترکیب کے بعد مصنف نے اپنے اشعار بھی
 درج کیے ہیں جس سے دونوں خصوصیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ باورچی خانہ کا باورچی خانہ، دیوان کا دیوان۔

ہماری کمرشل سروس (۱)

خواتین و حضرات آج ہم قارئین کی پر زور فرمائش پر اپنے کالم کی کمرشل سروس کا آغاز کر رہے ہیں۔ ایک زمانے میں اخبار اور ریڈیو بھی ہمارے کالم کی طرح خشک بلکہ گرم خشک ہوتے تھے۔ پھر اشتہاروں کا زمانہ آیا اور ان میں کچھ رنگینی پیدا ہوئی۔ ریڈیو پر شروع شروع میں تو تقریروں، ڈراموں، منچروں، گانوں اور خبروں کے درمیان کبھی کبھی اشتہار آتے تھے۔ اب اشتہاروں کے درمیان جہاں جگہ خالی رہ جائے تو ڈرامے، منچر یا خبریں اس طرح دی جاتی ہیں جس طرح ہمارے اخباروں میں ادارے کے نیچے یا کہیں اور خالی جگہ رہ جائے تو کاتب خود ہی لکھ دیتا ہے ”اخبار ہذا میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے“۔ یا زیادہ با ذوق ہوا تو خودی کو بلند کر دیتا ہے یا تقدیر ام بتا دیتا ہے۔ ٹیلیوژن سلسلے نے تو خبریہ ریمز پہلے ہی سمجھ لی تھی کہ لوگ اشتہار سننے کے لئے ٹیلیوژن خریدتے ہیں، باقی پروگرام تو خانہ پوری کے ہیں۔ واقعی ہم بھی سوچتے ہیں کہ ٹیلیوژن رہنمائی نہ کرتا تو لوگ کس سے پوچھ کر بنا سکتی گئی، صابن اور بستر کی چادریں خریدتے۔ جس تس کا منہ نکا کرتے یا بغیر صابن ۴۰ سے کپڑے دھوئے اور بغیر نارنگی دنا پستی میں پکا دنا من سے بھر پور کھانا کھائے، کھری چار پائی پر لوٹ لگایا کرتے۔

تلوار مارکہ جوتے

ہماری فیکٹری کے عمدہ اور آرام دہ جوتے۔ شہر بھر میں مقبول۔ پہننے میں بھی اچھے۔ چٹانے میں بھی خوب۔ اس وقت ہمارے شہر میں جو ہزاروں لوگ جوتے چٹاتے پھر رہے ہیں ان میں زیادہ تر ہماری دکان کے گاہک ہیں، یہ جوتے بے روزگاروں کے لئے خاص طور پر موزوں ہیں۔

ہمارے تلوار مارکہ جوتوں کی سیاسی جماعتوں میں بڑی مانگ ہے۔ کراچی کی ایک سیاسی جماعت کے صدر فرماتے ہیں کہ ہم نے گزشتہ الیکشن کے دنوں میں یہی جوتے استعمال کیے تھے۔ ہمارے تمام امیدواروں میں انہی جوتوں میں دال بٹھی تھی۔ ایک اور سیاسی جماعت کے سیکرٹری صاحب بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ گزشتہ دنوں اس پارٹی کے دو گروہوں کے درمیان جو جوتا چلا تھا وہ ہماری ہی فیکٹری کا بنا ہوا تھا۔

پسوں اور کھٹلوں کے لئے بھی تلواریں مار کر جو توں سے بہتر کوئی شے کارگر نہیں۔ کھٹل یا پسو کو زمین پر رکھئے اور جو توں سے مسل دیجئے۔ ہمارے جوتے کا مسلا پانی نہیں مانگتا۔ لہذا یہ ان بستیوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ جن میں پانی کی کمی ہے۔

ہمارے جوتے جہیز میں دینے کیلئے خاص طور پر پسند کئے جاتے ہیں۔ جن بی بیوں کے پاس ہوں، وہ میاں تو کیا شے ہے پورے سسرال کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہیں۔

چام کے دام بڑھنے کے باوجود ہماری قیمتیں بازار کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ خاص آرڈر پر ہم پاپوش میں آفتاب کی کرن بھی لگا دیتے ہیں اور اس کے علاوہ پیسے چارج نہیں کرتے۔ نوٹ:- نیا اسٹاک آگیا ہے اور اب ہم اپنے تمام مہربان سرپرستوں کی خدمت کرنے کے قابل ہیں۔ یقین رکھیے کہ جو گاہک بھی ہماری دکان پر آئے گا ہم اس کو جوتا دیں گے۔

ملیر یا سے نجات حاصل کیجئے

ملیر یا سے نجات کے لئے کلن قوال اینڈ پارٹی ریڈیو سکر ز لارنس روڈ کی خدمات حاصل کیجئے۔

ملیر یا پچھروں سے پھیلتا ہے۔ بعض لوگ ان موزیوں سے نجات پانے کے لئے ناگوار بو والے تیل اور کوایل وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے قدیم زمانے سے یہ مقصد قوالی کے ذریعہ حاصل کیا جاتا رہا ہے۔ عارفانہ کلام روح کی تازگی اور بالیدگی ہی کا تیر بہدف نسخہ نہیں بلکہ ملیر یا کا بھی دشمن ہے۔ ہمارے قوال اور تالی بجانے والے دیکھتے دیکھتے پچھروں کے لاشوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ جن علاقوں میں ایک بار ہماری پائی کی خدمات حاصل کی گئیں وہاں کے لوگ نہ صرف نیک، خدا ترس اور صوفی ہو گئے۔ بلکہ موسیٰ بخار کا بھی کھکانہ ہوا۔

مختلف میوہیل کیٹیوں کے ہیلتھ افسروں کے شوقیت موجود ہیں۔

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

نیند تو صحت کے لئے نہایت ضروری چیز ہے لیکن یاد رکھیے خواب آور گولیوں کا استعمال خطرے سے خالی نہیں۔ اسی لئے سمجھدار لوگ، ادیب، شاعر، تاجر پیشہ، عشق پیشہ حضرات نیند لانے کیلئے ہمارے ہاں کی حسب ذیل مطبوعات استعمال کرتے ہیں۔

جدلیاتی لسانیات کے اساسی اصول، ۱۲۰ صفحہ قیمت چار روپے۔

تقدید کے مابعد الطبیعیاتی نظریات ۲۱۶ صفحے قیمت چھ روپے۔ فیملی سائز مطلوب ہو تو حضرت خرگوش لکھنوی کا تازہ ترین ناول ”خواب خرگوش“ استعمال کیجئے۔ ۱۲۵۰ صفحات پر محیط اس لافانی تحفے کی قیمت فقط اٹھارہ روپے ہے۔ محصول ڈاک معاف۔ خوراک بڑوں کے لئے چار سے آٹھ صفحے، بچوں کے لئے دو صفحے، تین سال سے کم عمر بچوں کو فقط کتاب کی شکل دکھا دینا کافی ہے۔ مقررہ خوراک سے زیادہ استعمال نہ کیجئے۔ خرائے آنے کا ڈر ہے۔

چند غیر ضروری اعلانات بس مسافروں کے لئے مژدہ

کراچی میں مالک ایسوسی ایشن بڑے فخر اور مسرت سے اعلان کرتی ہے کہ آج سے شہر میں تمام بسوں کے کرائے ڈگنے کر دیے گئے ہیں۔ امید ہے محبت وطن حلقوں میں اس فیصلے کا عام طور پر خیر مقدم کیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے بس مالکان کی آمدنی پر ہی نہیں، مسافروں کے معیار زندگی پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔

ایسوسی ایشن ہذا کرایوں میں اضافے کے علاوہ مسافروں کے لئے کچھ اور سہولتوں کا بھی اعلان کرتی ہے۔ مثلاً ہر بس میں جہاں فقط چالیس سوار یوں کی گنجائش ہوتی تھی، اب اس سے تین گنا مسافروں کو جگہ دی جایا کرے گی۔ اس مقصد سے ہر بس کی چھت میں لمبڑوں اور تسموں کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور سیٹیں نکال دی گئی ہیں جو خواہ مخواہ کھڑے ہونے والوں کے گھٹنوں سے ٹکراتی تھیں۔

پبلک کی مزید آسانی کے لئے ہر بس کی چھت پر، پائیدانوں پر، مڈگارڈوں پر، انجن پر حتیٰ کہ سائیکسٹیک پر مسافروں کے بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ ان خصوصی جگہوں کا کرایہ بھی کچھ زائد نہیں ہوگا۔ شرح ٹکٹ وہی رہے گی جو اندر بیٹھنے کی یعنی کھڑے ہونے اور نکلنے والے مسافروں سے وصول کی جائے گی۔ آئندہ سے سب مسافروں کے حقوق بھی مساوی ہوں گے۔ یعنی ہر مسافر کو بس کو دھکا لگانے کا یکساں حق ہوگا حتیٰ کہ آدھا ٹکٹ لینے والے بچوں اور بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے معذوروں کو بھی۔ بسوں میں یتیم خانوں کے لئے چندہ اکٹھا کرنے والوں، اور کھٹی مٹھی گولیاں بیچنے والوں کو بھی یہ حق دینے پر اس میننگ میں غور کیا جا رہا ہے جو کراچی فرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرنے کے لئے کمشنر صاحب کے دفتر میں اگلے ہفتے ہو رہی ہے۔

۲۔ پانی بندر ہے گا

ناظم آباد اور ناتھ ناظم آباد کے باشندوں کو مژدہ ہو کہ جمعے اور ہفتے کو ان کے گھروں کا پانی بندر ہا کرے گا۔ یہ سہولت روزانہ تیس گھنٹے پانی بندر بننے کی سہولت کے علاوہ ہے۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے فی الحال ہفتے

میں دودن سے زیادہ پانی مکمل طور پر بند رکھنا ممکن نہیں۔ تاغے کے دنوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھائی جائے گی۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ماہِ محرم کی آمد تک ہم ہفتے کے ساتوں دن پانی بند رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ بلدیہ کراچی اور کے ڈی اے نہایت مسرت سے اعلان کرتی ہیں کہ اہل ناظم آباد کے ایک دیرینہ مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے اس علاقے کے وائٹیکس میں فوری طور پر تین سو فیصدی اضافہ کیا جا رہا ہے۔ آگے چل کر اس میں اور بھی اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن کے ڈی اے اور بلدیہ کے روز افزوں وسائل اور محدود اخراجات کو دیکھتے ہوئے فی الحال اس کی قطعی طور پر ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

علامہ اقبال ٹاؤن ناتھ ناظم آباد کے پارک میں کامیاب تجربے کے بعد شہر کے دوسرے پارکوں کا پانی بھی بند کیا جا رہا ہے تاکہ زمین بھر بھری ہو جائے اور کتے آسانی سے اس میں لوٹ لگا سکیں۔

۳۔ آپ کا اپنا اسکول

انٹرنیشنل انگلش آکسفورڈ اسکول آپ کا اپنا اسکول ہے جو تعلیم کے جدید ترین اصولوں پر کھولا گیا ہے۔ چند خصوصیات:-

۱۔ فیس کا معیار نہایت اعلیٰ۔ شہر کا کوئی اور اسکول فیس کے معاملے میں ہمارے اسکول کا مقابلہ نہیں کرتا۔ انواع و اقسام کے چندے اس کے علاوہ ہیں، جن کی تفصیل پرنسپل صاحب کے دفتر سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

۲۔ اساتذہ نہایت محنتی، ایماندار اور قناعت پسند جن کو پیش قرار تنخواہوں پر رکھا گیا ہے۔ عام ٹیچر کی تنخواہ بھی ہمارے ہاں میونسپل کارپوریشن کے جمعدار سے کم نہیں اور پرنسپل کا مشاہرہ تو کسی بڑی سے بڑی غیر ملکی کمپنی کے چوکیدار کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے۔

۳۔ چھٹیاں۔ چھٹیوں کے معاملے میں بھی ہمارا اسکول دوسرے اسکولوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ہر ماہ فیس جمع کرانے کے دن کے علاوہ قریب قریب پورا سال چھٹی رہتی ہے۔ جو والدین سال بھر کی فیس اکٹھی جمع کرادیں، ان کے بچوں کو فیس کے دن بھی حاضری دینے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ماحول۔ اسکول نہایت مرکزی اور پُر رونق جگہ پر واقع ہے اور شہر کا سب سے قدیمی اوپن ایر اسکول ہے۔ یہاں طلباء کو مناظرِ فطرت سے محبت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ بالکل سامنے ایک سینما ہے اور ایک سرس۔ ایک بغل میں مونڈی گراج ہے اور دوسری طرف گڑ باغیچہ جس کی کھاد سارے شہر کو ہر ابھار کھنے کی ضمانت ہے۔ یرونیفر

کیوی کے اصول کے مطابق یہاں پڑھائی کتابوں سے نہیں کرائی جاتی بلکہ کسی اور طرح بھی نہیں کرائی جاتی تاکہ طالب علم کے ذہن پر تار و ابو جھنہ نہ پڑے۔

۵۔ نتیجہ۔ اسکول کا نتیجہ کم از کم سو فیصد رہتا ہے۔ کئی بار تو دو سو ڈھائی فیصد بھی ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ طالب علم ہو یا غیر طالب علم، اس اسکول کے پاس سے بھی گزر جائے تو پاس ہوئے بنائیں رہ سکتا۔ طالب علموں پر امتحان میں بیٹھنے کی کوئی پابندی نہیں۔ سب کو گھر بیٹھے کامیابی کی سندیں بھیج دی جاتی ہیں۔

اشتہارات 'ضرورت نہیں ہے' کے

ایک بزرگ اپنے نوکر کو فہمائش کر رہے تھے کہ تم بالکل گھامڑ ہو۔ دیکھو میر صاحب کا نوکر ہے، اتنا دور اندیش کہ میر صاحب نے بازار سے بجلی کا بلب منگایا تو اس کے ساتھ ہی ایک بوتل مٹی کے تیل کی اور دو موم بتیاں بھی لے آیا کہ بلب فیوز ہو جائے تو لائین سے کام چل سکتا ہے۔ اس کی چنی ٹوٹ جائے یا بستی ختم ہو جائے تو موم بستی روشن کی جاسکتی ہے۔ تم کو ٹیکسی لینے بھیجا تھا، تم آدھے گھنٹے بعد ہاتھ لٹکا تے آگئے۔ کہا کہ جی ٹیکسی تو ملتی نہیں۔ موٹر رکشہ کہتے تو لیتا آؤں۔ میر صاحب کا نوکر ہوتا تو موٹر رکشہ لے کر آیا ہوتا، تاکہ دوبارہ جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

نوکر بہت شرمندہ ہوا اور آقا کی بات پلے باندھ لی۔ چند دن بعد اتفاق سے آقا پر بخار کا حملہ ہوا تو انہوں نے اسے حکیم صاحب کو لانے کے لئے بھیجا۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب تشریف لائے تو ان کے پیچھے پیچھے تین آدمی اور تھے جو سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک کی بغل میں کپڑے کا تھان تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں لوٹا۔ اور تیسرے کے کندھے پر پھاؤڑا۔ آقا نے نوکر سے کہا۔ یہ کون لوگ ہیں۔ میاں نوکر نے تعارف کرایا کہ جناب ویسے تو حکیم صاحب بہت حاذق ہیں۔ لیکن اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ خدا خواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو میں درزی کو لے آیا ہوں اور وہ کفن کا کپڑا ساتھ لایا ہے۔ یہ دوسرے صاحب غسال ہیں اور تیسرے گورکن۔ ایک ساتھ اس لئے لے آیا کہ بار بار بھاگنا نہ پڑے۔

ایسے ہی ایک بزرگ ہمارے حلقہ احباب میں بھی ہیں۔ گلی سے ریڑھی والا ہانک لگاتا گزر رہا تھا کہ انگور ہیں چمن کے۔ پیچتے ہیں پیڑ کے پکے ہوئے۔ انہوں نے لڑکا بھیج کر اسے بلایا اور کہا 'میاں جی معاف کیجئے ہمیں ضرورت نہیں ہے، پھل والا چلا گیا تو ہم نے عرض کیا کہ اس زحمت کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو جا ہی رہا تھا اسے روکنا کیا ضرور تھا۔ یو۔ لے۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ اس پر بات واضح کر دی جائے اور معذرت بھی کی جائے کیونکہ بیچارہ اتنی دور سے اتنی امید لے کر پھل پہنچے آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے یہ گمان نہ گزرے کہ اس گھر میں شاید بہرے رہتے ہیں جو اس کی آواز نہیں سن

پاتے۔ یہی ہمارے دوست ایک روز کار میں ہمارے ساتھ گولی مار سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے تشریف لائیے۔ ربڑی، قلفی اور لٹی تیار ہے۔ انہوں نے فوراً کار بھڑائی اور دوکاندار سے کہا کہ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے پاس فرصت نہیں۔ ہم ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ دوسرے قلفی اور ربڑی ہم نہیں کھاتے اور لٹی کا بھلا یہ کون سا موسم ہے؟۔ بہر حال تمہاری پیش کش کا شکریہ۔ وہ تو بیٹھنا سنا کیا اور نہ

جانے کیا سمجھا کیا۔ کار میں واپس بیٹھتے ہوئے ہمارے دوست نے وضاحت کی کہ یہاں کے لوگ ان آداب کو کیا جانیں۔ یہاں تو دعوت نامہ آتا ہے اور اس کے نیچے RSVP لکھا ہوتا ہے کہ جواب سے مطلع فرمائیے۔ جن کو شریک نہیں ہونا ہوتا وہ بھی چپ بیٹھ رہتے ہیں۔ میزبان کو مطلع کرنا ضروری نہیں سمجھتے کہ بندہ حاضر ہونے سے معذور ہے۔ اس بیچارے کا کھانا ضائع جاتا ہے۔

ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم خود انہی آداب سے بے بہرہ لوگوں میں سے ہیں۔ لوگ اخباروں میں طرح طرح کے اشتہار چھپواتے ہیں کہ ہم پڑھ کر ان کی طرف متوجہ ہوں لیکن ہم انہیں پڑھ کر ایک طرف ڈال دیتے ہیں۔ کوئی ہمارے لئے ٹھیکے کا بندوبست کرتا ہے اور مینڈرنوٹس شائع کرتا ہے۔ کسی کو ہمارے ہاتھ پلاٹ یا مکان بچانا ہوتا ہے۔ کوئی ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس نے اپنے نالائق فرزند کو جائیداد سے عاق کر دیا ہے۔ کہیں کسی کی کوشش ہوتی ہے کہ ہم ان کی فرزندگی قبول کر لیں۔ اور ذات پات، تعلیم اور تنخواہ کی شرطیں من و عن وہی رکھی جاتی ہیں، جو ہم میں ہیں۔ کوئی ہمیں گھر بیٹھے لاکھوں روپے کمانے کا لالچ دیتا ہے۔ کوئی شارٹ ہینڈ کھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بہت سے کالج مشتاق ہیں کہ ہم ان کے ہاں داخلے لیں اور بعض اپنی کاریں اور ریفریجریٹر معقول قیمت پر ہماری نذر کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سب ضرورت مندوں سے آدمی کیسے عہدہ برآ ہو۔ بہت سوچنے کے بعد یہ ترکیب ہماری سمجھ میں آئی ہے کہ جہاں ہم ضرورت ہے، کا اشتہار چھپواتے ہیں وہاں ہم ضرورت نہیں ہے کا اشتہار چھپوادیں۔ ہماری دانست میں ان اشتہارات کی صورت کچھ اس قسم کی ہونی چاہیے۔

کرائے کے لئے خالی نہیں ہے

••• گزرتین بیڈروم کا ایک ہوا دار بنگلہ نما مکان، جس میں نکا ہے اور عین دروازے کے آگے کارپوریشن کا کوڑا ڈالنے کا ڈرم بھی۔ کرایے پر دینا مقصود نہیں ہے۔ ناس کا کرایہ تین سو روپے ماہوار ہے اور نہ چھ ماہ پیشگی کرایہ کی شرط ہے۔ جن صاحبوں کو کرایے کے مکان کی ضرورت ہو وہ فون نمبر 34567 پر رجوع نہ کریں۔ کیوں کہ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔

اطلاع عام

راقم محمد دین ولد فتح دین کریا نہ مرچنٹ یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہے کہ اس کا فرزند رحمت اللہ نہانا فرمان ہے نہ اوباشوں کی صحبت میں رہتا ہے لہذا اسے جائیداد سے عاق کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آئندہ جو صاحب اسے کوئی ادھار وغیرہ دیں گے۔ وہ میری ذمہ داری پر دیں گے۔

ضرورت نہیں ہے

کارمارس مائٹرمائڈل ۱۹۵۹ بہترین کنڈیشن میں۔ ایک بے آواز ریڈیو نہایت خوبصورت کینٹ، ایک ویسپا موٹر سائیکل اور دیگر گھریلو سامان بچکے، پلنگ وغیرہ قسطوں پر یا بغیر قسطوں کے ہمیں درکار نہیں۔ ہمارے ہاں خدا کے فضل سے یہ سب چیزیں پہلے سے موجود ہیں۔ اوقات ملاقات ۳ بجے تا ۸ بجے شام

عدم ضرورت رشتہ

ایک پنجابی نوجوان برسر روزگار آمدنی تقریباً پندرہ سو روپے ماہوار کے لئے باسلیقہ، خوبصورت، شریف خاندان کی تعلیم یافتہ دو شیزہ کے رشتے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ ہے۔ خط و کتابت صیغہ راز میں نہیں رہے گی۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار لڑکے اور لڑکیوں کے لئے رشتے مطلوب نہیں ہیں۔ پوسٹ بکس کراچی۔

داخلہ جاری نہ رکھئے

کراچی کے اکثر کالج آج کل انٹراورڈگری کلاسوں میں داخلہ کے لئے اخباروں میں دھڑا دھڑا اشتہار روئے رہے ہیں۔ یہ سب اپنا وقت اور پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کے ہاں داخل ہونا مقصود نہیں۔ ہم نے کئی سال پہلے ایم اے پاس کر لیا تھا۔

ہم مہمان خصوصی بنے

آج کل کراچی کے کالجوں اور اسکولوں میں مباحثوں اور یوموں کا موسم ہے۔ سکہ بند مہمان خصوصی کو دن میں دو دو درس گاہیں بھگتانی پڑ رہی ہیں۔ صبح کہیں ہے شام کہیں۔ ہمارے ایک بزرگ تو مدرسہ رشیدیہ حنفیہ میں ایلو اور اجنٹا کی تصویروں پر اظہار خیال کر آئے کیونکہ اپنے ساتھ غلطی سے شام والی تقریر لے گئے تھے۔ اس کی تلافی کے لئے اس شام انہیں ماڈرن آرٹ کالج میں حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی اور حدیثوں میں اسامے رجال کی اہمیت پر بولنا پڑا۔ اس شہر میں چالیس پچاس کالج ہوں گے اور سیکنڈری اسکول بھی بہت ہیں۔ لیکن سب ہمارے دیکھتے دیکھتے لوگوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہم بالکل ہی مایوس ہو گئے تھے کہ ایک اسکول والوں کا نوٹ آیا کہ کل ہمارے ہاں جلسہ ہے، مہمان خصوصی آپ ہوں گے۔

”کس قسم کا اسکول ہے آپ کا“ ہم نے پوچھا۔

جواب ملا کہ پرائمری اسکول ہے۔

ہم نے کہا۔ جب اس شہر میں اتنے سارے پرائمری پاس مہمانان خصوصی موجود ہیں تو ہمارا صدارت کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہوگا۔ ہم یوں بھی درویش گوشہ نشین آدمی ہیں، انکسار ہماری طبیعت میں داخل ہے۔ کسی اور کو.....

لیکن ہمارا یہ عذر مسموع نہ ہوا۔

ہم نے بھی اس سے زیادہ عذر اور انکا ر مناسب نہ جانا جتنا کہ کسی مہمان خصوصی پر اخلاقاً واجب ہے تاکہ کسی اور کو نہ بلا لیں۔ لہذا ہتھیار ڈال کر کہا۔ اچھا صاحب۔ آپ لوگ مجبور کرتے ہیں تو حاضر ہو جائیں گے کیونکہ قومی خدمت اور تعلیم کے فروغ کا معاملہ ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

ہم کوئی عادی قسم کے مہمان خصوصی نہیں ہیں۔ ہر کوئی ممتاز حسن ہو بھی نہیں سکتا کہ بحر معنی کا شاعر ہو۔ جدھر چاہے بے تکلف تیرتا نکل جائے۔ ممتاز صاحب میں مروت اس قدر ہے کہ کسی سے انکار نہیں کرتے۔ ان کا سیکرٹری اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا جاتا ہے کہ کس روز کس وقت جلسہ ہے۔ اور وقت

کے وقت یاد دلاتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ بات بھی نوٹ ہونے سے رہ جاتی ہے کہ جلسہ کس کی طرف سے ہے اور کس تقریب میں ہے۔ ممتاز حسن صاحب جب موقع پر پہنچتے ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ انہیں فارابی کے فلسفے کے بارے میں بولنا ہے یا جیمز آف کامرس کے ممبروں سے مشرق وسطے کو کھالوں کی برآمد کے امکانات پر گفتگو کرنی ہے۔ خیام سوسائٹی کی سالگرہ کے سالانہ جلسے کی انہیں پیشگی اطلاع نہ تھی۔ انہیں جلسہ گاہ میں پہنچ کر معلوم ہوا۔ تاہم وہ تین گھنٹے تک اس موضوع پر بولتے رہے کہ خیام کے جو تر جے جاپانی اور آرمینی زبانوں میں ہوئے ہیں، ان میں کیا کیا لغزشیں ہوئیں اسی سلسلے میں انہوں نے نظام الملک طوسی، بابر، کالیداس اور بلھے شاہ کے ہم معنی اشعار بھی سنائے۔ شام کو انہیں ریڈیو پر فن پہلوانی کی تاریخ اور رموز کے موضوع پر لکچر دینا پڑا اور اسی رات کو ٹی وی پر راگ جے جے دنی کا موازنہ بیحدون کی چودھویں سمفنی اور پنجابی کے مقبول گیت، موڑیں بابا ڈانگ والیا، سے کیا۔ اگلے روز ہومیو مینسوں کے سالانہ جلسے کا افتتاح بھی انہوں نے کیا اور صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا۔ بعد میں ہومیو مینسٹی کالج کے پرنسپل نے ہمیں بتایا کہ ممتاز صاحب نے آریکا اور فارمیکا کے جو خواص بتائے ہیں اور ان دواؤں کا رشتہ جوارش جالینوس اور سدھ مکردھوج سے ثابت کیا ہے، وہ ہمارے لئے بالکل نئی معلومات ہیں۔ یہی رائے ہم نے ڈائریکٹر محکمہ زراعت سے سنی جنہیں ممتاز صاحب نے اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا کہ شکر قندی کی فصل کے لئے کون سی کھاد زیادہ مفید رہتی ہے اور قدیم بابل میں میکسی پاک گندم کی کاشت کس طرح کی جاتی تھی۔

ہاں ہم ایسوں کو کچھ نہ کچھ پیشگی تیاری کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہذا جہاں ہم نے قیص کو کلف لگوا یا۔ جوتا پالش کیا۔ سوٹ استری کرایا۔ وہیں ایک تقریر بھی سوچ لی کہ تعلیمی کاموں کے لئے ہم گلے گلے حاضر ہیں اور پرائمری تعلیم سے ہمیں ہر دانی دلچسپی بلکہ ایک زمانے میں تو پرائمری کلاسوں کے طالب علم بھی رہ چکے ہیں۔ اور یہ کہ آج کل کے بچوں کو ہماری تھلید کرنی چاہیے۔ یعنی خدمت قوم کا جذبہ اپنے میں پیدا کرنا چاہیے اور ایثار سیکھنا چاہیے اور اچھی اچھی باتیں کرنی چاہئیں اور بُری بُری باتیں چھوڑ دینا چاہئیں۔ تاکہ ہمارا بیٹا پاکستان ترقی کرے وغیرہ۔ اتفاق سے ہمیں اپنی اس تقریر کا مسودہ مل گیا جو ہم نے پارسال ہاکرز کنونشن میں کی تھی اور ذرا سی ترمیم کر کے لائبریری ایسوسی ایشن کے جلسے میں بھی استعمال کر چکے تھے۔ یہ اس موقع کے لئے بھی بر محل نظر آئی کیونکہ قومی خدمت اور تہذیب اخلاق وغیرہ کوئی ہاکرڈ اور لائبریریئن حضرات کا اجارہ تھوڑا ہی ہیں۔ یہ بات طالب علموں میں بھی پیدا ہو جائے ہرج کی بات نہیں۔

مطالعے کی وسعت اور علم کی گہرائی بڑی اچھی چیزیں ہیں۔ لیکن ایک قباحت کا پہلو بھی ان میں ہے۔ ہماری ہی مثال لیجئے۔ اتنے بہت سارے خیالات اور نکات ایک ساتھ ہمارے ذہن میں ہجوم کر آتے ہیں کہ ان کے سمجھنے سے بن جاتے ہیں اور طلق میں اٹک جاتے ہیں۔ ادب، فلسفہ، طب، تاریخ، جغرافیہ، کسی کو نظر انداز کرنے کو جی نہیں چاہتا اور پھر وہ تمام اشعار بھی موقع بہ موقع استعمال کرنے ہوتے ہیں جو ایک سلب پر لکھے ہماری جیب میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس فالٹو وقت ہو تو ان کو چھانٹ کر قرینے سے ترتیب بھی دیں۔ لیکن جلسے کرنے والوں کو عموماً جلدی ہوتی ہے۔ دریوں اور تہوؤں والے تیار کھڑے رہتے ہیں کہ جب جلسہ ختم ہو، کب سامان ریڑھے پر لاد دیں۔ ادھر چائے ٹھنڈی ہو رہی ہوتی ہے اور بعض لوگ جن کو اپنے اعصاب پر قابو نہیں ہوتا، اپنی جمائیوں کو بھی مزید نہیں روک پاتے۔ سو اس آپادھانی کے عالم میں ہم باتیں تو ساری کہہ گزرتے ہیں اور شعر بھی قریب قریب سارے استعمال کر لیتے ہیں لیکن اتنی میں دیکھ ممکن نہیں ہوتی کہ مختلف مسائل کا آپس میں جوڑ ملائیں یا اشعار اور موضوع کا ربط دیکھیں۔ سامعین میں سے سمجھنے والے خود ہی اندازہ کر لیتے ہیں کہ کون سا شعر دراصل کون سے مضمون سے متعلق سمجھنا چاہیے اور جو مسائل بیان کئے گئے ہیں ان کی اصل ترتیب کیا ہے۔ لیکن سبھی لوگ تو ایسے نکتہ شناس نہیں ہوتے۔ سطحی مذاق کے سامعین اگر ہماری تقریر کو بے ربط اور اُبھی ہوئی خیال کریں تو ہمارے نزدیک قابل معافی ہیں۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

اگر معاملہ کالج یا یونیورسٹی کا ہوتا تو ہم بہت سے مباحث چھوڑ جاتے۔ یہ فرض کر لیتے کہ ان عزیز طالب علموں کو یہ باتیں پہلے سے معلوم ہیں۔ لیکن پرائمری کے بچوں کو ہر چیز قدرے تفصیل سے سمجھانی چاہیے اور یہی ہم نے کیا۔ کون نہیں جانتا کہ آج کل ہمارا سب سے بڑا مسئلہ افراط زر ہے اور زرمبادلہ کی کمی ہے۔ ہمیں اپنی برآمدی تجارت کو بڑھانا چاہیے۔ قدر مناسب سے پہلے ہم نے موزوں الفاظ میں اس مسئلے کا ذکر کیا اور کسی شاعر کے اس شعر پر بات ختم کی۔

اقبال تیرے عشق نے سب بل دئے نکال

مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

امابعد جنوبی افریقہ کی سیاست اور قبرص کے قصبے اور موسیقی کے باب میں حضرت امیر خسرو کی خدمات اور ابن رشد کے فلسفے اور سیم تھور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اسی میں ہمارے سفر یورپ کے کچھ تاثرات بھی آگئے۔ اور خلفائے راشدہ کے عہد کی تعریف بھی۔ ایسی تقریریں بالعموم خشک ہوتی ہیں لہذا ہم ساتھ ساتھ پانی بھی پیتے گئے اور یہ شعر پڑھ کر جو اس وقت یاد نہیں کس کا ہے ان مسائل

کو بھی سمیٹا:-

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی تھی

یہاں سے گریز کر کے ہم ان مسائل ضروری کی طرف آئے جن کا ذکر اوپر کیا ہے، خدمت خلق، استبازی، ایثار کی ضرورت وغیرہ۔ ہم اور بھی بولتے اگر سیکرٹری صاحب چٹ نہ بھیج دیتے کہ آج کی حد تک یہی کافی ہے۔ اب آپ تھک گئے ہوں گے۔ آخر ہم خدائے بخشن، لسان العصر، فردوسی اسلام، استاد ذوق رحمۃ اللہ علیہ کے اس مصرع پر بات ختم کر کے بیٹھ گئے۔

جو ہو ذوق یقین پیدا
تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اس تقریر پر بہت جگہ تالیاں بٹیں۔ اکثر تو ہمیں بے موقع بھی معلوم ہوئیں۔ کچھ طالب علموں نے منہ میں انگلیاں دے کر سیٹیاں بجائیں جیسی سینماؤں میں معیاری اور سنجیدہ فلموں پر اظہار پسندیدگی کے لئے بجائی جاتی ہیں۔ بعضوں نے بچ بجائے اور فرش پر پاؤں سے مسلسل تھاپ دی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس میں ہماری کچھ خوبی نہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ قبول سخن خداداد چیز ہے۔

ہم نے اپنی تقریر میں جو در استبازی کی خوبیوں پر دیا تھا، اس کا اثر تو فوراً ظاہر ہوا۔ سیکرٹری صاحب نے آخر میں شکریہ کی تقریر کی تو اس میں حاضرین کو بتایا کہ اصل میں صدارت کے لئے ہم نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو بلایا تھا چنانچہ اعلان اور دعوت ناموں میں انہی کا نام ہے۔ لیکن ایک دن پہلے انہوں نے انکار کر دیا۔ ہم نے کچھ اور لوگوں سے رجوع کیا۔ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ عذر کیا۔ آخر انشاء اللہ خاں انشاء صاحب مل گئے۔ ان کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ ان کی غزلیں اسکولوں کے نصابوں میں داخل ہیں۔ کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں وغیرہ۔

اس موقع پر ایک صاحب لپک کر آئے اور ان کے کان میں سرگوشی کی کہ ارے انشاء اللہ خاں انشاء کو مرے تو بہت دن ہوئے۔ یہ آج کل کے ادیب ہیں۔ ابھی زندہ ہیں۔ سیکرٹری صاحب سے غلطی تو ہوگئی تھی لیکن انہوں نے کھنکار کر صورت حال کو بڑی خوبصورتی سے سنجال لیا۔ فرمایا: ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے مہمان گرامی کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ آج کل کے ادیب ہیں اور ابھی زندہ ہیں۔ انہوں نے بہت سے ناول لکھے ہیں۔ ذرا سے لکھے ہیں جو گھر گھر میں پڑھے جاتے ہیں۔ بہر حال ڈپٹی کمشنر صاحب کے نہ آنے کا ہمیں افسوس ہے۔ اور آپ کا (یہاں رک کر

انہوں نے ایک صاحب سے ہمارا صحیح نام پوچھا (یعنی ابن انشاء صاحب کا ہم شکر یہ ادا کرتے ہیں کہ باوجود اپنی مصروفیات کے یہاں تشریف لائے۔ حاضرین سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ صدارتی تقریر کی وجہ سے جلسہ ذرا طویل ہو گیا اور انہیں سواری حاصل کرنے میں ذرا دقت ہوگی۔ بہر حال اب جلسہ ختم ہے۔ شکریہ۔ خدا حافظ۔“

ایک زمانہ تھا کہ معاشرے میں شاعر ادیب کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ پھرتے تھے میر خوار کوئی پوچھتا نہ تھا۔ غالب جیسے بھی ڈپٹی کمشنروں کی شان میں قصیدے لکھتے اور ان کے دربار میں کرسی پانے پر فخر کرتے مر گئے۔ بارے اب ان کے بھاگ کھلے اور یہ ڈپٹی کمشنروں کے نعم البدل قرار پائے۔ پرانا زمانہ ہوتا تو ڈپٹی کمشنر کے انکار کرنے پر تحصیلدار صاحب کو تکلیف دی جاتی۔ وہ نہ ملتے تو تھانیدار صاحب مل جاتے اور بی ڈی کے چیئرمین تو کہیں گئے نہیں۔ ان سب کو نظر انداز کر کے کسی خالی خولی ادیب کو بلانا اور کرسی صدارت پر بٹھانا ایک بڑی بات ہے۔ اب بھی کوئی کہتا پھرے کہ ہمارے ہاں علم یا اہل علم کی قدر نہیں تو حیف ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب ڈپٹی کمشنر کی جگہ شاعر ادیب استعمال ہو سکتا ہے تو اس بات کی راہ بھی کھل گئی ہے کہ ہم کسی مشاعرے میں نہ جاسکیں تو جلسے والے کسی ڈپٹی کمشنر سے غزل پڑھوا لیں۔ ہمارے لئے تو غزل وزل کہنا مشکل بھی ہے۔ ان لوگوں کے لئے مشکل بھی نہیں۔ اپنے پی اے یا کسی ماتحت افسر سے کہہ دیا کہ ڈرافٹ پیش کرو اور ہمارے تخلص ڈال دینا، ہم دستخط کر دیں گے اور ہاں الفاظ مشکل نہ ہوں اور ذرا خوشخط لکھی ہوئی ہوں۔“

ہم پھر مہمان خصوصی بنے

مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاسکتا۔ دوسری بار ڈسے جانے کے خواہشمند کو کوئی دوسرا سوراخ ڈھونڈنا چاہیے۔ خود کو مہمان خصوصی بننے ہم نے ایک بار دیکھا تھا۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس تھی۔ اب ہم ہر روز بالوں میں کنگھا کر کے اور ٹانگی لگا کر بیٹھنے لگے کہ ہے کوئی اندھا محتاج جو دے حتیٰ کو دعوت نامہ۔ بلائے اسے صدارت کے لئے۔ اپنے دوستوں سے بھی باتوں باتوں میں ہم نے بہت کہا کہ آج کل ہم خالی ہیں اور خدمت قوم کے لئے تن من و دھن حاضر ہے۔ کوئی یونیورسٹی یا کالج یا اسکول ہماری ذات ستودہ صفات سے اپنے جلسے کی رونق بڑھانا چاہے تو ہم بخوشی اس کے لئے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالیں گے۔ بارے ایک جگہ سے دعوت نامہ آیا۔ اسپونٹنک انگلش اسکول گولیمار کے پرنسپل صاحب نے ہم سے استدعا کی کہ آپ ہمارے ہاں مہمان خصوصی بن کر آئیں اور اسکول کو اپنی جیب خاص سے کم از کم پانچ سو روپے عطیہ دیں تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔ ہم نے کہا۔ ہم ہیں تو بہت مصروف لیکن آپ کی خاطر آجائیں گے اور پانچ سو روپے تو خیر زیادہ ہیں دو سو روپے اسکول کو دیں گے تاکہ ہمارے ملک میں تعلیم کو ترقی ہو۔ ہم ایسے نیک کاموں کی سرپرستی نہ کریں گے تو اور کون کرے گا؟ ایسا لگتا ہے کہ ان صاحبوں کو اس سے زیادہ عطیہ دینے والا کوئی اور نہ ملا لہذا معاملہ پٹ گیا اور ہم نے اپنی شیر وانی ڈرائی کلین ہونے کے لئے بھجوا دی۔

اسپونٹنک اپنی جگہ اور انگلش اپنی جگہ، لیکن نام کے اس مطہراق کے باوجود تھا یہ بھی پرائمری اسکول اور ہم یہ سوچ کر کچھ آزرده سے ہو گئے کہ یہی رفتار رہی یعنی ہماری زندگی کے یہ دن پرائمری اسکولوں سے خطاب کرتے گزر گئے تو یونیورسٹی کنوینشن سے خطاب کی نوبت کس عمر میں آئے گی۔ ابھی تو بہت مرحلے درمیان میں تھے۔ لوئر سینڈری اسکول، ہائر سینڈری اسکول۔ انٹر کالج، ڈگری کالج اور نہ جانے کیا کیا۔ خیر پچاس روپے اسکول والوں کو ایڈوائس دیکر ہم نے بات چکی کی اور کہا۔ گولیمار تو بڑی پیچیدہ سی جگہ ہے۔ کوئی لینے آئے گا؟

جواب ملا کہ لینے تو کوئی نہیں آئے گا۔ آپ دونوں کی بس میں پاپوش نگر سے بیٹھیے اور گولی مار

۳ پر اترے۔ سامنے جس گلی کی کڑ پر آپ کو ”اپنڈیٹ میئر کنگ سیلون“ ”بے ضرر ختنہ کا بہترین مرکز“ کا بورڈ نظر آئے اس میں سے نکل کر بائیں ہاتھ چوتھا موڑ آپ مڑیں گے تو آپ کو شامیانہ تہا ہوا ملے گا لیکن ساڑھے نو بجے آپ کا پہنچ جانا ضروری ہے کیونکہ گیارہ بجے خیموں اور کرسیوں والے اپنا سامان لینے آجائیں گے۔ ہم نے کرایہ گیارہ بجے تک کا دیا ہے۔ اس کے بعد یہ چیزیں ایک شادی والے کے گھر چلی جائیں گی۔

ہم نے کہا مضائقہ نہیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ شادی والے گھر چلے جائیں گے۔ آیا بود کہ گوشہ چشمے بمانند۔

ملانصر الدین کو لوگوں نے دیکھا کہ ریگستان میں جا بجا کھدائی کرتے پریشان پھر رہے ہیں۔ ایک صاحب نے ماجرا پوچھا تو معلوم ہوا ایک جگہ انہوں نے کچھ روپے داب دیئے تھے اور نشانی یہ رکھی تھی کہ اس وقت اس جگہ کے عین اوپر ابر کا ایک ٹکڑا تھا۔ جو اب کہیں دکھائی نہیں دیر ہاتھا۔ شادیوں، میاہوں، تولیوں، مشاعروں، یوموں، جشنوں اور تقریری مقابلوں کی ریل پیل کے دنوں میں خیمے چھو لدا ری کی نشانی سے کسی جگہ کو پانا کچھ ایسی ہی بات تھی لیکن خیر۔ ہم اپنڈیٹ میئر کنگ سیلون کی گلی میں مڑ کر بائیں ہاتھ دیکھنے لگے حتیٰ کہ دو ایک شامیانہ نظر آیا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ در یوں پر کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ ایک طرف کرسیوں پر کچھ بزرگ بیٹھے ہیں جو ان کے والدین ہوں گے۔ لیکن ہمارے میزبان صاحبان کا کہیں پتہ نہیں۔ خیر ہم بھی ایک طرف کو بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں کچھ اور لوگ آگئے اور اب ایک صاحب نے آکر مودبانہ ہم سے پوچھا کہ آپ لڑکے والوں کی طرف سے ہیں نہ؟ باقی بارات کہاں ہے؟ ہم نے کہا مذاق بند کرو۔ ہمیں یہاں تقریر کر کے اور بھی کئی جگہ صدارتیں کرنی ہیں۔ بس اب کاروائی شروع ہو۔ کہاں ہے کرسی صدارت؟... تھوڑی سی مزید اور قدرے تکلیف دہ گفتگو کے بعد پتہ چلا کہ ہمیں اس سے اگلی گلی میں جانا چاہیے تھا۔ وہاں ہم خوب وقت پر پہنچے۔ اعلان ہو رہا تھا کہ آج کل اچھے اچھے لوگ غیر ذمہ داری برتتے ہیں۔ وعدہ کر کے تشریف نہیں لاتے۔ ہمارے آج کے مہمان بھی ایسے ہی نکلے۔ خیر اب میں بی ڈی ممبر تاج الدین تاج سے درخواست کرتا ہوں کہ ان کی جگہ.....

لیکن ہم نے بخش نفیس نمودار ہو کر تاج صاحب کی صدارت میں اسی طرح کھنڈت ڈال دی جس طرح ہماری فلموں میں کوئی بزرگ عین نکاح کے وقت پہنچ کر ساری کاروائی روک دیتے ہیں ”ٹھہرو

یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

اس کے بعد جو کاروائی ہوئی اس میں سے ہمیں فقط اتنا یاد ہے کہ عبدالعزیز جماعت اول نے ہمیں ہار پہنایا۔ دوسری جماعت کے بچوں نے انگریزی میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ جماعت سوم کی ایک بچی نے ایک فصیح و بلیغ تقریر پڑھی۔ جو اس کے والدین کی لیاقت، وسعت مطالعہ اور زبان پر غیر معمولی قدرت کا ثبوت تھی۔ اس کے بعد چوتھی جماعت کے ایک طالب علم نے، ہم مرد مجاہد ہیں، کا ترانہ گاتے ہوئے جوش میں آکر اپنی تلواریں ہم پر وار کیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ایسے موقع پر تلواریں گتے کی استعمال کی جاتی ہیں۔ بعد ازاں ہم نے کھنکار کر اپنا صد ارتقی خطبہ شروع کیا ہی تھا۔ ”خواتین و حضرات۔ اور پیارے بچو.... کہ پیچھے سے ایک صاحب نے آ کے ہمارے نیچے سے کرسی کھینچ لی اور کہا۔ حضور گیارہ بج گئے۔ اب یہ سامان کہیں اور لے جانا ہے۔ ظالموں نے ہمیں حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کرنے کی بھی مہلت نہ دی۔ خیر اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ اس وقت حاضرین تھے کہاں۔ انہوں نے شامیانے کے کھونٹے اکھڑتے دیکھ لئے تھے اور زائل پیشتر کہ شامیانہ ان پر آن گرنا۔ غیر حاضرین بن چکے تھے۔

چند اشتہار

پچھلے دنوں کے قومی ابتلا میں جس سے جو کچھ ہوسکا، اس نے دیا۔ کسی نے پیسے دیئے، کسی نے کپڑے دیئے۔ کسی نے مشورے دیئے کہ اپنی جگہ ان کی بھی بڑی قیمت ہے۔ جس کو لکھنا آتا ہے ان میں سے کسی نے چیک لکھا، کسی نے تعویذ لکھا، کسی نے ہماری طرح کالم لکھا، یا حاجی کشمیر والا کی طرح اشتہار لکھا اور زیور طبع سے آراستہ کرادیا۔ ان دنوں ہماری ڈاک میں سے طرح طرح کے کتابچے، پمفلٹ، اشتہار برآمد ہوئے۔ جن میں جنگ جیتنے کے طریقے بتائے گئے تھے۔ کچھ نظم میں کچھ نثر میں کچھ ادب لطیف میں جو صورت میں نثر اور سیرت میں نظم ہوتی ہے۔ لکھنے والوں میں عابد بھی تھے، زاہد بھی تھے، ہشیار بھی تھے، خاندانی حکیم اور ڈاکٹر بھی تھے اور مایوس العلا بھی تھے۔

قوم کا درد رکھنے والوں میں دو طرح کے لوگ ہم نے پائے۔ ایک جو آپ کو ملت میں بری طرح یعنی پوری طرح گم کر دیتے ہیں۔ اپنی ہستی کو منادیتے ہیں۔ موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں، کے قائل ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اپنی خودی کو اسی طرح قائم رکھتے ہیں جیسے دال میں کوکڑو۔ کباب میں ہڈی وغیرہ۔ اس وقت ہمارے سامنے چار صفحے کا ایک ٹریکٹ ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ ”اے عظیم قوم آفریں“۔ اس کے تین صفحات تو لکھنے والے نے جو ایک ہو میوڈا کٹر ہے، قوم کی نذر کئے ہیں۔ چوتھے پر کچھ اپنا خیال بھی رکھا ہے کیونکہ قوم آخر افراد ہی سے بنتی ہے۔ افراد نہ ہوں گے تو قوم کہاں سے آئے گی۔ پہلے تین صفحات کا مضمون وہی ہے جس سے آپ آشنا ہیں۔ اس میں

بھنور سے لڑو تند لہروں سے الجھو
نہیں شان مومن کنارے کنارے

وغیرہ قابل قدر اور ولولہ انگیز اشعار بھی ہیں اور ہمارے شاندار ماضی سے مثالیں بھی۔ تیسرے صفحے تک پہنچتے پہنچتے لکھنے والا (ہومیوڈا کٹر جرنلشن نمبر ۲۳۲۸) دشمنوں کو لکارا اور مومنوں کو پکارتا اس قسم کے اشعار پڑا گیا ہے۔

اے اہل ہند خوف سے تھراؤ ہمارے

ہم جوش میں آکر نہ کہیں خون بہا دیں

بے شک ان اشعار میں وزن نہیں ہے اور اگر ہے تو کم ہے لیکن جنگ کے دنوں میں تو ریلوے والے تک ٹریول لائٹ یعنی کم وزن والے کو سفر کرنے کی ہدایت کرنے لگتے ہیں۔ یہ تو پھر

شاعری ہے۔

چوتھے صفحے کی شان البتہ الگ ہے۔ اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔ قبلہ ہم یو ڈاکٹر صاحب نے چوتھا صفحہ شروع تو ”عزیز ہم وطنوں“ کی سرفنی ہی سے کیا ہے اور آغاز میں فرمایا ہے کہ اس ہنگامی دور کا تقاضا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی جگہ دشمن کے لئے ناقابلِ تسخیر مورچہ بن جائے لیکن اس کے بعد مطلب کی طرف گریز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”ہمیں دشمن سے مقابلے کے لئے اپنی قوم میں زیادہ سے زیادہ صحتمند افراد کی ضرورت ہے۔ آپ کو کیا بیماری ہے اور کب سے ہے؟ آپ اپنی پہلی فرصت میں خاکسار کے الحمد شفا خانہ (شہر کا نام ہم نہیں لکھتے) سے علاج کرا کر تندرست ہو جائیے۔“

یعنی جو بات محمود غزنوی، غوری اور ابدالی کے حوالوں سے شروع ہوئی تھی۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب قبلہ کی ذات والا صفات پر آ کر ختم ہوئی۔

ہمارے لئے یہ اشتہار مصرع طرح کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ خالی ڈاکٹر صاحب موصوف ہو نہیں ہماری قوم میں درد دل رکھنے والے اور بھی لوگ موجود ہیں۔ درد دل سے ہماری مراد اس درد سے نہیں جس کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کے الحمد شفا خانے سے رجوع کرنے کی ضرورت پڑے بلکہ مراد جذبے سے ہے تو بس لیجئے اب یہ پانی چلا۔

(۱) ”میرے عزیز ہم وطنو۔ ہم اتنے سال سے آپ کو لاکار لاکار کر اپنے کینہ و رھسائے کے عزائم سے آگاہ کرتے رہے ہیں اور فلاح کا راستہ دکھاتے رہے ہیں۔ لیکن آپ لہو و لعب میں پڑے رہے، کبھی ادھر توجہ نہ کی۔ اب تو آپ کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔ اگر نہ کھلی ہوں تو ہمارے ہاں سے سرمہ نور چشم رجسٹرڈ منگا کر استعمال کرنا شروع کرو دیجئے۔ دھند، ککڑے، سفید موتیا، کم نظری، بد نظری، آشوب چشم، آشوب زمانہ وغیرہ کا شرطیہ علاج ہے۔ مسلسل استعمال سے عینک بھی چھوٹ جاتی ہے بشرطیکہ لگی ہوئی ہو۔ قیمت چھوٹی شیشی پانچ روپے بڑی شیشی نو روپے، محصول ڈاک معاف۔“

(۲) شریعتی اندر گاندھی نے پاکستان پر زیادتی کرنے کا جو الزام لگایا ہے اسے سن کر ہمیں بے اختیار نفی آئی۔ شریعتی جی خود آپ کا دامن جارحیت کے دھبوں سے آلودہ اور داغدار ہے۔ پہلے اس کی طرف توجہ دیجئے۔ یہاں بسبیل تذکرہ ہم عرض کر دیں کہ جارحیت کے تو خیر نہیں، باقی ہر طرح کے داغ و دھبے پان کے اچار کے سیاہی کے ہماری دلکش لائٹری بڑا میدان ناظم آباد میں گارنی سے دور کئے جاتے ہیں۔

ڈرائی کلیننگ کے علاوہ سوئی کپڑوں کی بکفایت دھلائی کا بھی معقول انتظام ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ ۲۲ گھنٹے میں واپسی پانچ روپے کے داؤچہ پر ڈائری مفت۔

(۳) شری سورن سنگھ جی جنگ میں پہل کرنے کا الزام پاکستان کو دیتے ہیں۔ اس کا سلسلہ تارکین وطن سے ملاتے ہیں۔ یہ محض مویشی گانی ہے اور اس مویشی گانی کی حقیقت ہم سے بہتر کے معلوم ہوگی۔ ہمارا خاندانی ہیر کٹنگ سیون قیام پاکستان سے پہلے سہارنپور میں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر چکا تھا۔ یہاں بھی خلیفہ امام الدین مضطر کی سرپرستی میں جو ایک خوشگوشاعر بھی ہیں اور بے ضرر ختنے کے ماہر بھی، یہ خوش اسلوبی سے اپنے سرپرستوں کی خدمت کر رہا ہے۔ شیو ہیر کٹنگ اور شیمپو کے دام مناسب لئے جاتے ہیں اور حمام کا بھی انتظام ہے۔

(۴) شکست و فتح تو قسمت سے ہے وے الے میر۔ بھارت کو اپنی کامیابی پر اتنا بھی نہ اترانا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ اسے مسلمانوں کے ہاتھوں کھیم کرن میں جوتے پڑ چکے ہیں اور چند صدیاں پہلے پانی پت کے میدان میں جوتے پڑ چکے ہیں۔ خوبصورت جو تا انسان کی شخصیت کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے اور سستے اور پائیدار جوتوں کے رسیا ہمیشہ ہماری دکان قومی شواسٹور سے رجوع کرتے ہیں، زنانہ مردانہ طفلانہ ہر طرح کا مال موجود ہے۔ آزمائش شرط ہے۔

شادیاں بھی سلیس

کچھ ہماری زندگی اور تہذیب کا ٹریڈ مارک ہے۔ سبیل ہے، ہماری کوئی بات کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ ہمیں لچھے دار زبان بولنے کا شوق ہے۔ لچھے دار عبارتیں لکھنے کا شوق ہے اور لچھے دار تقریریں کرنے کا شوق ہے۔ لچھی کو بھی لچھے ہی میں شامل سمجھئے۔ بحوالہ ایک پنجابی شاعر کے۔

اگے تیرے بھاگ لچھیے

غالب روایت شکن آدمی تھے اور اردو نثر کو سلیس بلکہ پانی کر گئے ہیں لیکن القاب و آداب میں کبھی کبھی جمیل المناقب، عمیم الاحسان وغیرہ کے لچھے وہ بھی چھوڑ دیتے تھے۔ اس زمانے کے حساب سے یہ کچھ بھی نہ تھا کیونکہ اس عہد کی ایک کتاب پرتو، مصنف کا نام یوں لکھا دیکھتے ہیں:

”تاثر عدیم النظیر و ناظم فقید المثال، بذلہ سنج نازک خیال، جلا بخش اردو زبان، اعجاز بیان جناب مرزا رجب علی بیگ سرور“

ایک حامی کے لئے اس طومار میں سے نام کی سوئی تلاش کرنا اور اس طرہ پر چیخ و خم نکالنا ایسا آسان کام نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اصل نام جلا بخش نہیں۔ جب مولا بخش اور خدا بخش اور پیر بخش نام ہو سکتے ہیں تو جلا بخش کیوں نہیں۔ عدیم النظیر اور فقید المثال بھی بھلے مانسوں کے نام لگتے ہیں۔ لیکن فی الحال اس لچھے کی گریہوں میں بے صرفہ۔ رجب علی بڑا مد ہوتا ہے۔ سرور بھی تخلص یعنی مصنف کی اپنی ایجاد ہے۔ کیا عجب رجب علی بھی بچپن میں فقط رجب ہی کہلاتے ہوں۔ بڑا ہو کر یہ پرسا پرس رام بنا ہو۔

اب عبارت آرائی کتابوں اور قصوں کہانیوں میں تو متردک ہوئی۔ یہ کاروباری زمانہ ہے۔ لوگوں کے پاس دماغ سوزی اور کا کا و کی فرصت کم ہے۔ آداب و تسلیم کا خلاصہ نکل کر ”ہوا“ ہو گیا ہے۔ لوگ آپ سے تم تم سے تو ہی نہیں ابے تے پر اتر آئے ہیں۔ اشفاق کے کاغذوں اور شادی بیاہ کے رقعوں میں البتہ ابھی پرانی شان قائم ہے۔ شادی کے رقعوں میں بیٹی ابھی تک نور چشمی ہے۔ اگر دختر ہے تو نیک اختر ضرور ہے۔ فرزند ہے تو دلہندی کے رشتے میں بندھا ہے۔ باپ احقر اور چشم براہ ہے۔ آج

کل کے نئے پڑھے لکھے تو احقر کو بھی نام سمجھتے ہیں اور نیک اختر جو دیے دختر کا تابع مہمل یا غیر مہمل ہے صاف کسی لڑکی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ اردو میں ابھی اس قسم کے سیدھے سیدھے قعوں کا رواج نہیں ہوا کہ ”اے صاحب فلاں تاریخ، فلاں وقت میری بیٹی کی شادی ہے۔ آئیے اور نیوٹہ دیجئے۔ تحفہ دیجئے اور خالی ہاتھ لٹکا تے ہوئے مت آئیے۔ ہم نے تمہو شامیانے کا سخت انتظام کیا ہے۔ دیکھیں کچی ہیں۔ گوشت روٹی کھا کر جائیے۔ کیونکہ آپ نے ہمیں بھی کھلائی تھی وغیرہ۔ پنجاب والے ہمیشہ دوسروں سے مستحکم سرگشتہ غمار سوم و قیود رہے ہیں۔ ایک پرچے نے کسی صاحب کی شادی کے کارڈ کا مضمون نقل کیا ہے۔ جو راوی اور چناب ہی نہیں بیاس کے پانی میں بھی دھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یوں کہیے ابھی پوری طرح نچوڑا بھی نہیں گیا۔ نقل مطابق اصل

”چچے سجنوں تے مترو۔ شالائیں رب دیاں رحمتاں تلے پھلو تے پھلو۔

ساڈے لاڈلے پتر..... داویاہ لاڈلی دھی..... دے نال..... ہونا ایں۔ سیں وی خوشیاں وچ رل کے تے دعاواں دی سانجھ پاکے ساڈا مان تے پت دودھاؤ۔

آیاں اگے اکھیاں وچھان والے
 اما بعد۔ ”ویلے دی ونڈ“ یعنی تقسیم الاوقات یا نانم ٹیمبل کے عنوان تلے درج ہے۔

سہرے دیاں لڑیاں سجان داویلا.....

جج دے نرن داویلا (روانگی برات)

لاڈے ولوں ان پانی.....

اس آخری جیلے کا مطلب ہے دلہا کی طرف سے داناد نکایا آب ودانہ۔ مطلب ولیمہ۔ تھوڑی بہت پنجابی تو اپنی مادری زبان ہونے کی وجہ سے ہمیں بھی آتی ہے۔ لیکن گیانیوں والی نہیں اور ویلے دی ونڈ تو ہم نے آج ہی سنا۔ اسے ایجاد بندہ بلکہ گندہ کہتے ہیں۔ سجنوں تے مترو۔ مان تے پت (مان تے پت نہیں) وغیرہ پڑھ کر تو مذکورہ پرچے کے ایڈیٹر کی طرح ہمیں بھی دربار صاحب امرتسر ہی یاد آیا۔

اردو میں بھی دعوت ناموں کو سلیس بنانے کا ایک تجربہ کیا گیا ہے جو ہمیں پسند آیا۔ آج کل نظام امتحان بھی بدل گیا ہے۔ ہمارے زمانے کا سانہیں کہ لمبے لمبے جواب مضمون لکھنے پڑتے تھے۔ گزرے ہوئے بادشاہوں کی پالیسی بتانے کے علاوہ ان کی چال چلن کا شوقیت بھی دینا پڑتا تھا۔ یہ سوال وجواب کا زمانہ ہے۔ اسی سے لیاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بار نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو مار مار کر کیا نکال دیا تھا؟ اگر آپ جواب میں فقط بھرکس“ لکھ دیں تو آپ شاندار نمبروں

سے پاس ہیں۔ نادر شاہ کو دیکھ کر محمد شاہ کی کیا بندھ گئی تھی؟... گھگی۔ صبح جواب ہے شاباش۔ بیٹھ جاؤ۔
 یحییٰ خاں نے قوم کو کیا بنایا؟۔ الو اس کی بجائے کبوتر یا طوطا یا کسی اور جانور کا نام لکھنا غلط ہوگا۔ آپ کے
 نمبر کٹ جائیں گے۔ ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔

خیر ذکر دعوت نامے کا تھا اور دعوت نامہ ہمارے ایک بہت عزیز دوست کی شادی اور لاڑے
 دلوں ان پانی یعنی ویسے کا ہے۔ چونکہ یہ دن عید کے تھے اس لئے ہر کارڈ جو آتا تھا لوگ اسے عید کارڈ سمجھ
 کر ایک طرف ڈال دیتے تھے یا بچوں کو دے دیتے تھے۔ اس لئے ابتدا اسی اصلاح سے کی گئی ہے کہ یہ
 کارڈ کیا ہے۔ کس کا ہے اور کیوں ہے اور یہ تقریب کہاں ہے۔ کس طرف کو ہے۔ کدھر ہے اب مضمون
 ملاحظہ ہو۔

تقریب: شادی

کس کی: (نام)

کس کے ساتھ: (نام)

کہاں: آرڈیننس روڈ۔ راولپنڈی

ولیمہ: (تاریخ)

ولیمہ کہاں: (جگہ)

وقت: ۸ بجے شب

بظاہر اتنی عبارت کافی تھی۔ لیکن بعض کند فہن اردو دعوتیں شاید یہ سمجھتے کہ ہمیں تقریباً اطلاع

دی گئی ہے۔ لہذا۔۔۔ آخری خانہ ہے:

توقع: محشگی کی داوا پانے کی۔

لیجئے ہم غالب کی رو میں بہ چلے۔ صحیح اندراج یوں ہے:

توقع: آپ کی شرکت۔

دولہا میاں کے والد جن کا نام اس رقعے کے نیچے الداعی یا المعلن کے طور پر درج ہے۔
 ہمارے ملک کے ایک مشہور عالم دین ہیں۔ دولہا التبتہ بھی ایسے شوق فضول کے مالک ہیں۔ یعنی شاعر
 واعر۔ ادیب و دیب۔ لازماً یہ رقعہ ہمارے ان دوست نے خود لکھا ہے۔ آج کل سبھی بر خوردار یہی کرتے
 ہیں۔ بزرگوں کے علم و فضل کو طعنے لگاتے ہیں۔ انہوں نے تو لگایا۔ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم ان

بزرگ واجب الاحترام کا نام نہیں لکھتے۔ دولہا میاں کا بھی نہیں۔ تیرے پتے سے خلق کو کیوں میرا گھر ملے دوسری وجہ احتیاط یہ ہے کہ رقعہ اخبار میں دیکھ کر اور تاریخ و مقام کی اطلاع پا کر لوگ جوق در جوق ویسے میں نہ پہنچ جائیں اور ان مروت کے ماروں پر وہ نہ گزرے جو مولوی عبدالحق مرحوم کے ہاتھوں ان کے ایک دوست پر گزری تھی۔

راوی اس کے مولوی صاحب خود ہیں۔ مذاق اور معصوم شرارت کا مادہ ان میں ہمیشہ سے تھا۔ ایک روز ان کو ایک دوست کی طرف سے جن کی تجزی بد رجبہ بخلی مشہور تھی، دعوت کا رقعہ ملا۔ انہوں نے اسے پر لیں بھیج کر ایسے ہی دوسرے قے اور چھپوائے اور اپنے جاننے والوں میں تقسیم کرادیے۔ جن کو پہنچے ان میں اکثر کی میزبان سے فقط اوپری دعا سلام یا صورت شناسی تھی۔ اس بات پر حیرت کرتے کہ اتنی معمولی معرفت کے باوجود ہمیں یاد فرمایا بلکہ میزبان کے کریمانہ اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے ٹوٹی شیروائی والے بزرگوں کا ایک جم غفیر قے جیب میں ڈال کر چھڑی ٹیکتا ان حضرت کے مشکوئے مغلیہ بلکہ کلب احزاں کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دروازے پر کھڑے استقبال کر رہے تھے۔ ایک ایک صورت کو دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ یا الہی یہ کون؟ کدھر سے آگئے؟ کس نے ان کو بلایا۔ میں نے تو نہیں بلایا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور جب گنتی ناخواندہ مہمانوں کی پچاس سے گزری تو سر پیٹ لیا۔ اندر بھاگے۔ کچھ اپنی دیگوں میں پانی ڈلوایا اور سالن کا شور بہ بنایا۔ کچھ کھانا ہوٹلوں سے منگایا۔ آپ کھایا یا نہ کھایا۔ ناخواندہ مہمانوں کو پرچایا۔

ایک اور صاحب کا ذکر مولوی صاحب کی زبانی سنا۔ انہوں نے دعوت کا رقعہ بھیجا خود بھی آگئے۔ مولوی صاحب نے پوچھا کھانے میں کیا کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ دال روٹی، شور بہ، خشک وغیرہ۔ مولوی صاحب نے کہا رقعے میں تو لکھا ہے ”ما حضر تناول فرمائیے“ تو کیا ما حضر نہیں پکوار ہے۔ وہ بولے جناب دعوت کے رقعوں میں جو عبارت ہوتی ہے۔ وہی میں نے لکھ دی۔ آگے آپ ارشاد فرمائیں۔ مولوی صاحب نے کہا ارے گھاڑ۔ ما حضر تو ایک خاص مغلیہ کھانے کا نام ہے اور نسخہ اس کا بڑا پیچیدہ اور مہنگا ہے۔ اس میں بیڑی کی بخنی پڑتی ہے۔ زعفران پڑتا ہے۔ ماء اللحم کا چھینٹا دیتے ہیں۔ خیرہ مرورید کا بگھار لگاتے ہیں۔ بہت پریشان کیسے میں یہ سارا انتظام کیسے کروں گا۔ مولوی صاحب نے کہا۔ اچھا اب کے تجھے معاف کیا، لیکن آئندہ جو لکھو پہلے اس کے معنی معلوم کر لیا کرو۔

آپ سے ملیے

آپ سے ملیے۔ آپ کا اسم شریف ہے حکیم محمد شریف رسالہ شرافت کے ایڈیٹر ہیں۔ پہلے امرتسر میں شریف پورہ میں رہتے تھے۔ آج کل لالو کھیت سے آگے شریف آباد میں قیام ہے۔ مجنوں شرافت اور شرافت منجن سے کراچی کا کون شریف آدمی واقف نہ ہوگا۔ کسی کو شرف ملاقات حاصل کرنا ہو تو یہ سیدھا ہے۔ بستی میں داخل ہوتے ہی شریف کے پیڑوں کا ایک جھنڈ نظر آئے گا۔ اسی کے ساتھ کوچہ شریفان میں شرافت منزل سامنے نظر آئے گی۔

یہ زمانہ شرافت کا نہیں۔ چوری کہیں بھی ہو۔ سب سے پہلے پکڑ دھکڑ ہمارے حکیم صاحب ہی کی ہوتی ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک آدھ بار تلاشی ہوئی تو ان کے ٹرکوں سے ایسا مال برآمد ہوا جس کے متعلق حکیم صاحب کو کچھ یاد نہیں کہ کب خریدا تھا۔ کہاں سے خریدا تھا۔ انہوں نے بہت کہا کہ ان ٹرکوں کی کنبیاں ہمیشہ میرے ازار بند بے بندی رہتی ہیں۔ جانے کس بد معاش نے کیسے ان کو کھول کر یہ مال مجھے بدنام کرنے کے لئے ان میں رکھ دیا۔ لیکن پولیس واپس لے کر آئی کہ کسی شریف آدمی کا لحاظ کرتے ہیں۔ بعض لوگ جو ہندوستان سے آئے ہیں۔ بڑی بڑا نکا کرتے ہیں کہ میں وہاں یہ تھا وہ تھا۔

حکیم صاحب کی طبیعت میں انکسار ہے۔ لہذا انہوں نے پاکستان آنے کے بعد یہاں ڈھنڈورا پیٹنا مناسب نہ سمجھا کہ وہ بھارت میں کیا تھے۔ کس حیثیت کے مالک تھے۔ آج جب کہ بڑے بڑے سیاسی لیڈر اپنے جیل جانے کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے خواہ وہ رات کی رات جیل میں رہے ہوں اور غلط فہمی رفع ہوتے ہی رہا کر دیئے گئے ہوں۔ حکیم صاحب کا اپنے لب سے رکھنا اور کسی سے ذکر نہ کرنا کہ وہ تین بار کئی سال کی قید کاٹ چکے ہیں بڑے ظرف کی بات ہے۔ حب وطن کا جذبہ ان میں ایسا تھا کہ کبھی انگریز کے قانون کی پروا نہ کی۔ ایک بار نقب لگاتے پکڑے گئے۔ انہوں نے بے خوفی سے اعلان کیا کہ انگریزوں کو زچ کرنے کے لئے ہر وطن دوست کا فرض ہے کہ نقب لگائے یا کسی اور طرح قانون شکنی کرے۔ دوسری بار انہوں نے انگریزوں کے بنائے ہوئے قانون شہادت کی خلاف ورزی کی تو غیر ملکی حکومت نے انہیں جھوٹی گواہی دینے کے الزام میں جیل بھیج دیا۔ حالانکہ حکیم صاحب کا کہنا تھا کہ میں

نے تو ترک موالات کے تحت دیدہ و دانستہ سچ بولنے سے انہماض کیا تھا۔ انگریزوں کی نظر میں یہ ہمیشہ کھلتے رہے۔ ایک بار گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ ایک انگریز بھی اسی ڈبے میں تھا۔ تھوڑی دیر میں اس نے شور مچا دیا کہ میری گھڑی کہاں گئی۔ سبھی نے تلاش کرنا شروع کیا۔ حکیم صاحب نے بھی ڈبے کے ایک ایک آدمی کی تلاش لی اور ڈرایا دھکایا لیکن کسی نے اقبال جرم نہ کیا۔ اس بدتمیز انگریز نے بجائے اس کے کہ ان کا شکریہ ادا کرتا۔ ان کی تلاشی لینے پر اصرار کیا۔ اور سوئے اتفاق سے وہ گھڑی ان کی جیب سے نکلی۔ وہاں کیسے چلی گئی۔ حکیم صاحب آج تک حیران ہیں۔ نہ یہ گھڑی کا عقدہ آج تک حل ہوا۔ نہ یہ کہ ان کی دوسری جیب سے ایک اور مسافر کا جو فونٹین پین نکلا وہ کیسے وہاں آ گیا۔

(۲)

میر رئیس الدین کا تعارف ہم سے ہمارے دوست میاں نیک محمد نے کرایا تھا۔ نیک محمد صاحب کا سانیک نفس آدمی کہیں نہ ملے گا۔ نہ کسی کی برائی کر سکتے ہیں۔ نہ سن سکتے ہیں ایک بار کسی نے ان کے سامنے شیطان کو برا کہہ دیا تھا۔ اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئے کہ شیطان کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے اس کے خوبیوں پر بھی نگاہ کرو۔ دنیا کے اتنے آدمی اس کے ہاتھ پر بیعت ہیں۔ اس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں تو یہ بے وجہ نہیں ہو سکتا، ضرور اس میں کچھ خوبیاں بھی ہوں گی۔

میر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے میاں نیک محمد نے کہا کہ انہیں آپسے ہاں نوکر رکھ لیجئے۔ ضرورت مند ہیں۔ ہندوستان میں تھے تو پوتڑوں کے رئیس تھے۔ در پر ہاتھی جھولتے تھے اور ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ آج اس حال میں ہیں ورنہ ان کا قلم نزاروں پر چلتا تھا۔

میاں نیک محمد صاحب کی ایک نیکی یہ ہے کہ جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔ لہذا میر صاحب کو ہم نے اپنی کپنی میں منشی رکھ لیا۔ لیکن چند ہی روز میں ان کی خوبیاں ہم پر کھینے لگیں تو ہم نے میاں نیک محمد سے کہا کہ سودا جو تیرا حال ہے ایسا تو نہیں وہ کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا۔ آپ تو انہیں پوتڑوں کا رئیس بتاتے تھے۔ بولے تم ادیب آدمی ہو۔ میری بات کو محاورہ سمجھے۔ بدھٹی ہم نے تو ہمیشہ ان کے گھر میں پوتڑے سوکھتے دیکھے۔ اس لحاظ سے کہا تھا۔

اب ہم نے کہا۔ وہ دروازے پر ہاتھی جھولنے والی بات؟ فرمایا۔ ہمارے میر صاحب کا دولت خانہ کانپور میں چڑیا گھر کے پاس تھا۔ وہاں سے ہاتھی منگشت کرتے ہوئے آنکلتے اذان کے گھر کے سامنے آ کر جھومنے لگتے۔ انہوں نے کئی بار چڑیا گھر والوں سے شکایت بھی کی کہ ان کو باندھ کر رکھا کیجئے۔ میرے گھر کے سامنے آ کر گندگی پھیلاتے ہیں۔

ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ ہم نے تو ایسا ندیدہ اور خسیں آدمی کبھی نہ دیکھا۔

فرمایا اس بات کو بھی آپ اسفارے میں لے گئے تو میرا کیا قصور ہے شک جزرں آدمی ہیں۔ آج تک کبھی دسترخوان نہ خریدا۔ بستر کی چادر سے دسترخوان کا کام لیتے تھے اور اس کے ایک طرف اکیلے بیٹھ کر چٹنی سے روٹی کھاتے تھے۔

آخر میں ہم نے کہا۔ وہ جو آپ نے کہا تھا کہ ہزاروں پران کا قلم چلتا تھا۔ اس کا مطلب بھی کچھ دوسرا ہی ہوگا۔

بولے۔ وہ بھی کچھ جھوٹ نہیں۔ ہمارے میر صاحب ڈاک خانے کے سامنے بیٹھ کر لوگوں کے منی آرڈر لکھا کرتے تھے۔ جانے کتنے ہزار روپے روز کے منی آرڈر ان کے ہاتھ سے نکلتے ہوں گے۔

(۳)

”یہ میرے دوست ہیں۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ کی فرم میں جگہ مل سکے تو ”کس قسم کی جگہ؟“

”نشی رکھ لیجئے۔ جو شاندارے کوٹنے چھاننے کا تجربہ رکھتے ہیں لہذا آپ کے ہاں میڈیکل افسر بھی ہو سکتے ہیں۔ علم نجوم میں بھی دخل ہے۔ آپ کے اسٹاف کے ہاتھ دیکھ دیا کریں گے۔“

”کیا نام ہے؟“

”سید فصاحت حسین“

”والد کا نام“

”جے کے جنجوعہ۔ جھنڈے خاں جنجوعہ“

”کیا کرتے ہیں ان کے والد“

”جی ان کے والد زندہ ہوتے تو ان کو کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بچارے جیم ہیں۔ ان

کے والد ان کی پیدائش سے کئی سال پہلے فوت ہو گئے تھے۔“

”والدہ“

”جی ان کا سایہ بھی ان کی پیدائش سے دو سال قبل ان کے سر سے اٹھ گیا تھا۔“

”اور رشتہ دار تو ہوں گے۔“

”جی نہیں اور رشتہ دار بھی کوئی نہیں کیونکہ ان کے دادا والد مرے اور پردادا نے شادی ہی نہیں

کی تھی۔ یہ تھا جس اس بھری دنیا میں۔“

”کیا کرتے ہیں۔“

حال ہی میں سات سال کی طویل اقامت کے بعد جیل سے رہا ہوئے ہیں۔ وہ تو اب آ کر ان پر وقت پڑا ہے تو نوکری تلاش کر رہے ہیں۔ ورنہ روپیوں میں کھیلتے تھے۔“

”کیا کرتے تھے۔“

”بس دستکاری۔ اپنے ہاتھ کی محنت کا کھاتے تھے۔ اپنے فن میں وہ دستگاہ بہم پہنچائی تھی کہ

بڑے بڑے ان کے آگے کان پڑتے تھے۔ وہ تو ان کا ایک شاگرد کچا نکل گیا۔ اوچھا ہاتھ پڑا اس کا۔ بڑے میں سے کچھ نکلا بھی نہیں اور اس کی نشاندہی پر فصاحت صاحب مفت میں پکڑے گئے۔

”ہمارے ہاں نوکری کے لئے چال چلن کے شوقیت کی ضرورت پڑتی ہے۔“

”وہ ہم داروغہ جیل سے لے لیں گے۔ نیک چلنی کی بنا پر ان کو سال بھر کی چھوٹ بھی تو ملی تھی۔ اس کا شوقیت بھی موجود ہے۔“

”تعلیم کہاں تک ہے۔“

”جی تعلیم یہ آج کل کے اسکولوں کالجوں میں جو پڑھایا جاتا ہے وہ تعلیم ہوتی ہے کیا؟ ہم

نے بڑے بڑے میٹرک پاسوں اور ڈگریوں والوں کو دیکھا ہے۔ گنوار کے گنوار۔ جتے ہیرا۔“

”اچھا تو فصاحت حسین صاحب۔ آپ عرضی لائے ہیں نوکری کے لئے؟“

”جی لایا ہوں یہ لیجئے۔“

”پڑھ کر سنائیے۔“

”جی میں عینک گھر بھول آیا ہوں۔“

اچھا تو دیجئے۔ اس پر دستخط تو آپ نے کیے ہی نہیں۔ اور یہ کیا سیاہی کا دھبہ ڈال دیا ہے درخواست کے نیچے۔“

”حضور یہ دھبہ نہیں ہے۔ میرا نشان انگشت ہے۔ دیکھئے ثابات اصل میں یہ ہے کہ۔۔۔“

ایک سپاسنامہ۔ ایک بے لوث کارکن کی طرف سے

”جناب والا پاکستان کے بے لوث کارکنوں کی جماعت انجمن بے لوث کارکنان پاکستان (رجسٹرڈ) تہہ دل سے جناب والا کا خیر مقدم کرتی ہے۔ جناب والا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام محبت وطن پاکستانی مل کر حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں۔ چنانچہ انجمن ہذا بھی خلوص دل سے موجودہ حکومت کے ہاتھ اسی طرح مضبوط کرنے کو تیار ہے، جس طرح پیش ازیں صدر ایوب کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہے۔ صدر یحییٰ کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہے بلکہ ہر حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتی رہتی ہے۔

جناب والا۔ ہماری انجمن کی ایک خصوصیت حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے علاوہ میدان میں کود پڑنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم اپنے محبوب صدر کے ادنیٰ اشارے پر میدان میں کود پڑنے کو تیار ہیں بشرطیکہ میدان میں یہاں سے وہاں تک روئی کے گدے نہالے اور غالیے لپچے بچھا دیے جائیں۔ ان کے بغیر میدان میں کودنا گزند کا باعث ہو سکتا ہے۔ چوٹ آ سکتی ہے۔ جو ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر مناسب نہیں ہے۔

جناب والا۔ انجمن ہذا یعنی انجمن بے لوث کارکنان پاکستان (رجسٹرڈ) کے دروازے سب پر کھلے ہیں۔ کیونکہ اس کے اندر کچھ نہیں ہے۔ پہلے تھا۔ لیکن اس کو کارکنان مذکور ہاتھوں ہاتھ اٹھا لے گئے۔ اب فقہا دروازے کا ساکن بورڈ باقی ہے جسے انجمن ہذا بخوشی قوم کی نذر کرنے کو تیار ہے۔ یہ مضبوط شیشم کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اس پر دھوبی کپڑے شیخ سکتے ہیں جو دھوبی نہیں وہ مریخ سکتے ہیں۔ غسل مردے نہلا سکتے ہیں بلکہ مردے اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت آپ نہلا سکتے ہیں۔

جناب والا۔ انجمن ہذا کے سبھی کارکنان پر لے درجے کے بے لوث کارکن ہیں۔ ان سے کوئی ان کی خدمت کے صلے کی بات کرے تو مارنے کو دوڑتے ہیں۔ یہ خاکسار میاں فقیر محمد سیکرٹری جنرل انجمن ہذا بالخصوص فقیر مناش آدمی ہے۔ اسے آپ سے کوئی خواہش نہیں ہے۔ سوائے عہدے کی خواہش کے اور کسی قسم کا لالچ نہیں سوائے روپے کے لالچ کے۔ گذشتہ حکومتوں نے خاکسار کو خریدنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں خرید سکے۔ پہلے وزارت پیش کی گئی خاکسار نے اس پر لات ماردی۔ پھر

سفارت پیش کی گئی۔ خاکسار نے اس پر بھی لات مار دی۔ خاکسار دولت پر لات مار چکا ہے۔ ثروت پر لات مار چکا ہے، شہرت پر لات مار چکا ہے اور بھی کئی چیزوں پر لات مار چکا ہے جو اس وقت یاد نہیں۔ افسوس اب یہ لات اس قابل نہیں رہ گئی کہ مزید کسی چیز پر ماری جاسکے۔ لات مارنے کی عادت سے مجبور ہو کر اس خاکسار نے ایک کتے کے بھی لات مار دی تھی۔ وہ محاورے نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اس جذبہ اشیار کی قدر نہ کی۔ جواب میں دانت مار دیئے۔ آدمیت سے بعید حرکت کی۔

جناب والا۔ جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا، خاکسار کو آپ سے یا حکومت سے کسی قسم کی غرض نہیں ہے تاہم خاکسار کو شہر کی مین مارکیٹ میں جو زیر تعمیر ہے، کوٹنے والی بڑی دکان الاٹ کر دی جائے تو خاکسار کا تو کم بے لوث خدمت کا جذبہ روز افزوں ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ انجمن ہذا کی عہدہ داری کے علاوہ جسے خاکسار ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا حرام سمجھتا ہے، خاکسار کا چھوٹا سا ذاتی کاروبار بھی فقیر اسٹون ورس کے نام سے ہے ہمارے محبوب صدر نے پچھلے دنوں فرمایا ہے کہ ہمیں محنت کرنی چاہیے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی محنت ہونی چاہیے۔ لہذا خاکسار کی فرم نے لوگوں کو پیٹ پر باندھنے کے لئے پتھر بار عایت نرخوں پر سپلائی کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ یہ پتھر منگھو پیر کی پہاڑی کے ہیں لہذا مضبوط ہونے کے علاوہ روحانیت سے بھرپور اور خیر و برکت سے معمور ہیں۔ یہ پتھر پیٹ پر باندھنے کے علاوہ اور بھی کئی کام آ سکتے ہیں۔ محبوب لوگ ان سے سنگ آستان بنواتے ہیں اور اس پر عاشق لوگوں سے جبین گھسواتے ہیں، ناک رگڑواتے ہیں۔ ناک اور جمیں کے علاوہ ان پر ہلدی اور مرچ بھی بخوبی پیس سکتے ہیں۔ خود کشی کے لئے بھی ہمارے ہاں کے پتھر آزمودہ ہیں۔ جو کوئی ان کو اپنے ساتھ باندھ کر دریا میں کودا پھر پانی کی سطح پر نہ ابھرا۔ ظالم سماج ہاتھ ملتا ہی رہ گیا۔ خود کشی کرنے والوں کے بے شمار تصدیقی شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں کہ ہم کو ایک ہی پتھر سے فائدہ ہوا، قید حیات و بند غم سے نجات مل گئی۔ اب چند پتھر فلاں فلاں حضرات کو ہماری طرف سے بھیج دیجئے۔ دکان سے دریا کے بل تک پتھر پہنچانے کا خرچ ہم اپنے پلے سے دیتے ہیں، گاہک سے چارج نہیں کرتے۔

جناب والا جانے کس شاعر نے کہا ہے لیکن خوب کہا ہے کہ اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کو تا ہی۔ واقعی ساری خرابیوں کی جڑ رزق یعنی غلہ وغیرہ ہے۔ اس وقت ہماری قوم کو غلے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ پتھروں کی ہے، ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ ہمارے ایک بزرگ جن کا نام میں اس وقت بھول رہا ہوں، داندہ گندم کی وجہ سے جنت سے نکالے گئے۔ آج تک کوئی پتھروں کی

وجہ سے نہیں نکالا گیا۔ شاعر مذکور نے جو رزق سے موت کو بہتر بتایا ہے تو اس کی وجہ ہے۔ مرنے والے کے مزار پر ہماری دکان کے مضبوط اور خوب صورت پتھر لگائے جاسکتے ہیں، کسی زندہ آدمی کے مزار پر نہیں۔ جس نے ایک بار اپنی قبر پر ہمارے ہاں سے پتھر کی تختی لگوائی ہمیشہ کے لئے ہمارا گرویدہ ہو گیا۔ جناب والا! ایک لوح مع قطعہ تاریخ ہم آپ کی نذر بھی کرتے ہیں۔ وقت آنے پر کام آئے گی۔ مگر قبول افتد.....

کچھ اور ٹکٹ کچھ اور امیدوار

ہم نے اس روز ریلوے کے ریٹائرڈ گارڈ میر دلدار علی سندیلوی کا ذکر کیا تھا جن کو صوبائی اسمبلی کے لئے کسی اور پارٹی کا ٹکٹ نہ ملا تو ریلوے کے ٹکٹ پر ہی کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ غالباً ریٹرن ٹکٹ ہوگا۔ جس میں فائدہ یہ ہے کہ آدمی اور کچھ نہیں تو اپنے گھر تو واپس آ سکتا ہے۔ دوسرے ٹکٹوں والوں کا تو یہ دیکھا ہے کہ بعض اوقات نہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ پروگرام میر صاحب قبلہ کا یہ ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں۔ میر صاحب کے طویل تجربے کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعی کریں گے لیکن 'نہیں کچھ اور چوکی اور مستعدی دکھانے کی ضرورت ہے یہ نہ ہو کہ مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتے کرتے خود اتنے لیٹ ہو جائیں کہ گاڑی نکل چکی ہو مڑی چمک رہی ہو

میر صاحب مذکور کی الیکشن مہم آج کل چھکا چمک جا رہی ہے۔ تقریر میں ایسا فرامانا مہر ہے ہیں کہ بڑے بڑے جنکشن منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بیچ میں فقط ایک آدھ جگہ رکھتے ہیں۔ وہ بھی پانی لینے یعنی پانی پینے کے لئے۔ ان کی ایک آدھ تقریر ہم نے بھی سنی ہے۔ فرمایا آپ نے۔

حضرات یہ دنیا مسافر خانہ ہے۔ ہم سب یہاں بیخبر کے موافق ہیں۔ پس جتنے دن زندگی کی گاڑی چلتی ہے، محبت اور اخوت کا سنگٹل ڈاؤن رکھنا چاہے اور نفرت و عناد کو ہمیشہ لال جھنڈی دکھانی چاہیے۔ غریب اور امیر کا ذکر کرتے ہوئے میر صاحب نے کہا کہ "اس وقت ہمارے معاشرے میں بڑی ابتری ہے۔ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے لوگ تو عیش کی سیٹیاں بجاتے ہیں۔ ہم انٹر کلاس اور تھرڈ کلاس لوگ جو تیاں جھٹاتے ہیں.....؟"

حاضرین میں سے کسی نے نعرہ لگایا کہ اسلام خطرہ میں ہے۔ میر صاحب ترنت بولے۔

"اسلام خطرے میں نہیں ہے۔ بار بار خطرہ کی زنجیر مٹ کھینچو۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔

جرمانہ دینا پڑے گا۔"

ریلوے کا سنا تو ایک صاحب پی آئی اے کے ٹکٹ پر کھڑے ہو گئے۔ آج کل اس قسم کی تقریریں کر رہے ہیں۔

لیڈیز اینڈ جینٹلمین: سلاما لیکم۔ کیپٹن فلک سیر آپ کو الیکشن پر وازو ۱۹۷۰ء پر خوش آمدید کہتا ہے۔ اپنے حفاظتی بند باندھ لیجئے اور سگریٹ نوشی سے پرہیز کریں۔ ہم پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر

پرواز کرتے ہوئے اور خیالی پلاؤ کھاتے ہوئے انشا اللہ مہینہ بھر میں اسمبلی چیمبر میں جااتریں گے۔ راستے میں دہنی طرف اچھرہ موڑ آئے گا اور بائیں طرف لازکانہ کے پتیلوں کے جھنڈ پڑیں گے۔ ہم ان کو بے نیاز اندہ دیکھتے ہوئے گزریں گے۔ امید ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرے گا۔ دھنیہ باد شکر یہ تھینک یو۔

ہوائی جہاز کا ٹکٹ حاصل کرنا ایسا آسان نہیں۔ ریلوے کی کھڑکی پر بھی کبھی کبھی رش ہو جاتا ہے۔ لہذا ہمارے کرم فرما خان بنارس خان نے لائڈھی سے اومنی بس کے ٹکٹ پر کھڑے ہونا پسند کیا ہے۔ انہوں نے الیکشن کی مہم کا آغاز کرتے ہوئے اپنے کارکنوں کو اشارہ کیا ہے کہ ”جانے دوس“ اپنی تقریر کا آغاز وہ ہمیشہ کسی نہ کسی شعر سے کرتے ہیں۔ ”آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ سامان سو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں“ ان کا نعرہ ہے کہ ”ہارن دے کر پاس کریں“ اور تقریر کا انداز یہ ہے:-

بائیو۔ اوپر آ جاؤ۔ پائیدانوں پر مت کھڑے ہو۔ جیب پاکٹ سے ہوشیار۔ آج کل ووٹ کترے بہت ہو گئے ہیں۔ ہاں تو بائیو۔ تم ام کو سیٹ پر بٹھاؤ۔ ام تم کو سیٹ پر بٹھائے گا۔ کسی کو کھڑا نہیں رکھے گا۔ ہمارے ہاں پارٹیاں بہت ہیں لیکن سب دھواں چھوڑ رہی ہیں۔ امیدواروں میں کسی کا بریک فیل ہے۔ بولنا شروع کرتا ہے تو رکتے رکتے بھی آدھ گھنٹہ اور لگا دیتا ہے۔ کسی کی باڈی پرانی ہے بعضوں کے تو سائینسز بھی کام نہیں کرتے جیسے ہمارے اداکارے والے مولوی صاحب کے۔ پس ام کو ووٹ دو..... ارے اٹھ کر کدھر جاتا ہے ابھی ہمارا تقریر کہاں ختم ہوا ہے۔

ہر بشر کو ہے یہ لازم صبر کرنا چاہیے

جب کھڑی ہو جائے گاڑی تب اترنا چاہیے

اتفاق سے ایک ٹکٹ ڈاک کا بھی ہوتا ہے۔ بابو محمد دین سابق پوسٹ ماسٹر کو اسی پر کھڑے ہونے میں سہولت نظر آئی۔ ان کی تقریر بھی ہم نے سنی ہے۔

”محترم حضرات! السلام علیکم۔ مزاج شریف آپ سب کو ہمارا درجہ بدرجہ سلام پہنچے۔ ہمارے تھیلے میں باتیں تو بہت ہیں لیکن سارٹ کر کے فقط چند ایک آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ یہ جتنے امیدوار ہیں، سب کے دلوں پر مہریں لگی ہوئی ہیں۔ ان کی باتیں محض لفافہ ہیں۔ اندر کچھ بھی نہیں۔

کسی کا پتہ نہیں کہ کب بیرنگ ہو جائے یا پوری قوم کو ڈیڈ لیٹر آفس دھکیل دے۔ دوڑ حضرات سے التماس ہے کہ میرے خط کو تار سمجھیں۔ یعنی میری گزارشات پر توجہ فرمائیں اور پولنگ کے روز اپنے اپنے دوٹ قریب ترین لیٹر بکس میں ڈال دیں۔ باقی سب خیریت ہے۔ والسلام۔“

متوالا کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ فلمی دنیا کی مشہور شخصیت ہیں۔ یہ بھی الیکشن میں کھڑے ہیں اور ان کے پاس سینما کا ٹکٹ ہے۔ یہ اپنی تقریر کا مکھڑا عموماً کسی فلمی گیت سے باندھتے ہیں۔ مثلاً اے دیکھنے والے دیکھ کے چل۔ ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں“ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

”حضرات! قوم کی خدمت کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن میں یہ سوچ کر کھڑا ہو گیا ہوں کہ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ اور چھپ چھپ آئیں بھرتا کیا؟ کھڑا ہونا میرا کام تھا۔ اب مجھے ممبر بنانا آپ کا کام ہے یعنی اب یہ تہاڑی عزت واسوال اے۔

صاحبان! آپ کے پاس طرح طرح کا امیدوار آئے گا۔ طرح طرح کی ایکٹنگ کرے گا اور ڈائلاگ بولے گا۔ ان سے ہوشیار۔ ان کے رونے گانے پر نہ جائیے گا۔ سب پلے بیک ہے۔ خاکسار کی پوری عمر قوم کی خدمت میں ریہرسل کرتے گزری ہے۔ اب تو اسے قومی ہیرو بننے کا موقع ملنا چاہیے۔ آپ اس شیراں دے پتر شیر کو دوٹ نہ دیں گے تو اور کسے دیں گے؟ ایک روز ان کے جلسے میں ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کوئی اعتراض کرنا چاہا، آپ نے فوراً آواز لگائی ”کٹ“ وہ وہیں بیٹھ گیا۔

خان شیر خان کا ندھی گا رڈن کے علاقے سے کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے پاس چڑیا گھر کا ٹکٹ ہے۔ ان کی تقریر بھی سننے کی ہوتی ہے۔

صاحبان آج کل ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ دھاڑ رہا ہے۔ چنگھاڑ رہا ہے۔ لیکن ہاتھی کی طرح ان کے کھانے کے دانت اور ہاں اور دکھانے کے اور قوم کے لئے قربانی دینے کا وقت آئے گا تو سب کو سانپ سگھ جائے گا۔ طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں گے۔ دم بابر بھاگ جائیں گے۔ یاد رکھئے۔ ان لوگوں کا آگ شیر کا ہے اور پیچھا بھیڑ کا ہے۔ بگلا بگستوں کو دوٹ مت دیجئے۔ خاکسار کو دیجئے کیے شاہین را بلند است آشیانہ۔

سب سے مختصر تقدیر مرزا برکت اللہ بیک کی ہوتی ہے۔ یہ الاٹری کے ٹکٹ پر کھڑے ہیں۔ ”بھائی صاحبان۔ میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے دوٹ دیجئے اور اسمبلی میں پہنچا دیجئے۔ اس کے بعد میں آپ کی خدمت کرتا ہوں یا آپ کو دعا دیتا ہوں، یہ آپ کی قسمت کی بات ہے۔

چند مطالبات

ہڑتال کا رواج تو پرانے زمانے سے چلا آ رہا ہے لیکن اس حد تک کہ رانی اٹوانی کھوانی لے کر پڑ جاتی تھی۔ جب تک راجہ اس کے بیٹے کو راج پاٹ اور سوکن کے بیٹے کو بن باس نہ دے دیتا تھا۔ یہ انڈسٹری آج کل کے زمانے میں بنی ہے، آقا اور غلام، سیٹھ اور نوکر کا رشتہ بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ صاحب میری تنخواہ بڑھا دیجئے ورنہ.... سیٹھ نے گرج کر کہا۔ ورنہ کیا؟ تو اس نے سر جھکا کر کہا۔ ورنہ اسی تنخواہ پر کام کرتا رہوں گا۔ فی زمانہ اسی تنخواہ پر کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ورنہ کے بعد تو ہڑتال ہے۔ اگر ورنہ نہ ہو تب بھی ہڑتال۔ ایک کارخانے کا مالک زیادہ ہی اچھا تھا۔ جو مزدور کہتے تھے۔ جھٹ مان لیتا تھا۔ مزدور بہت مایوس ہوئے۔ اس لئے کہ آس پاس کے سارے کارخانوں میں ہڑتال ہو جاتی تھی اور یہ بکلو بنتے تھے۔ آخر انہوں نے ایک روز ہڑتال کر ہی دی کہ یہ بڑا چالاک قسیم کا سرمایہ دار ہے، مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔

ہڑتالیں بھی کئی قسم کی ہیں، قلم چھوڑ ہڑتال، قلم توڑ ہڑتال، قلم مروڑ ہڑتال، ایک دفتر میں ہڑتال ہوئی تو کلرک صرف جاگلیا پہن کر دفتر آنے لگے۔ یونین کے کچھ لوگ تو جاگلیا پہننے کے بھی خلاف تھے، اسے بورڈ والی عادت قرار دیتے رہے تھے۔ لیکن اس کو ترک کرنے پر قانون کی ایک دوسری اور غیر متعلق دفعہ میں ماموز ہونے کا خطرہ ہے، دوسری طرف ایک نائٹ کلب میں ہڑتال ہوئی تو یوں کہ مہمانوں کی تالیف قلب کے لئے ناچنے والی بیبیوں نے کپڑے اتارنے سے انکار کر دیا بلکہ پورے بازوؤں کی قمیصیں لہر دوپٹے پہن کر آگئیں۔ کپڑوں کا تو خیر یہ ہے کہ جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری۔ یا بقول شخصے کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے، لیکن اس شغل شریف کے اور بھی رنگا رنگ پہلو ہیں۔ مثلاً یہی کہ ہر کوئی اپنی اپنی بولی الگ بولتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو!

لانڈری کے نام

ہم نیو انٹرینشل پنجاب لانڈری وڈرائی کلیئرز کے مالکان کو خبردار کرتے ہیں کہ وہ اپنی گندی ذہنیت ترک کر دیں۔ ان کا وجود صوبائی برادری کے دامن پر دھبہ ہے۔ ان کی گردنیں کلف لگے کپڑے کی طرح اکڑی رہتی ہیں۔ کام کرتے کرتے ہمارے چیتھڑے اڑ گئے لیکن ان کے مزاج کا سوڈا کا سٹک ابھی تک نہیں گیا۔ ہماری مثال اتنے برس کی نوکری کے بعد بھی وہی ہے کہ دھوبی کا کتنا گھر کا نہ گھاٹ کا۔

عمارتی ٹھیکیدار کے نام

ہم اینٹ بخش گاراخان عمارتی ٹھیکیداران لمیٹڈ کے مزدور متحد ہو کر اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے مطالبات فوری طور پر منظور نہ ہوئے تو ہم بالکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے بلکہ انکا بھٹہ بٹھا دیں گے۔ ہم مزدور معاشرے کا ستون ہیں بلکہ وہ بنیاد ہیں جس پر معاشرے کی پوری دیوار کھڑی ہے۔ ہم نہ ہوں تو یہ اڑا اڑا دھم گرجائے گا۔ اب نہالی لیا پوتی سے کام نہیں چلے گا۔ ہماری پگار بڑھنی چاہیے۔

ٹیچروں کی طرف سے

عرض یہ ہے کہ محنت اور دیدہ ریزی نے ہمارا عا د عظیم اور ذواضعاف اقل نکال دیا ہے۔ اگر ایک حوض کو ایک نالی دو گھنٹے میں پر کرے اور دونالیاں اسے ایک گھنٹہ میں خالی کر دیں تو اس حوض کی جو مانت ہوگی، وہی ہماری ہے۔ ہمارے پیٹ میں لا ہے اور ہمارے ہاتھوں میں بھی لا ہے اور ہم حالات کی مشابہت میں زاویہ منفرجہ بن کر رہ گئے ہیں۔ جو کوئی آتا ہے ہم پر عمود گرا تا ہے۔ ہم کو موقع دیا جائے کہ ہم اپنی حالت کی مثالیں دے کر فاضح کریں۔ محکمے کو اپنا آموختہ سنا سکیں۔ اپنے فعل ماضی اور فعل مستقبل سے آگاہ کر سکیں۔

دور زیوں کی طرف سے

ہم اپنڈیٹ ٹیلرنگ ہاؤس برائے لیڈیز اینڈ جینٹس کے ملازمین ایک مدت سے گریہ ال چاک پھر رہے ہیں اور جب مالکان کو ان کے وعدے یاد دلاتے ہیں تو وہ کپڑوں سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ہم ان کو آخری بار نوٹس دیتے ہیں کہ وہ اپنے وعدوں کو عملی پا جامہ پہنائیں ورنہ ہم ان کے منجھے اوہیز کر دکھادیں گے۔

میخانے کے نام

یونیورسل بار اینڈ نائٹ کلب کے بیروں کا بیاناہ صبر اب لبریز ہو چکا ہے اور وہ مالکان جو دولت کے نشے میں مست ہیں، مطلع کرتے ہیں کہ وہ ہوش میں آجائیں ورنہ ہم نتائج کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ یہ ان کی عزت کا سوال ہے۔ یہاں بگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں۔ ہمارے مطالبات کوئی شراب نہیں ہیں کہ سن کر پی گئے۔ ان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

ایک نوٹس مالکوں کی طرف سے

قذافت ہیئر کٹنگ سیلون کے کاریگروں کو نوٹس دیا جاتا ہے کہ وہ عقل کے ناخن لیں اور فوراً کام پر واپس آجائیں۔ کاریگروں کا یہ الزام سراسر غلط ہے کہ ہم مالکان سیلون اپنے کاریگروں کو الٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ کاریگر خود جانتے ہیں کہ ہم نہ کسی کو الٹے استرے سے مونڈتے ہیں نہ سیدھے استرے سے مونڈتے ہیں بلکہ گلے پر بیٹھے پیسے گنتے رہتے ہیں۔ کاریگروں کے ساتھ ہم نے اپریل ۱۹۵۱ء میں اجرتوں کا جو معاہدہ کیا تھا اس پر پوری طرح قائم ہیں۔ اس سے سر مواعظ انحراف نہیں کیا۔

ذرافون کرلوں؟

جب تک آپ کے گھر میں ٹیلیفون نہ ہو آپ کبھی اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ عوام الناس بالخصوص اپنے محلے والوں میں کتنے مقبول ہیں۔ ہمیں بھی اس کا پتہ اس وقت چلا جب ہم کچھ دنوں بیمار ہو کر صاحب فراش ہوئے۔

شیخ نبی بخش تاجر چم ہمارے محلہ دار ہیں۔ ان سے علیک سلیک ہے۔ گاڑھی چھننے والی کوئی بات نہیں۔ ہمیں ان کے حسن اخلاق کا بھی اندازہ نہ تھا۔ ہمارے بیمار ہونے کے بعد سب سے پہلے وہی تشریف لائے۔ ہماری بیٹی سے لگ کر بیٹھ گئے۔ تعزیت کرنے والوں کا منہ بنایا اور پوچھا کیا شکایت ہے۔ ہم نے کہا۔ ”آپ سے ہمیں کوئی شکایت نہیں، واللہ نہیں۔“

فرمانے لگے میں تو آپ کی بیماری کا پچھ رہا ہوں۔ تب ہم نے بتایا کہ معمولی کھانسی ہے بخار ہے۔ بولے، اس کو معمولی نہ جانیے گا۔ میری بیوی کے بھانجے کو بھی یہی عارضہ تھا۔ آپ ہی کی عمر کا رہا ہوگا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا، ”مر گیا؟“ ہم نے برکھلا کر پوچھا۔

فرمایا ”ہمارے لئے تو مری گیا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کینیڈا چلا گیا۔ وہاں سنا ہے شادی کر لی۔ ہمیں تو اب خط بھی نہیں لکھتا۔“

ہم نے حیات تازہ پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ رشک ان کی بیوی کے بھتیجے کی قسمت پر بھی آیا۔ بہر حال ہم نے ان بزرگ سے کہا کہ آپ نے ناحق مزاج پرسی کے لئے آنے کی زحمت فرمائی۔ بہت بہت شکریہ۔

اٹھتے اٹھتے اتفاق سے ان کی نظر ہمارے فون پر پڑ گئی۔ بولے۔ اپنی دکان پر فون کرلوں؟ جو شخص اتنی محبت سے حال پوچھنے آئے۔ اس سے کیا دریغ ہو سکتا ہے۔ ہم نے کہا شوق سے کیجئے۔ وہ گئے ہی ہوں گے کہ ریٹائرڈ تھانیدار اور حال ٹھیکیدار میر باقر علی سندیلوی لٹھیا ٹیکتے آئے۔ بولے، سنا تھا آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔

”ہمارے دشمنوں کی تو نہیں۔ ہمیں ضرور کھانسی بخار ہے۔ ہم نے وضاحت کی ہے۔ نہایت شفقت سے ہماری بخش ٹٹولتے ہوئے بولے ”کچھ دوا دارو کرو۔ احتیاط رکھو۔ تم جیسا ادویہ اور انشاپر واز کم از کم ہمارے محلے میں تو اور کوئی نہ ہوگا۔ اگر خدا نخواستہ، قضا و قدر کے کان بہرے، کوئی ہرج ہرج ہو گیا تو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔“

انہوں نے کچھ کہا۔ ہم اپنی وحشت میں کچھ اور سمجھے۔ چنانچہ با آواز بلند عرض کیا کہ ”قبلہ یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ کے کان بہرے ہو رہے ہیں۔ ان میں باقاعدہ جینیلی کا تیل گرم کر کے ڈالا کیجئے۔ اس پر نقصان، سوشیکیداری میں نفع نقصان تو ہوتا ہی ہے۔“

اس پر ہمارے ایک دوست نے جو ہمارے پاس بیٹھے تھے۔ ہمیں جھنجھوڑا اور میر صاحب سے معذرت کی کہ منافہ کیجئے۔ یہ شخص یونی بیکی بیکی باتیں کیا کرتا ہے۔ آپ کی مزاج پر سی کا شکریہ۔

اس پر انہوں نے فرمایا کہ مزاج پر سی تو میرا نسبت مسلمان اور ہم محلہ ہونے کے عین فرض تھا۔ اس میں رحمت کی کوئی بات نہیں۔ پھر اٹھتے اٹھتے بولے۔ ”میرا الزکا نالائق صبح سے بھٹے پر گیا ہوا ہے۔ یہاں میں اینٹوں کے ٹرک کا انتظار کر رہا ہوں۔ اجازت ہو تو اسے فون کر لوں۔ شوق سے کیجئے۔ ہم نے کہا آپ ہی کا فون ہے۔“

اس کے بعد پرفیسر کے بخش کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ان کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ سعید منزل کے سامنے بیٹھتے ہیں اور قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ مقدمہ، بیماری، روزگار ہر مسئلے پر انکا مشورہ مفید ہوتا ہے۔ لا علاج بیماریوں کے مایوس مریضوں کا علاج بھی کرتے ہیں۔ نام کریم بخش ہے۔ اور پروفیسر ہفتے سے پہلے ہمارے ایک عزیز کے ہاں ٹانساں تھے۔ ان کی راہ درسم ہم سے انہی دنوں سے ہے۔ آئے۔ بیٹھے۔ ہمارا حال تو چھا۔ پھر ہمارے ڈاکٹر کا نام پتہ دریافت کیا۔ پھر ڈاکٹروں اور ڈاکٹری طریقہ علاج کے متعلق کچھ چار خرفی ناقابل طباعت لکبات از شاد فرمائے۔ اس کے بعد تشخص کی او کہا۔ تمہارے جسم میں شکر کی کمی ہے۔ اور گلہ حراب ہے۔ اپنے مخربات میں بھی ایک پیز بھیجئے گا وعدہ کیا جو مینڈک کی چربی، مندھک اور لال بیگ کے انڈوں سے بنتی ہے اور الو کے مغز کے ساتھ نہار منہ کھانی پڑتی ہے۔ یہ بھی اٹھنے ہوئے ٹیلی فون پر ایک جگہ آؤ روئے گئے کہ آدھا سیر گھیکو اور دو نیو لے مجھے کل

میرے فٹ پاتھ پر بھجوا دیئے جائیں۔

ہم تو لوگوں کے اخلاق کریمانہ کے ممنون ہوتے رہ گئے۔ ہمارے بھائی نے ہمارے نہد کرتے ہوئے بھی کمرے میں فون لگا دیا کہ جو صاحبان مزاج پرسی کو آئیں وہ فون کو ہاتھ نہ لگائیں اور جو فون کرنے آئیں وہ مزاج نہ دریافت کریں۔

ہم ملازمت پیشہ آدمی ہیں۔ رات کے وقت گھر پر ہوتے ہیں۔ خدا جانے لوگوں کو کیسے گمان ہو گیا کہ ہم نے میٹرنی ہوم کھول رکھا ہے۔ حالانکہ ہمیں پچھلے دنوں حکمہ فیملی پلاننگ نے سند نوشنودی عطا کی ہے کہ لوگ تو بچوں کے معاملے میں احتیاط برتتے ہیں، آپ ان سے بھی زیادہ دور اندیش ہیں۔ بہر حال دن میں چار چھ فون ضرور اس قسم کے آتے ہیں۔

”ذرا میری بیگم صاحبہ کو بلا دیجئے۔“

”میرے ہاں لڑکا ہوا لڑکی۔ اتنی دلریوں ہو رہی ہے؟“

”ذرا ایسولنس بھیج دیجئے۔ جلدی کیجئے۔ میں سینٹھ بھولو بھائی مٹی کے تیل والا کھارادر سے بول رہا ہوں۔“ اگر ہم کہیں کہ ایسولنس ہمارے پاس نہیں ہے اور نہ ہمیں آپ کی بیگم صاحبہ سے تعارف ہے، نہ ہم آپ کی اولاد دینے و ملائینہ میں اضافہ کے مشتاق ہیں، تو جواب ملتا ہے۔ یہ کیسی میٹرنی ہوم کھول رکھا ہے آپ نے۔ میٹرنی ہوم ہے یا یتیم خانہ۔“

کئی بار جی چاہا ان سے کہیں کہ آپ کے بچوں کی رعایت سے اس کے یتیم خانہ ہونے میں آپ ہی کا نقصان ہے، لیکن پھر مختصر عرض کرتے ہیں کہ جی یہ میٹرنی ہوم نہیں۔ ایک یکہ و تنہا آدمی کا گھر ہے۔ اگرچہ کراچی کی شرح پیدائش دیکھنے کے بعد جی ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ کاش یہ ہمارا گھر نہ ہوتا میٹرنی ہوم ہوتا۔ جس جگہ کیلئے یہ فون کیے جاتے ہیں اس کے اور ہمارے فون نمبر میں فقط ایک عدد کا فرق ہے۔

یہی نہیں۔ ایک حلوہ مرچنٹ کا نمبر بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہمیں اکثر فرمائشیں اس قسم کی آتی ہیں کہ پندرہ سیر لڈ بھیج دیجئے اور ایک نوکرہ بالوشا ہیوں کا بھی۔ اصلی گھی کا۔ پہلے کی طرح چربی میں قل کرنے بھیج دیجئے گا۔ ایک بار ان حلوہ مرچنٹ صاحب سے ہماری ملاقات بھی ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ اکثر مشاعروں کیلئے غزلوں کی فرمائش ان سے کی جاتی ہے۔ اور رسالے والے تو ہمیشہ سر رہتے ہیں کہ آپ کی

نگارشات کا انتظار ہے۔ سالانہ نکل رہا ہے جلدی کیجئے۔

بعض لوگ مبرو الے ہوتے ہیں۔ ہمیں ساری راگ نمبر کہنے کی مہلت مل جاتی ہے لیکن بعضوں کو جلدی بھی ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب کا کل فون آیا،
”لکھئے چار جھولداریاں۔“

ہم نے عرض کیا۔ ”معاف فرمائیے“.....

بات کاٹ کر بولے۔ ”باتوں کا وقت نہیں۔ لکھتے جائیے۔ بارہ ڈزریٹ اچھے ہوں، پہلے کی طرح پھٹچر نہ ہوں۔“

ہم نے پھر کھنکار کر کہا۔ ”اجی سنئے تو.....“

درستی سے بولے چار چاند نیاں بھی ڈال دیجئے۔ صاف ہوں۔ سالن گری نہیں چاہئیں۔
ہمارا پیسہ حلال کا پیسہ ہے۔

ہم نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ لیکن..... لیکن ادھر سے حکم ہوا کہ پہلے ان کی فرمائش ٹوٹ کی جائے
پھر بات کی جائے۔

”اٹھارہ ڈونگے۔ بہتر پلٹیں۔ پانچ اٹلینیں۔ ڈیڑھ سو بیچے۔ دس جگ۔“

ہم سب لکھنے لگے۔ جب وہ ذرا دم لینے کو رکے تو ہم نے کہا قلم۔ ہم فقیر آئی ہیں۔ ہم اتنی
ساری چیزیں، یہ خس و خانہ بر قاب کہاں سے لائیں گے؟

ادھر سے سوال ہوا۔ ”آپ حاجی چراغ دین اینڈ سنز نہیں کیا۔“

ہم نے کہا۔ جی نہیں۔ کاش ہوتے۔

مڑک کر بولے۔ ”آپ نے پہلے کیوں نہ کہا۔ اچھے آدمی ہیں آپ۔“

اے مرد مجاہد

اخبار میں جلی حروف میں لکھا ہوا ایک مصرع نظر آیا

”اے مرد مجاہد تجھے پہچان گئے ہم“

پہلا تاثر تو یہی ہوا کہ مرد مجاہد کہیں روپوش تھا۔ ضرور کچھ کر کے بھاگا ہوگا (مثلاً جہاد وغیرہ) اور اب اسے پہچان لیا گیا ہے۔ بکرنے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ مگر غور سے پڑھا تو وہ ایک اشتہار کا عنوان نکلا کہ

”مجاہد بننے کے لئے مجاہد مارکہ بیزی پیجئے۔ خوشبودار پتیوں اور تازہ مسبا کو سے تیار کی جاتی ہے۔“

چند دن پہلے سٹی کی چین کے ایک چولہے کا اشتہار بھی دیکھا تھا۔ اس کے اوپر یہ مصرع تھا۔

”جہاد زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں“

نیچے ہدایت تھی کہ ہمیشہ مجاہد مارکہ بیزی پیجئے۔ استعمال کیجئے۔ پائدار ہوتے ہیں اور تیل کم خرچ

ہوتا ہے۔ نقاوں سے بچو وغیرہ۔

مجاہد کا تصور ہمارے ذہن میں پہلے تو نہ جانے کیا تھا۔ وہی ہوتا جو آپ کے ذہن میں ہے لیکن اب کسی مجاہد کا تذکرہ آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے یہ تصویر آتی ہے کہ لکوار بندوق وغیرہ اتار کر کھوٹی پرنا نگ رکھے ہیں۔ مجاہد مارکہ بیزی کان میں اڑس رکھی ہے اور اکڑوں بیٹھا مجاہد مارکہ چولھا جلا کر مجاہد مارکہ سویاں پکا رہا ہے۔

ہم نے ایک اخبار میں غالب مارکہ سائیکل کا اشتہار دیکھا تھا تو بھی یہی تصور ہنر تھا کہ غالب سائیکل اڑائے لئے جارہے ہیں۔ اور پیچھے اپنے لائق شاگرد میر مہدی مجرد کو بٹھا رکھا ہے۔ جوان کا دیوان پڑھتے اور معنی پوچھتے جارہے ہیں۔ حالانکہ قیاس کہتا ہے کہ غالب صاحب سائیکل چلانا نہیں جانتے تھے۔ سست الوجوہ تھے۔ فرغل پہنے تصور جاناں کیے لیے رہتے تھے۔ ایک وجدان کے سائیکل نہ چلانے کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک سائیکل ایجاد نہ ہوئی تھی۔

حکومت نے قائد اعظمؒ کے نام کے استعمال پر پابندی لگا رکھی ہے۔ کیونکہ ایک صاحب نے قائد اعظمؒ مارکہ نفیس اور مضبوط جوتوں کا اشتہار دیا تھا۔ اور ایک صاحب نے قائد اعظمؒ بوٹ پالش بھی نکال لی تھی جو چمڑے کو مضبوط اور چمکدار بنانے میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ یہ پابندی نہ ہوتی تو آج کل اس قسم کے اشتہاروں کی بھر مار ہوتی کہ اپنے باغ کے لئے قائد اعظمؒ مارکہ کھاؤ خریدیے۔ ہر قسم کے پودوں کیلئے مفید ہے۔ یا یہ کہ قائد اعظمؒ مارکہ اصلی میرے کا سرمہ استعمال کیجئے۔ دھند جائے کمرے وغیرہ کے لئے آرمود ہے اور بصارت کے علاوہ سیاسی بصیرت بھی بخشتا ہے۔ مولوی محمد بصیر صدر انجمن مجاہدین گولی مارکہ شوقیٹ بھی اس کے ہمراہ ہوتا کہ ”جب سے میں نے اس سرمے کا استعمال شروع کیا ہے دل میں حب الوطنی اور قوم کے لئے قربانی کا جذبہ بھٹھیں مارنے لگا ہے۔ ملک کے تمام دقیق مسائل بلا دقت سمجھ میں آنے لگے ہیں۔ اور نظر پر ایسا قابو ہے کہ چاہوں تو عید کا چاند رویت ہلال سے ہفتہ بھر پہلے دیکھ لوں اور نہ چاہوں تو لوگوں کو دو دو تین تین عیدیں کراؤں۔ مستقبل میں بھی جھانک سکتا ہوں مثلاً آج ہی بتا سکتا ہوں کہ کل جمعہ کا دن ہوگا۔

خیر قائد اعظمؒ نہ کسی علامہ اقبالؒ کے نام کے استعمال پر غالباً کسی قسم کی قدغن تا دم تحریر نہیں ہے۔ نہ ان کے اشعار اور مصرعوں کے برتنے پر پابندی ہے۔ لہذا ہم اس قسم کے اشتہار دیکھتے ہیں تو قطعاً تعجب نہیں ہوتا۔

”شکار مردہ سزا دل شاہ باز نہیں“

”علامہ اقبالؒ نے یہ بالکل سچ فرمایا ہے۔ ہر قسم کے زندہ تیر، تیر، تیر، مرغ، شتر مرغ وغیرہ خریدنے

کے لئے دکان نمبر ۱۱۴ پیرس مارکیٹ پر تشریف لائیے۔“

”کبھی سر بسجودہ جو میں ہوا تو میں سے آنے لگی صدا۔“

کہ ہر قسم کے جانماز اور دریاں وغیرہ جامی عید محمد ایڈ سنز بندر روڈ کے ہاں بارعامت مل سکتی

ہیں۔

”اے طائر لاہوتی اس رزق سے ہوت اچھی“

جو بھولو فلوو ملو ناظم آباد کے ہاں کا سپا ہوا اور کوٹے کرکٹ سے پاک نہ ہو۔ علامہ مرحوم آج زندہ

ہوتے تو ہمیشہ ہمارے ہاں کا آٹا استعمال کرتے۔

علامہ اقبالؒ مرحوم سے تو لوگوں کی عقیدت کا یہ حال ہے کہ پچھلے دنوں جوڑیا بازار کراچی کے ایک

لوہیے یعنی ہارڈ ویئر مرچنٹ نے اشتہار دیا تو اس کا عنوان بھی کلام اقبالؒ میں ڈھونڈا۔

”جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں“

نیچے رقم تھا کہ اپنی بھینسوں گائیوں کے باندھنے کے لئے علامہ اقبال مارکہ زنجیریں ہمارے ہاں سے خریدیے۔ اصلی فولاد کی ہیں اور ایسی مضبوط کہ ذوق یقین کے باوجود نہیں ٹوٹیں۔ غلط ثابت کرنے والے کو علامہ اقبال کی کتابوں کا ایک سیٹ جرمانے میں دیا جائیگا۔

آج کچھ فلموں کے بارے میں

ایک اخبار کے فلمی صفحے پر ایک عنوان نظر آیا۔ ”ہیزروفلن سازی کا نیاریکارڈ“ معلوم ہوا کہ ایک مشہور ہدایت کار نے ایک مشہور فلم ساز کی فلم دو مہینے میں بنا کر ڈال دی ہے۔ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے لیکن اس ہدایت کار کا نام اگرچہ اسی قافیے میں ہے لیکن کچھ اور ہے۔

۱۹۵۹ء میں ہم پہلی بار ڈھاکے گئے تو ہمیں نیو مارکیٹ کے قریب پارٹی ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ ہم نے پوچھا کیا یہ کیونٹ پارٹی کا دفتر ہے۔ اس کا شبہ کچھ نام سے ہوا کچھ اس عمارت کی بے سرو سامانی سے۔ لوگوں نے بتایا جی نہیں۔ یہ اسمبلی کی حکمران پارٹی کے ممبروں کے ٹھہرنے کو بنایا گیا ہے اور آپ یہ سن کر حیرت کریں گے کہ یہ پوری عمارت ڈوماء میں بنی ہے۔ ہم نے میزبانوں کے حسب فرمائش حیرت کی اور رید سے پھاڑ کر کہا اچھا؟ تھوڑی دیر میں ایک اور صاحب خاص یہ بات بتانے کو تشریف لائے کہ یہ عمارت دو مہینے میں تیار ہوئی۔ ہم نے پھر کہا۔ خوب ہے۔ کمال ہو گیا۔ لیکن جب ایک تیسرے صاحب نے آ کر کہا کہ حضرات کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ یہ پارٹی ہاؤس ڈوماء میں بنا تو کہنا پڑا کہ واقعی یقین نہیں کر سکتے کہ اس میں دو مہینے لگ سکتے ہیں۔ کیا ان کام چور انجینئروں اور مزدوروں کو کوئی سزا بھی ملی۔

اس تازہ نئی عمارت کے ایک کمرے میں ہم ابراہیم جلیس اور مشہور افسانہ نگار اے سعید فروکش ہوئے۔ اے سعید سے بے احتیاجی یہ ہوئی کہ بات کرتے کرتے اس پلنگ پر آ گئے جس پر ہم پہلے سے بیٹھے تھے۔ ترنخ کی آواز آئی اور وہ زمین پر آ رہے۔ خیر وہ اٹھ کر دوسرے پلنگ پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے کسی بات پر تہمتہ لگایا تو ان کا پلنگ بھی تاب نہ لاسکا اور بیٹھ گیا۔ ابراہیم جلیس چلائے ”ارے کیا ہوا؟“ یہ ان کی غلطی تھی، ان کو آہستہ بولنا چاہیے تھا۔ کیونکہ کمرے میں آہستہ بولنے کی سختی بھی لگی تھی۔ خراب کیا ہو سکتا تھا۔ ان کا پلنگ بھی شہید ہوا۔ ہمارے کہنے پر اور نیک چلتی کا مچلکہ داخل کرنے پر ہمیں ایک دوسرا کمرہ دیا گیا۔ جس میں نہایت آہستگی سے جا کر ہم اپنے اپنے پلنگ پر لیٹ گئے۔ بیچ میں کہیں کھانسنے کی ضرورت پیش آتی تو پلنگ سے اتر کر ان حوائج کو رفع کرتے تھے۔ پھر پلنگ پر جا کر

لیجے تھے۔

مقصود اس حکایت کا یہ ہے کہ کہیں لوگ فلم مذکور دیکھ کر بھی یہ نہ کہیں کہ ارے اس میں ایسی کون سی بات ہے جو ڈائریکٹر نے دوہینے لگا دیے۔ شاید اسٹوڈیو خالی نہ ملا ہو گا یا کوئی اداکار بیچ میں بیمار ہو گیا ہو گا۔

اخباروں کے مراسلات اور اداروں میں اکثر لکھا جا رہا ہے کہ ہماری فلمیں صحت مند رجحانات کی حامل ہونی چاہئیں۔ ہم خود آج کل کی فلموں کی بے راہ روی سے ناخوش ہیں۔ ممتاز حسن صاحب نے ایک بار لاہور میں فرمایا تھا کہ صحت مند ادب صحت مند ادیب ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے سامنے راسخ زنگلڈ کے احاطے میں اکھاڑ بھی کھدوا آئے تھے۔ فلموں کی اصلاح کی بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ پچھلے دنوں کسی صاحب نے ”رستم و سہراب“ نام کی ایک نئی فلم بنانے کا عزم کیا تو ہمارے ایک مشہور افسانہ نگار دوست بھاگے گئے کہ میں کہانی نکھوں گا۔ فلم ساز کوئی بڑے ہی بگڑے دل تھے۔ بولے میاں کہانی پہلوانوں کے متعلق ہے۔ تم نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی؟ ہمارے یہ دوست واپس آ گئے۔ اور غالباً عمر میں پہلی بار آئینہ دیکھا۔ لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ آج کل باقاعدہ نجی بادام کی ٹھنڈائی خالص پنجاب کے گھی اور دیگر مقویات کا استعمال کر رہے ہیں اور سر گھٹوا گلے میں تعویذ پہن صبح شام ڈنٹر پیٹیکس بھی لگا رہے ہیں۔ گانوں کے بارے میں ایسی کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ گیت نویسیوں میں کون ہے جو اپنے فن کا پہلوان نہیں اور محاورے اور عروض کو پختیاں نہیں دیتا۔ ہم نے تو ہمیشہ یہ دیکھا ہے کہ اس رنگل میں فتح ہمیں ہمیشہ گیت نویس کی ہوتی ہے۔ بحور و اوزان اور شاعری کے دیگر اصول و قواعد چاروں شانے چٹ نظر آئے۔

عام خیال یہ ہے کہ ہماری نئی پود میں ہتھیاریاں پائی جاتی ہیں یہ سب فلم کے راستے آئی ہیں۔ سنر بورڈ میں علماء و صلحا کو شامل کر کے دیکھ لیا گیا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ ہمارے ایک بزرگ کا کہنا ہے کہ تبدیلیاں بنیادی ہونی چاہئیں۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ ذرا وضاحت سے مثالیں دے کر واضح کیجئے۔ بولے۔ کہاں کے رہنے والے ہو تم؟ ہم نے بتایا کہ لاہور کہ ہمارا وطن مالوف ہونے کا شرف حاصل ہے۔ فرمایا تو پھر یوں سمجھو کہ فلم کا ہیرو لاہور میں تمہارے ملائے کا مثالی نوجوان ہونا چاہیے۔ تمہارے تین کئے، پمپ شوپنہ اور درو مال کا ندھے پر ڈالے موچھوں کو موم لگا کر تاد دیتا ہوا۔ یہ ہوتا چند دن میں دیکھ لو گے کہ تمام نوجوان یہی وضع بنا کر باہر نکلتے ہیں کہ نہیں۔ ہم نے کہا یہ تو ہیرو ہوا۔ ہیروئن کے متعلق بھی فرمائیے۔ بولے بہت ضرورت ہو تو ہیروئن کو لٹھے کا سیدھا سفید برقع پہنا کر فلم میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ہیروئن کی چنداں ضرورت نہیں فقط اس کے والدین کا ہونا کافی ہے۔ ہم

نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ پھر ہیر و عشق کس سے کرے گا۔ اور کہانی آگے کیسے چلی گی۔ بولے ساری خرابی تو عشق و عاشقی کی ہے۔ یہ غرب اخلاق باتیں فلم میں نہیں ہونی چاہیں۔ ہیر و کاسر پرست سیدھے سیدھے ہیر و ون کے والدین کے پاس جا کر کہے کہ عزیزی محمد رمضان کو اپنی فرزندگی میں قبول فرمائیے اور اپنی دختر نیک اختر کنیرفاطمہ سے اس کے نکاح کی تاریخ مقرر کر دیجئے۔ یہ ضروری ہے کہ ہیر و ہیر ون کے نام میڈی نہیں بلکہ شریفوں کے سے ہوں۔ لڑکی کے والدین زیادہ سے زیادہ یہ پوچھیں گے کہ

برخوردار کرتا کیا ہے۔ سوادھر سے جواب بالصواب ملے گا کہ گواہ میڈی میں دودھ کی دکان ہے۔ خوب چلتی ہے۔ اس کے بعد نکاح ہوگا۔ چھوہارے بیٹیں گے۔ اور فلم ختم۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ تو پانچ سات منٹ کی کہانی ہوگئی۔ اس سے کیسے کام چلے گا! فرمایا۔ عزیزم وقت کی قدر کر نی سیکھو۔ آج کل لوگوں کا ایک لمحہ قیمتی ہے۔ بیچ میں رقیب یا ظالم ساج کو لا کر شائقین کو ناحق دو ڈھائی گھنٹے تک سنیما ہال میں باندھے رکھنا کہاں کا انصاف ہے؟

ہم تو چپ ہو گئے لیکن ان بزرگ نے اپنا سلسلہ تقریر جاری رکھا اور کہا یاد رکھو۔ ہمیں ایسے ہیر و مطلق نہیں چاہئیں جو ٹھہرا کر آوارہ ہوں آوارہ ہوں کی ہانک لگاتے پھر میں یا بے سری آواز میں گھگھکیاں؟ یا رو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں ہمارے ہیر و کو تو چھاتی ٹھونک کر الٹے ہاتھ سے بکرا بلا کر یوں للکارنا چاہیے۔ ”اوتے پر بے ہٹ کے گل کر۔ اسیں لسی جیتی ہوئی اے۔“

فلسفہ حلقوں میں اس بات پر تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے۔ کہ نو جوان ایکسٹریس دھڑا دھڑ شادی کر رہی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ڈائریکٹر صاحب زر کثیر خرچ کر کے سیٹ کھڑا کرتے ہیں۔ اداکاروں کو مکالمے یاد کراتے ہیں اور اسپروں کو گولیاں کھاتے ہیں۔ اما بعد ہیر ون کے گھرا دی بھیجتے ہیں کہ شادی سے تشریف لائیں۔ تھوڑی دیر میں آدی جواب لاتا ہے کہ جی وہ تو ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے بیٹھی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ ان کی مانی صاحبہ نے یہ شادی کا کارڈ دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ ڈائریکٹر صاحب اور پروڈیوسر صاحب اس مبارک موقع پر ضرور تشریف لائیں اور بعد نکاح مسنونہ ماجھڑتا دل فرمائیں۔ زیادہ بھاری تحفہ لانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں کیسرہ مین موجود ہو تو اس کو ہمراہ لا کر اس موقع کی ایک فلم ضرور کھینچ لیں۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے ان دو تین سال میں کتنے ہی فلمی ستارے شادیاں کر کے آفتاب بن گئے۔ اگر ہم پوچھیں کہ مس بدرمیر کہاں گئیں، آج کل فلموں میں نظر نہیں آتیں، تو جواب ملتا ہے کہ جناب وہ ایک ٹھیکیدار سے شادی کر کے بالکل بی بی نیک پروین بن گئی ہیں۔ پابند صوم و صلوة ہیں۔ کشیدہ کاری سے شغف ہے۔ میاں کے کپڑے خود دھوتی استری کرتی ہیں۔ حج کے لئے تاج دے رکھا ہے اگر قرعہ نکل

آئے تو۔

اگر یہی قحط الرجال جاری رہا تو فلسا زوں کو لنڈے بازار اور جو ناماریٹ کے مال پر گزارہ کرنا پڑے گا۔ کوئی دن میں اسنوڈیو میں یہ منظر نظر آیا کرے گا کہ ہیر و کوآواز پڑی ہے تو لڑکا جواب لاتا ہے کہ جی وہ تو میک اپ روم میں بیٹھے خضاب لگوار ہے ہیں۔ اور اپنی توند پر پٹی بندھوا رہے ہیں۔ ہیر وکن کی ڈھنڈیا پڑتی ہے تو تھوڑی دیر میں وہ لاٹھی ٹپکتی برآمد ہوتی ہیں۔ ڈائریکٹر کہتا ہے۔ کیوں بی دیر کیوں ہوئی۔ تو فرماتی ہیں بیٹا کیا کروں۔ بتیسی ٹھیک کرانے کے لئے حندان ساز کے پاس بھیج رکھی تھی۔ کم بخت ٹھیک کام نہیں کرتا۔ آئے دن کوئی خرابی ہو جاتی ہے۔ چند دن میں پتہ چلتا ہے کہ نقل سماعت کا عارضہ بھی ہو گیا ہے۔ اداکاروں کو ہدایت کرنی پڑتی ہے کہ ہیر وکن سے خطاب کریں تو مکالمے ذرا بلند آواز سے بولیں۔ گنج کی کوئی ایسی بات نہیں۔ وگ سے ڈھانپا جاسکتا ہے۔ آواز بہر صورت پلے بیک ہوتی ہے اور اس میں رعشے کا اثر آنے کا اندیشہ نہیں۔ وگن کو آنے کو دیر ہوتی ہے تو ریاقت ہوتا ہے کہ جوڑوں کے درد میں پڑا ہے۔ سانس کی تکلیف بھی ہے۔ کیا کرے یک پیری و صدمہ ب۔

ہمارے ایک فلسا دوست نے اس صورت حال میں اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ جس میں بقول ان کے دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے۔ ہوا یہ کہ فلم کی کاغذی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد جس میں چنداں وقت پیش نہیں آتی۔ کیوں کہ کہانی اور گانے ان کے اپنے تھے۔ انہوں نے ہیر و ہیر وکن کے بھاؤ پوچھے۔ ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی جب معلوم ہوا کہ مس معرکہ آرا چالیس ہزار روپے سے کم نہیں لیتیں۔ مس چراغ رخ زیبانے کہا کہ میں اگلے پانچ سال تک آنے والی فلموں کے لئے بک ہوں۔ تاہم میں ہزار روپے ایڈوانس ملے تو غور کروں گی۔ مشہور قاصد مس بی جھالو نے عذر شرعی کیا کہ اب میں پردہ نشین ہو گئی ہوں۔

فلم کی بات بیسوا جانیں ہم بہو بیجیاں یہ کیا جانیں

ذبیحہ بیگم اپنے بڑے لڑکے کی شادی کے انتظامات میں مصروف پائی گئیں۔ مس ثانی کا نواسہ بیمار تھا۔ ہیر وکن میں میاں خرگوش کمار کا بھاؤ بہت تیز نکلا۔ سنا کہ فقط بونس واؤ چرپل سکتے ہیں۔ ناچار ان دوست نے فیہ لہ کیا کہ وہ اپنی بیوی کو برقع پہنا کر فلم میں ہیر وکن لائیں گے۔ اس کے لئے کہانی اور

سینار یو میں کچھ ترمیم کرنی پڑی جس کے لئے محلے کی مسجد کے خطیب مولوی عبدالولی عاصمی سے خاصی مدد ملی، جو ایک شعلہ طراز ادیب ہیں اور مولوی فاضل کی سندر رکھتے ہیں۔ ہم نے منظر نامہ دیکھا ہے۔ نام قلم کا ”حیا کی بیٹی“ ہے۔ اگرچہ مولوی عاصمی صاحب مصرعے کہ اسے بنت مومن کہا جائے۔ ساری قلم میں ہیروئن نہ برقع اٹھاتی ہے نہ کسی نامحرم سے کلام کرتی ہے۔ کبھی کبھی سر ضرور ہلاتی ہے۔ ہیرو کا کام ہمارے قلم ساز دوست خود کریں گے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں کیوں کہ حسن صورت ایک اضافی چیز ہے۔

اصل چیز حسن سیرت ہے، جس سے یہ مالا مال ہیں۔ پھر کہانی میں عشق کے اجزا نکسر خارج کر دیئے گئے ہیں۔ سارا وقت مسئلے مسائل پر گفتگو رہتی ہے۔ ہر شے کا اختتام اذان کی روح پر دروازہ پر ہوتا ہے جسے سنتے ہی ہیرو لوٹا اٹھا کر کہتا ہے۔ اچھا تو محترمہ اب میں چلا نماز کو پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ ہیروئن کی سہیلیاں اور سکھیاں بھی برقعوں میں ملبوس ہیں اور دن تک کے چہرے پر داڑھی اور آنکھوں میں سرسے کی تحریر ہے۔ گائے اس قلم میں نہیں ہیں۔ نہاں دو تین جگہ قوالی ضرور ہے۔ ہمارے دوست کو امید ہے کہ یہ قلم تدبیریں طبقوں میں نہایت مقبول ہوگی۔ رسالہ فاران کراچی۔ رسالہ تجلی دیوبند اور رسالہ ترجمان القرآن میں اس کا پتہ در پے اشتہار دیا جائے گا اور مسجدوں کی دیواروں پر پوسٹر لگائے جائیں گے۔

فلم دیکھئے اور ثواب دارین حاصل کیجئے صوفیہ بانو کی اگلی فلم — وحدت الوجود

لاہور کے حکام پر ایک سہانی صبح یک لخت یہ انکشاف ہوا کہ سینما والے عریانی پھیلا رہے ہیں۔ تو یہ تو بے اس اسلامی مملکت میں ایسا کام؟ ایسا ایسا چار؟ پورا پیادے دوڑائے گئے، منادی کرا دی گئی کہ اب تک بو ہوا سو ہوا۔ آئندہ کے لئے بے حیائی بند ہونی چاہے ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ پولیس والوں کی ڈیوٹی نگائی گئی کہ جہاں کوئی عریاں خلاف تہذیب یا منافی اخلاق بورڈ سڑک پر نظر آئے اسے اتار لو۔ باقی کاروائی اس کے بعد کی جائے گی۔ پولیس والے چور پکڑتے پکڑتے بلکہ نہ پکڑتے پکڑتے تنگ آ گئے تھے، الکساہٹ میں جمائیاں لے رہے تھے۔ ان کو ایسا کام خدا دے۔ دیکھتے دیکھتے خلاف شرع بورڈوں کا ڈھیر لگ گیا۔ میٹرو روڈ اور ایبٹ روڈ وغیرہ صاف ہو گئیں، معاشرہ آلود گیوں سے پاک ہو گیا۔ ہر طرف تہذیب و اخلاق کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ نیکی کا نور پھیل گیا۔

اب ان بورڈوں کا جائزہ شروع ہوا۔ طرم یعنی فلموں والے بھی موجود تھے۔ صدر عدالت باز ہلا۔ گواہ عشق طلب ہوئے۔ صدر عدالت نے انصاف کی ترازو ہاتھ میں تھی اور پوچھا۔
”تھانیدار جی۔ یہ بورڈ آپ نے کیوں اتارا۔ وجہ بیان کیجئے۔“
حضور اس میں عورت کی ٹانگیں نکلی دکھائی گئی ہیں۔“
”چچ چچ۔ بری بات۔ ہاں میاں فلم دین تم نے ایسا خرب اخلاق بورڈ کیوں لگایا۔“
”حضور عالی جاہ۔ یہ انگریزی فلم ہے۔ اس میں جیسی ٹانگیں ہوتی ہیں، ویسی نام بنے بورڈ پر بنادیں۔“

”ہاں بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ تھانیدار جی یہ تو انگریزی فلم ہے۔ اس میں ٹانگیں کیسے بدن جاسکتی ہیں۔“

”عالی جاہ جب ریوگ انگریزی فلم کا نام بدل لیتے ہیں FOREVER REMEMBER

کو ”منڈیا لکھوٹا“ کا نام دے کر دکھاتے ہیں تو ناگئیں کیوں نہیں بدل سکتے۔ خیر ناگئیں بدلنے کی ضرورت نہیں۔ پاجامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ شلوار پہنائی جاسکتی ہے۔ نگلی ناگوں سے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔“

”آپ کے جذبات مشتعل ہوئے۔“

”جی میرے جذبات؟ میرے؟ حضور نہیں عوام کے جذبات کی بات کر رہا ہوں۔“

”میاں فلم دین، تھانیدار صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ ان ناگوں پر شلوار ہونی چاہیے۔ انگریزی غیر انگریزی کی بحث میں ہم نہیں پڑتے۔“

”حضور تھانیدار جی ٹھیک کہتے ہیں اور آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ بورڈ پر تو میں شلوار پہنا دوں گا، لیکن فلم کے اندر صوفیہ لورین کو کیسے پہنا دوں؟ اس نے نہ پہنی تو“

”صوفیہ لورین؟ اس کا مطلب ہے۔ آپ کی فلم میں چوما چائی بھی ہوتی ہوگی۔ آپ کو شرم نہیں آتی چوما چائی کی فلمیں دکھاتے؟“

”حضور پاکستانی فلمیں دکھاتے وقت شرم آتی ہے۔ اسی لئے فی الحال پاکستانی فلموں میں چوما چائی نہیں دکھاتے۔ انگریزی امریکی فلموں میں البتہ حضور آپ اتنے پاجامے کہاں سے لائیں گے۔ ان فلموں کی درآمد کیوں نہیں روک دیتے۔“

”چپ ہم کو پالیس کے معاملوں میں غل دینے کو کس نے کہا۔ ہاں تو تھانیدار صاحب دوسرا بورڈ دکھائیے۔ ہاں اس میں کیا ہے۔“

حضور خود ہی دیکھ لیجئے۔

جوش ملیح آبادی کی زبان میں جیسے گدہ فرامانہ۔“

”بہت خرمناک بات ہے۔ دور کرو اسے میری آنکھوں سے۔ حذر! ٹھیکہ زور دیکھ لوں۔ تصدیق کروں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کیوں میاں فلم دین۔“

”جناب میں کیا عرض کروں۔ آپ عورتوں سے فلموں میں کام کروائیں گے۔ تو عورتیں تو ایسی ہی ہوتی ہیں۔ مردانہ اور زنانہ جسم میں فرق ہوتا ہے۔“

”میاں فلم دین تم یہ ہمیں بتا رہے ہو؟ ارے ہم سے زیادہ کے معلوم ہوگا۔ لیکن فلموں میں بس سپاٹ سپاٹ جسم دکھایا کرو تا کہ بے خیالی نہ پھیلے۔ اچھا اب آپ جاییں۔ آپ تو ایسٹنر وڈ کے ہیں نا اب یہ کلوڈ ر وڈ کے تھانیدار کو بلائیے۔“

”مختصر سلام“

”سلام آپ تو حاجی معلوم ہوتے ہیں؟“

”جی میں حاجی ہی ہوں۔“

”پھر تھانیدار کیسے بنے ہیں۔“

”جناب اگر تھانیدار نہ ہوتا تو جج کیسے کرتا۔ اتنے مسائل کہاں سے لاتا۔“

”آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کھائیے آپ نے کونسا بورڈ آٹا دیا ہے۔ ہاں تو

بورڈ میں کیا ہے۔“

”جناب یہ ٹنگلی دنیا کا بورڈ ہے۔ اس میں بیروئن کے پاؤں ٹنگے دکھائے گئے ہیں۔“

”اس پر کیا اعتراض ہے۔“

”جناب والہ۔ بعض لوگوں کے دل تو ٹنگے پاؤں دیکھ کر بھی پامال ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹی نقطہ

نگاہ سے بھی مضرب ہے۔ ٹنگے پاؤں پھرے سے زکام ہو جاتا ہے۔“

”حاجی صاحب۔ آپ اس وقت صرف اخلاقی نقطہ نظر سے بات کریں۔ یہ دوسرا بورڈ آپ

نے کیوں اُتر دیا۔ اس میں تو پاؤں بھی ٹنگے نہیں ہیں۔ بیروئن نے دستانے تک پہن رکھے ہیں۔ فقط چہرہ کھلا ہے۔“

”حضور ساری خرابی تو چہرے ہی کی ہے۔ جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔ عورتوں کو مزید ہانپ

کر فلم میں آنا چاہیے۔“

”بے شک۔ یہ اشتہار کس فلم کا ہے؟“

”یہ تبت سزکا ہے جی۔“

”یہ کس کی فلم ہے کس سنیہا میں چل رہی ہے؟“

”جناب یہ تو مجھے معلوم نہیں میں فلمیں نہیں دیکھتا۔ سزکا پر بورڈ نظر آیا کھ اڑ گیا۔“

”بہت اچھا کیا آپ نے۔ آپ کو تندر شجاعت دینا چاہیے۔ عدالت برخواست۔“

بات بورڈوں سے شروع ہوئی ہے۔ ابھی فلموں تک نہیں پہنچی، بس پہنچنے ہی والی ہے۔ سنا ہے

ریاض شاہد کی فلم غرناطہ کے بارے میں سنسور بورڈ کو تامل ہے کہ اس میں رقص کیوں ہیں، کہانی مجاہدانہ ہے

بلکہ بہت ہی مجاہدانہ جس کے لئے جناب نسیم حجازی کا نام ضمانت بلکہ ناقابل واپسی ضمانت کے طور پر پیش

کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غرناطہ میں اعلامی سلطنت تھی تو لوگ سارا وقت سر پر خود رکھے، کشمیر کو بے

یام کہے حق اللہ کے نعرے لگاتے پھرتے ہوں۔ گے۔ کوئی دکانداری کا ہے کہ کوکر با ہوگا اور تفریح کا کیا سوال ہے۔ بے قص تو بہت معیوب چیز ہے۔ یہ جو کسان لوگ فصل کٹنے کے بعد بھنگڑا ڈالتے ہیں۔ بعض متین حضرات کو ہم نے اس پر بھی اعتراض کرتے دیکھا ہے اور عورتوں کے قص کی تو پھر بات ہی اور ہے۔ ہم کئی بار عرض کر چکے ہیں کہ جھوٹی چھوٹی اصلاحیں کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اصلاح پوری ہونی چاہیے۔ اسلامی مملکت میں فلم بنے تو اس میں شراب اور شرایین کے سین کا کام کیا لوگ ایسی پیس کہ ہمارا قومی شروب ہے اور اس کے بعد مونچھیں صاف کرتے اور ڈکار لیتے ہوئے الحمد للہ بھی کہیں تو اور مناسب

ہے۔ میں آوارہ ہوں آوارہ ہوں قسم کے گانے اور غنڈہ گردی کے سین ہیر و رن پر حملے خواہ وہ غیر مجرمانہ ہی کیوں نہ ہوں، آخر کہاں ہماری تہذیب کا حصہ ہیں۔ چھی۔ چھی۔ بری بات اور ہم تو کئی بار یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ عشق و عاشقی کو فلموں میں سے نکال دیجئے۔ ساری قابل اعتراض باتیں نکل جائیں گی۔ ہیر و رن ہیر و رن کو مچکے داموں محض اس لئے فلم میں ڈالنا پڑتا ہے کہ عشق کریں اور ولن بھی تاکہ اس عشق میں کھنڈت ڈالیں۔ اب جبکہ ہماری فلمی صنعت کے اکثر لوگ حاجی ہو چکے ہیں۔ ہماری اس گزارش پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ جو لوگ مصر ہیں کہ رومانی مناظر کے بغیر فلم نہیں بن سکتی ان کی تالیف قلب کے لئے ہمیں ایک دوست کا یہ مشورہ پسند آیا کہ سارے رومانی سین تو رکھے جائیں فقط اس وقت کمرہ بند رکھا جائے۔

پچھلے دنوں اداکارہ صوفیہ بانو ٹیلیوژن کے ضیائی الدین شو میں آئی تھیں۔ ضیا صاحب نے ان سے پوچھا کہ بی بی آپ کو کس چیز سے دلچسپی ہے۔ انہوں نے فرمایا تصوف سے۔ اس جواب کو سن کر بعض دیکھنے والوں کو حال آ گیا اور انہوں نے بال کھول کا سر پختا شروع کر دیا حالانکہ تصوف کا مطلب فقط قوالی نہیں ہے۔ صوفیہ بانو کو تصوف کی چاٹ کیسے پڑی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح کسی شخص کو اور کوئی کام نہ ملے تو بیر۔ ایجنسی کرنے لگتا ہے۔ یہ بھی نہ ہو تو ادیب بن جاتا ہے۔ اس طرح صوفیہ بانو کو بھی فلمیں نہ ملتی ہوں گی۔ لہذا اب ثبانی دنیا پر غور کرتے کرتے صوفی بن گئیں۔ ہماری اطلاع ہے کہ ان کی مانگ۔ تو فلم انڈسٹری میں ہے لیکن وہ اب عشق مجازی کی فلموں میں آنے کو تیار نہیں۔ انہوں نے اپنی ذاتی فلم کا اعلان کر دیا ہے۔ جس کا نام ”وحدت الوجود“ ہوگا۔ یہ فلم عام سینماؤں میں نہیں بلکہ فقرا کے تکیوں اور صوفیائے کرام کی درگاہوں پر دکھائی جائے گی۔ اس میں عشق و شوق نہیں دکھایا جائے گا۔ بلکہ وہ کلن قوال بریلی والے کی سنگت میں حال کھیلیں گی۔ جزاک اللہ۔ فلم دیکھنے والوں کی لنگر سے تواضع الگ کی جائے گی۔

بات بورزوں سے چلی تھی۔ کوٹھوں چڑھ گئی۔ یعنی فلموں تک پہنچ گئی۔ اصل میں یہ بورڈ اور اشتہار بھی جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ آئندہ اشتہار میں تصویریں، روشنیوں اور بانگوں وغیرہ کی دینی چاہئیں اور تعریف میں اس قسم کے جملے ہونے چاہئیں۔

فلم ”غذائے روح“

ڈائریکٹر: قدوة السالکین سجادہ نشین درگاہ نوگڑے پیر۔

ایسی جذبات کو ٹھنڈا اور طبیعت کو افسردہ کرنے والی فلم آپ نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔

فلم: نور معرفت

فتح علی مبارک علی پروڈکشنز کی نئی پیش کش۔ فلم دیکھیں اور ثواب دارین حاصل کریں۔

فلم: نقش سلیمانی

عام کامل بابا گائے شاہ کا نیا شاہکار

یہ فلم دیکھئے اور امتحان، مقدمے، روزگار اور دوسری پریشانیوں سے نجات حاصل کیجئے۔ اس

فلم کا ٹکٹ تعویذ کا کام دے گا۔ فلم دیکھنے کے بعد ٹکٹ بازو پر باندھ لیجئے۔

فلم مائی کا لال سنسر ہوتی ہے

پچھلے دنوں فلم سنسر بورڈ نیا بنا ہے اور اچھا بنا ہے۔ اس میں کچھ علما بھی شامل ہیں جن کو دیے کبھی فلم دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ پہلی بار یہ دیکھ کر حیران بھی ہوئے کہ تصویریں بھی چلتی پھرتی اور بولتی ہیں۔ آخر ہمارے ملک میں ایک بڑی آبادی ہے جو فلم نہیں دیکھتی ان کی نمائندگی بھی ضروری تھی۔ پھر بہت سے لوگ ایسے ہیں جو فلم دیکھتے ہیں لیکن اس کی سمجھ نہیں رکھتے۔ ان کی نمائندگی کے لئے ایسے لوگ بھی سنسر بورڈ میں رکھے گئے ہیں تاکہ اس کی ہیئت زیادہ سے زیادہ جمہوری ہو جائے۔ اب بظاہر کسی کو شکایت کا موقع نہ ہونا چاہیے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اب بھی کچھ لوگ اس کی تشکیل سے مطمئن نہیں۔ ان میں ایک تو خیر ہم خود ہیں۔ دوسرے راولپنڈی کے ایک حکیم صاحب ہیں۔ جنہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ ایک حکیم کو بھی سنسر بورڈ میں شامل کرنا چاہیے۔ کیونکہ فلموں میں حکیم کا کردار بڑے قابل اعتراض انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ بڑھاپا، بیوقوف، سکی وغیرہ سنسر بورڈ میں کوئی حکیم ہوگا تو اس قسم کی شرارت کا تذکرہ تو کر سکے گا۔

حکیم صاحب نے تذکرہ کا اچھا نسخہ بتایا ہے۔ یعنی سنسر بورڈ میں ایک حکیم ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن ٹھہریے۔ حکیم بے تو ایک ڈاکٹر بھی چاہیے۔ ورنہ تو فلم والے اپنی فلموں میں ڈاکٹر موٹو قسم کے کردار بھر دیں گے۔ اب ہو میو میٹھی بھی تسلیم ہے۔ لہذا ایک ہو میو پیٹھ کو بھی نکس دامیکا کی شیشی لئے سنسر بورڈ میں موجود رہنا چاہیے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ایک سلوتری بھی ہو تو تین مناسب ہے۔ آخر فلموں میں انسان نہیں جانور اور مویشی بھی تو کھائے جاتے ہیں۔ دوسرے اہل حرفہ بھی نمائندگی کے مستحق ہیں۔ ایک بار خاکر دو بوں کو شکایت پیدا ہوئی تھی کہ فلمیں صاف ستھری نہیں بنتیں۔ لانڈری والوں نے بھی مطالبہ کیا تھا کہ ہماری فلمیں بے داغ ہونی چاہئیں۔ نمائش سے پہلے ہمیں دی جائیں تاکہ ہم انہیں ڈرائی کلین کر دیں۔ جاٹ حضرات بھی ایک فلم کا نام بدلوا چکے ہیں۔ وہ جو جی تھی آخر جی بن کر رہ ملیز ہوئی۔ آئندہ بھی غلطی کا احتمال ہے۔ لہذا لازم ہے کہ ایک جاٹ بھی سنسر کے وقت کھاٹ ڈالے سنسر بورڈ میں مستقل بیٹھا

ہو۔ جہاں کوئی بات خلاف مزاج پائی۔ وہیں اس نے فلم پروڈیوسر کے دھول جھانی۔

بارہ حضرات کی یونین چونکہ زیادہ مضبوط ہے اس لئے وہ اپنے حقوق کے بارے میں زیادہ خبردار رہتے ہیں۔ وہ کئی بار شکایت کر چکے ہیں کہ فلسازان کے اچھے خاصے پیسے کی محض اپنی تفریح طبع کے لئے حجامت کر دیتے ہیں۔ لہذا آدمی کوئی ان کا بھی دم تحریر ہونا چاہیے یعنی سنسر بورڈ کے اندر۔ جہاں کسی سین میں بال برابر بات قابل اعتراض نظر آئی۔ انہوں نے قہنچی چلائی۔ یاد رہے کہ کسی بار برکورکن بنانے میں سنسر بورڈ کا خرچ بھی بچے گا۔ اس کے لئے قہنچی خریدنی نہیں پڑے گی۔ اس کے اپنے پاس ہوتی ہے۔ ہمارے ان بھائیوں کی چوکی فلموں تک محدود نہیں۔ اردو کی کسی درسی کتاب میں کسی شاعریا قافیہ پیتانے لکھ دیا تھا۔ ”نائی آیا ہے چار پائی لایا ہے“ اسلام سلمانی صاحب نے فوراً اعتراض کیا کہ چار پائی لانا نائی کام نہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ والوں کو یہ فقرہ خارج کرتے ہی بنی۔ اس کی بجائے غالباً یہ فقرہ رکھوایا گیا، ”ہیر ڈر لیر آیا ہے“ سیٹھی ریزر لایا ہے۔“

پس ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک وقت آتا ہے، جب کہ سب طبقوں کی نمائندگی سنسر بورڈ میں ہو جاتی ہے تاکہ فلم پر کسی کو اعتراض نہ رہے۔ لیجئے فلم ”مائی کالال“ عرف طوفان محبت“ سنسر ہونے کے لئے تیار ہے۔ ہال پورا بھرا ہے۔ یہ دو ڈھائی سو آدمی تماشاں نہیں سب کے سب فلم سنسر بورڈ کے ممبر ہیں۔ ادھر ایک وکیل صاحب ہیں۔ ایک منشی جی بھی کان پر قلم رکھے تشریف فرما ہیں۔ ایک تھانیدار بھی جھٹکری لئے موجود ہیں۔ ایک پٹواری بھی اپنے بستے سے ٹیک لگائے منتظر ہے۔ ایک سینٹھ صاحب ہیں۔ ایک سودخور کا بلی بھی سائیکل لئے موجود ہے حتیٰ کہ ایک طرف انچیوں کا نمائندہ بھی افیم کی مشتری لئے اور گنڈیریاں رومال میں باندھے بیٹھا ہے کیونکہ فلم والوں کو اور کوئی نہیں ملتا تو انہی کا مذاق اڑا دیتے ہیں۔ اب کے کسی فلساز کی فلم میں ایسا سین سکرین پر آیا، ادھر اگر یہ اس وقت پینک میں نہ ہوئے تو انہوں نے فلساز کے قردلی بھونکی۔ گیدی کہیں کا بھہر تو۔

اچھا اب باتیں بند کیونکہ فلم شروع ہو گئی ہے۔ لیجئے لڑکی یعنی بہروتن اٹھلاتی ہوئی پانی بھرن کو چلی۔ پانی بھرن کا تو بہانہ ہے۔ آج کل دیہات میں بھی نلکے لگے ہوئے ہیں۔ مقصود اس کا ہیر و کو منہ دکھانا ہے۔ یک لخت آواز آتی ہے۔ ”بھہرورو کو فلم“ یہ فلم نہیں چل سکتی۔“ جی جلا کر دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب گل مچھوں والے کھیس کی بکل مارے گھونسا تانے کھڑے ہیں اور بنکارہے ہیں۔ ”کس بد ذات

نے بتائی ہے یہ فلم۔ ”یہ صاحب والدین کے نمائندے ہیں اور فرما رہے ہیں۔“ ارے ہماری لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں؟ اجنبیوں سے چھپ چھپ کر ملتی ہیں۔ ارے کچھ حیا شرم کرو۔ کیا تمہاری بہو بیٹیاں نہیں ہیں؟“ فلما زود وعدہ کرتا ہے کہ جی اچھا یہ سین میں نکال دوں گا۔ اصلاح کر دوں گا۔ فلم آگے چلتی ہے۔ لشکر اولن ہیروئن پر دست درازی کرنا چاہتا ہے۔ وہ عنف کی پتلی وار خالی دیتی ہے بلکہ اس کا کتاؤن کی ٹانگ کاٹ لیتا ہے۔ ورنہ سے کچھ اور تو ہوتا نہیں۔ کیسا ناہوکرا ایک ڈنڈا کتے کے رسید کرتا ہے۔ چیاؤں چیاؤں چیاؤں

یک لحنت ہال میں ایک کڑکا بلند ہوتا ہے ’بلے، بلے، بلے، بلے، بلے‘ لائحہ جلا کر دیکھا۔ یہ ولنوں کے نمائندے تھے۔ جن کو ایک زمانے سے شکایت تھی کہ فلموں میں ولن کا کردار اچھے معنوں میں نہیں پیش کیا جاتا۔ نمائندے صاحب نے الٹا ہاتھ منہ پر رکھ کر کہا بلایا اور لاکارا۔۔۔“ اوکڑھو فلما زونوں کتے آ۔ میں ابدی ات بھن دیاں گا۔ میں ایسی فلموں اگ لگا دیاں گا۔ ”بڑی مشکل سے ان کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اعتراض ان کا ٹھیک ہے۔ ہماری فلموں میں ولن کو عموماً بد معاش یا غنڈہ دکھایا جاتا ہے۔ اکثر تو اسے ہیرو کے ہاتھوں مار کھاتے بھی دکھاتے ہیں جو دل آزار ہونے کے علاوہ خلاف حقیقت بھی ہے۔ کیونکہ اصل زندگی میں عموماً ہیرو مار کھاتا ہے۔ ولنوں کے نمائندے کو یہ بھی اعتراض ہوا کہ فلم میں ہیروئن کی شادی ہمیشہ ہیرو کے ساتھ کی جاتی ہے حالانکہ ولن کے ساتھ ہونی چاہیے، جیسا کہ اصل زندگی میں ہوتا ہے۔ پھر کسی شخص کو بین کاح کے وقت رنگ میں بھنگ ڈالنے کی اجازت بھی نہ دینی چاہیے کہ نمبر ڈی شادی نہیں ہو سکتی۔ کیوں بھٹی کیوں نہیں ہو سکتی؟ ہیرو میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ جب ہیرو کے ساتھ کاح ہو سکتا ہے۔ تو ولن کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بھی تو انسان ہے۔ وہ بھی تو مسلمان ہے۔۔۔؟

لن نمائندے کا اعتراض بھی نوٹ کیا جاتا ہے۔ معقول بات سے کون اختلاف کر سکتا ہے۔ اب فلم آگے چلتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اتنے میں دوسری طرف سے ایک صاحب ہاتھ کھڑا کرتے ہیں کہ ٹھہریے۔ نام پتہ لکھائیے؟ آپ کون؟ میں محکمہ انسداد بے رحمی حیوانات کا نمائندہ ہوں۔ جناب آپ لوگوں نے کیا سمجھ کر اس معصوم کتے کے لاٹھی جمائی۔ لکھوائیے پروڈیوسر صاحب اپنا نام پتہ ولدیت

سکونت۔ آخر پروڈیوسر یہ وعدہ کر کے چھوٹتا ہے کہ یہ سین بھی نکال دیا جائے گا۔ سیٹھوں کا نمائندہ وہ تمام فقرے اور سین نکلوا دیتا ہے جس میں پیسے والوں پر طنز کا پہلو ہے کیونکہ ساری خرابیاں طبقاتی شعور ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیب کتروں کا نمائندہ اس سین پر اعتراض کرتا ہے جس میں ہیر کی جیب کٹ جاتی ہے۔ اس کا اعتراض بھی بجا ہے۔ اس قسم کے مناظر سے ایک خاصے بڑے طبقے یعنی جیب کتروں کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عداوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ فلم پروڈیوسر یہ اعتراض نوٹ کرنے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو اپنا پارکر چین غائب پاتا ہے۔ جیب کتروں کا نمائندہ چین اس کو واپس کرتے ہوئے کہتا ہے۔ اب تو ثبوت مل گیا نہ کہ جیب کترے بھی شریف آدمی ہوتے ہیں۔

ان مراحل سے گذر کر ہم فلم کے آخری سین پر آتے ہیں اور سنسر بورڈ یہ حکم دینے کو تیار ہوتا ہے کہ یہ جو چند مناظر نندی نالوں اور چوپال کی گپ شب اور دہمن کے سولہ سنگار وغیرہ کے بلا اعتراض ردہ گئے ہیں، ان کو پاس کیا جاتا ہے کہ اتنے میں ایک صاحب آنکھوں میں لپ لپ سرمہ، کاندھے پر رومال پہلے ہاتھ کھڑا کرتے ہیں، پھر خود اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں ”حضرات میں ہوں انجمن اصلاح اخلاق کا نمائندہ۔ میں فلم بنانے کے کاروبار کو سراسر خلاف شرع سمجھتا ہوں۔ بند کیجئے فلم اور فلسا زوونوں کو ڈبے میں۔ کیا یہ ملک اس لئے بنایا گیا تھا کہ یہاں فلمیں بنیں؟“

رباعی سے رکابی تک

کیا مرد واقعی ست اور بے سلیقہ ہوتے ہیں؟ ہمارے اس سے اختلاف یا اتفاق رائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ عمومی رائے یہی معلوم ہوتی ہے۔ اسی صفحے پر آپ ایک کارنوں دیکھیں گے۔ میاں نے لمبے ڈنڈے والے جھاز سے فرشوں کی صفائی کرنے کے بعد باورچی خانے میں بہت سی پلیٹیں دھولی ہیں۔ لیکن ابھی کچھ باقی بھی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میں میاں نے کچھ زیادہ دیر لگا دی ہے کیونکہ بی بی پہلے اپنے کمرے میں بیٹھی ریڈیو سنتی رہیں۔ پھر ڈرائنگ روم میں رسالوں میں تصویریں دیکھتی رہیں۔ آخر اس سے بھی اتنا لگیں۔ کارنوں میں وہ میاں سے کہہ رہی ہیں۔ ”فورا جلدی کام کیا کرو جی! میرا بھی کچھ خیال ہے؟ کتنی دیر سے اکیلی بیٹھی بور ہو رہی ہوں۔“

یہ مسئلہ بہت سے گھروں کا ہے۔ مرد لوگ گھر کی صفائی، چائے بنانے، برتن دھونے وغیرہ میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ بیویاں عاجز آ جاتی ہیں۔ اکثر دیکھا ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ بیوی بستر میں پڑی ہیں، میاں چائے دانی بھر کر ان کے بستر کے پاس کی میز پر رکھ تو گئے لیکن پھر جا کر فرش رگڑنے لگے یا ناشتہ بنانے لگے۔ اتنا خیال نہیں کہ چائے بنا کر بھی دینی ہے۔ ادھر بیوی ایک ہاتھ سے اخبار تھامے اسے پڑھ رہی ہیں۔ دوسرے سے سر کھج رہی ہیں۔ ان کا کوئی ہاتھ خالی ہوتا تو شاید خود ہی بنا لیتیں۔ میاں صاحب ناشتہ بنا کر بچوں کو نہلانے اور کپڑے بدلنے میں جٹ جائیں گے۔ اور پھر اپنے اور بیوی کے جوتے پالش کرنے کے بعد انکو دفتر جانے کی جلدی پڑ جائے گی۔ شام کو آتے ہی باورچی خانے میں جا گھسیں گے یا غسل خانے میں بیٹھ کر بچوں کے کپڑے دھوئیں گے۔ اس سے فارغ ہوئے تو کچھ سلائی کا کام لے بیٹھیں گے۔ قمیضوں کے بٹن ٹانک رہے ہیں، جرائیں رٹو کر رہے ہیں۔ گلدان ہجار ہے ہیں۔ گواہر چیز کا خیال ہے۔ نہیں خیال تو بیوی کا جو اپنے کمرے میں پڑی برابر ریڈیو سن رہی ہیں یا مے حل کر رہی ہیں اور بور ہو رہی ہیں۔ میاں سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آ کر ان کے پاؤں ہی داب دے۔

ایک صاحب نے پچھلے دنوں ایک مضمون میں اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی اور اشارہ کیا تھا کہ مردوں کو خانہ داری کی تربیت حاصل کرنی چاہئے۔ ان کا کہنا تھا کہ شوہر صاحب علی الصبح بیوی کو بستر میں ہی چائے کی ایک گرم پیالی بنا کر دے دیا کریں تو یہ معمولی سی بات باہمی محبت میں اضافے کا

موجب ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اس بات کا شکوہ بھی کیا کہ بہت سے مردوں کو سویر بننے نہیں آتے۔ حالانکہ یورپ میں چند صدی پیشتر یہ کام مرد ہی انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے انہوں نے کئی فائدے بھی گنوائے تھے کہ سویر بننے سے سگریٹ پینے کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ دو یوں کہ سگریٹ کا عمل جھانڈنے کے لئے ہر بار سلاخیاں ہاتھ سے رکھنی پڑتی ہیں اور یہ سلاخیاں چلاتا اتنا دلچسپ شغل ہے کہ چند دن کے بعد مرد سگریٹ پر لعنت بھیج دے گا کہ اس سے سویر بننے کا مزا کراہوتا ہے۔

ہماری رائے میں مردوں کے لئے شروع ہی میں اس قسم کی تربیت کا بندوبست ہو تو اچھا ہے۔ مثلاً ان کی تعلیم میں خانہ داری کا مضمون ضرور ہونا چاہئے۔ اور اسکولوں میں انہیں آٹا گوندھنا، روٹی پکانا، طرح طرح کے سالن تیار کرنا۔ بچوں کی نگہداشت، گھر کی صفائی وغیرہ سکھانے کا عملی انتظام ضرور ہوتا کہ شادی کے بعد گھر سنبھال سکیں۔ اس خیال میں نہیں رہنا چاہئے کہ پڑا لکھ کے رنج و جھوٹ ہو گئے ہیں اور برسرِ روزگار ہیں تو لڑکیوں کے والدین ان کے گھر کے چکر کاٹنے شروع کر دیں گے۔ اب تو یہ ضرورت رشتہ کے اشتہار میں بھی یہ قید لگا دی جائے گی کہ لڑکا قبول صورت اور پابند صومہ صلوٰۃ ہونے کے علاوہ گھر داری کا سلیقہ رکھتا ہو۔ سینا پر دونا جانتا ہو۔ آٹھوں گانٹھ کیت ہو۔ جہیز کی کوئی قید نہیں۔ جتنا زیادہ لایا سکے لے آئے۔ لڑکی کی والدہ جب لڑکے کو دیکھنے آئیں گی۔ تو لڑکے والے اس امر کا اہتمام کریں گے کہ اس وقت لڑکا حیا کی سرخی چہرے پر لئے باروچی خانے میں بیٹھا آلو گوشت پکا رہا ہو اور آٹا گوندھ کر ایک طرف رکھ چھوڑا ہو۔ لڑکے کی والدہ بہانے بہانے اپنی ہونے والی یا نہ ہونے والی مدھن کو بتائے گی کہ یہ ساری چادریں اور غلاف میرے بیٹے نے کاڑھ رکھے ہیں۔ اپنے کالج میں لڑکھائی سلائی میں ہمیشہ اول آتا رہا ہے۔ کھانا پکانے کی تربیت بھی ہم نے اچھی دلائی ہے۔ چھ مہینے تو اس نے شہر کے مشہور مسلم کالی ہوٹل میں خانہ ماں کا کام کیا ہے۔ اور بیاہ شادیوں میں دیکھیں پکانے بھی جانتا رہا ہے۔ ادھر مدھن اپنی بیٹی کے گن گائیں گی کہ بہت خلیق اور منس کھ ہیں۔ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتی ہیں اس لئے سیلیوں کو لئے اکثر باغوں کی سیر کرتی رہتی ہیں۔ تصویریں بھی بناتی ہیں۔ آرٹ کونسل کی نمائش میں پہلا انعام انہی کو ملا۔ وہ یوں کہ انہوں نے طوطا بنایا تھا۔ کسی نے اسے گھوڑا بنایا۔ کسی نے درخت۔ کسی نے آٹا پینے کی چٹکی۔ صحیح کوئی نہ بتا سکا۔ فلم کوئی نہیں چھوڑی اور مطالعے کا ایسا شوق ہے کہ پاکستان کا کوئی فلمی رسالہ نہیں جو نہ منگاتی ہوں۔ گاتی بھی ہیں۔ نکت جمع کرے اور فلمی دوستی کا شوق ہے ہم نے اس بات کی احتیاط رکھی ہے کہ کھانے پکانے اور صفائی دھلائی سے اس کے ان اشغال میں حرج واقع نہ ہو۔ یوں بھی ان کے ابا پرائی وضع کے ہیں۔ ان امور میں عورتوں کا عمل دخل پسند نہیں کرتے۔ اب میں مطمئن ہوں کہ جیسار میں چاہتی تھی۔ ویسا اللہ نے دے دیا۔

شاہی ممیرے کا فقیری سرمرہ

ایک صاحب روتے سورتے نقش فریادی بنے ہمارے پاس آئے۔ ہاتھ میں ٹیلی ویژن والوں کا ہدایت نامہ مشتہرین تھا۔ ہم نے کہا خیریت؟ بولے۔ آپ عوام کے ہمدرد ہونے کے مدعی ہیں۔ اک ذرا ہماری بھی داد دی کیجئے۔ آخر ہم بھی تو عوام ہیں اور عوام ہی کی جیبیں کاٹ کر روٹی کھاتے ہیں۔ ہم نے اپنی جیب کو منول کر اور اطمینان کر کے انہیں عزت سے بٹھایا اور پوچھا شکایت کیا ہے؟ بولے۔ میں ٹیلی ویژن والوں کے ہاں ایک اشتہار لے کر گیا تھا۔ انہوں نے واپس کر دیا کہ اس سے مبالغے کی بو آتی ہے، ہمارے ہاں نہیں چلے گا۔

”آپ بچتے کیا ہیں؟“ ہم نے کہا۔ ”ذرا دیکھیں تو کون سا اشتہار ہے جو ان لوگوں نے واپس کر دیا۔“

انہوں نے ایک پرچی ہمیں دکھائی جس پر لکھا تھا۔

”اندھے ہٹ ہٹ دیکھنے لگے۔“

”کانے دو آنکھوں والے ہو گئے۔“

”شاہی ممیرے کے فقیری سرمرے کی کرامات۔“

ہم نے کہا۔ ”ہمیں تو اس اشتہار میں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ بہر حال اگر اس میں کوئی مبالغہ ہے تو اسے نکال دیجئے نا۔“

فرمانے لگے۔ ”مبالغہ نکال کر اس میں رہے گا کیا؟“ آپ نے سنا نہیں کہ سانچ کو آج ہے۔ اگر میں یہ انکشاف کر دوں کہ اس سرمرے میں ممیرہ نہیں اور نہ مجھے معلوم ہے کہ ممیرہ کیا ہوتا ہے تو پھر مجھے آبائی پیشے کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یعنی سائیکلوں کے پنکچر لگانے پڑیں گے۔

ہم نے ان کے ہاتھ سے ہدایت نامہ لے کر دیکھا۔ واقعی پہلی شرط یہ تھی کہ اشتہار ایماندارانہ اور سچا ہو۔ یعنی چھوٹے ہی اشتہار بازی کے فلسفے کی بنیاد پر ضرب لگائی گئی تھی۔ اب ہم نے دوسری شرطوں پر نظر ڈالی۔ ایک یہ تھی کہ مردہ شوٹی اور موگور کنی کے اشتہارات قابل قبول نہیں۔ کیوں قبول نہیں۔ اس کی کچھ

وجہ بیان نہیں کی گئی۔ اکسیری گولیوں۔ فقیری نوکوں۔ طلسمی تعویذوں اور حکمی علاجوں پر بھی قدغن ہے۔ حتیٰ کہ کوئی شخص محض مردے کو زندہ کرنے کا دعویٰ کرے تو نیلی ویرن والے اس کی صحت پر شبہ کر کے اسے رد کر دیں گے۔ معمول اور جوئے کے اشتہار بھی نہ چاہئیں۔ ضرورت رشتہ بھی مطلوب نہیں۔ جسم کو ڈبلا اور سذول بنانے اور بیٹھے بیٹھے قد بڑھا دینے والی گولیوں کے اشتہار بھی ممنوع۔ سگریٹ کے اشتہار ضرور آتے ہیں۔ بشرطیکہ ان میں سگریٹ کی تعریف نہ کی گئی ہو، ایسے اشتہارات بھی جن میں بد ذوقی کا غبار ہو۔ کانوں کے پردے پھٹتے ہوں۔ شکریے کے ساتھ واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ وغیرہ۔

یہ شرطیں اس کتابچے میں لکھی ہوئی تو ضرور ہیں۔ لیکن ہماری دانست میں نیلی ویرن کے شعبہ اشتہار والے جن میں بعض نامی گرامی اور اشتہاری ادیب شامل ہیں۔ اتنے سخت دل نہیں ہو سکتے۔ رعایت بھی برتتے ہوں گے۔ نیلی ویرن والوں نے تو مفت تحفے دیئے والے ان اشتہاروں پر بھی پابندی عائد کر رکھی ہے، جن میں زور بجائے اصل چیز کے تحفے پر ہوتا ہے۔ اس سے یاد آیا کہ کوئی دو سال پہلے ہمارے شہر کے ڈرائی کلیزوں میں تحفوں کی دوڑ ہوئی تھی۔ اگر کوئی شخص اپنی قمیض یا رومال بھی ڈھلاتا تھا تو اسے اپنی چیز اس وقت تک واپس نہ ملتی تھی جب تک وہ ساتھ مفت کوئی تحفہ قبول نہ کرے۔ ایک ڈرائی کلیز نے تو یہاں تک اعلان کیا تھا کہ آئیے اور ہمارے ہاں کے تحفے لیجئے۔ کپڑے خواہ کسی اور جگہ سے ڈھلوائیے۔ ایک اور لانڈری والے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور منادی کرائی کہ ہمارے ہاں سے تحفے لے جائیے۔ کم از کم پانچ روپے کے تحفے مفت قبول کرنے والے کو ایک سوٹ بھی مفت دھو کر دیا جائے گا۔۔۔

ہمارے نزدیک یہ باپندیاں ہماری ملکی ترقی کی راہ میں ناروا کاوٹ ہیں۔ اگر کہیں ہمارے اخبارات بھی اس قسم کا ضابطہ سامنے رکھتے تو آج اکسیری گولیوں، جاپانی چھلوں اور انگوٹھیوں، جھشیوں کو ایک دم گورا کرنے والے نوٹشوں اور قد بڑھانے والی معجزاتی دواؤں کو یہ فروغ نہ حاصل ہوتا۔ نہ لوگوں کی بگڑی بنانے والوں، اور ہنسی بگاڑنے والوں کے کاروبار میں اتنی برکت ہوتی۔ ہم نیلی ویرن والوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا واقعی سانچ کو آج نہیں ہے! اگر ان کے پاس واقعی سو فیصدی سچے اور ایماندارانہ اشتہار آنے شروع ہو گئے تو وہ انہیں دیں گے؟ مثلاً یہ

(۱)

ہماری پیش کش افلاطونی سگریٹ۔ ایک بار چیجے، ہمیشہ کیلئے آپ کے ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ گلے میں خراش ڈالتا ہے جو مستقبل کھانسی میں بدل جاتی ہے۔ اس میں تمباکو کے علاوہ اس

کا نعم البدل گھوڑوں کی لید بھی شامل ہے۔ مسلسل پینے والوں کو کینسر ہونے کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ عوام کا من پسند افلاطونی سگریٹ۔

(۲)

سلیمانی چائے نہایت خوبصورت، نئے ڈبے میں۔ یاد رہے کہ صرف ڈبہ نیا ہے۔ اندر اس کے وہی استعمال شدہ پتی اور پتے کے چھلکوں کا مرکب ہے۔ آپ کے نفع نقصان سے ہمیں غرض نہیں۔ سلیمانی چائے پیجئے اور ہماری تجارت کو فروغ دیجئے۔

(۳)

نفائٹ ڈرائی کلینرز آئے اور اپنے کپڑے ہمارے ہاں سے ڈرائی کلین کرائے۔ ہم گاہوں سے تو کچھ بھی کہیں۔ دراصل تمام کپڑے دھو بی گھاٹ کے تالاب میں ڈرائی کلین کرتے ہیں۔ ہمارے شوروم میں آپ کو جو مشین نظر آتی ہے وہ ڈرائی کلین کرنے کی نہیں۔ آکس کریم بنانے کی ہے۔ وہ بھی ناکارہ،

اور آخر میں ہمارے ان کرمفرما کا یہ اشتہار ہے۔ گر قبول افتد زبے عز و شرف،
”شاہی میسرے کا فقیری سرمہ۔ صاحبو۔ میں نہ ڈاکٹر ہوں نہ حکیم۔ سرمے کے بہانے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوں۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اس سرمے کا جزو اعظم واقعی دھول ہے۔ ہاں اس میں تھوڑا پیر منٹ ملا دیا جاتا ہے۔ ہر شیشی پر ہمارا خرچ تو صرف پانچ پیسے آتا ہے لیکن چونکہ تھوڑا نفع لینا حرام ہے لہذا اپنے مہربانوں کے لئے قیمت ہے۔ تین روپے۔“

جھوٹ سچ کا ذکر برطرف۔ اشتہار ہماری کمزوری ہیں۔ اگر اسے ریڈیو اور ٹیلیویشن کے پروگراموں پر بالواسطہ رائے زنی نہ سمجھا جائے تو ہم عرض کریں کہ ہم ریڈیو اور ٹیلی ویژن دیکھتے اور سنتے ہی ان کے لئے ہیں اور گوش نصیحت نیوش اور دیدہ عبرت نگاہ کو کام میں لاتے ہیں۔ پہلے ہمیں اشتہاروں کے لئے کسی آئٹم یعنی تقریر یا ڈرامے کے پورا ہونے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہر آئٹم کے درمیان بھی کٹ کر کے اشتہار دیئے جانے لگے ہیں۔ رمضان کے فضائل پر مولانا بلغ العلّٰی کی تقریر ہو رہی ہے اور یک لخت مسلم ریستوران کا اشتہار نمودار ہوتا ہے۔ ”لذیذ کھانوں کے لئے مسلم ریستوران میں تشریف لائیے۔ رمضان کے دوران پردے کا بھی معقول انتظام ہے۔ آپ ہمارا اپیشل رمضان سچ گھر بھی منگاوا سکتے ہیں۔“

اب تک خبروں میں یہ التزام نہ تھا۔ شروع سے آخر تک سوکھی خبریں سننی پڑتی تھیں۔ کل ہم نے یہاں بھی خبروں اور اشتہار کو تو سن شدی من تو شدی دیکھا۔ نیوز ریڈر کا چہرہ نمودار ہوا۔

آج صدر جاسن نے اعلان کیا ہے کہ.... (خبر کٹ۔ اشتہار شروع)

”آپ کا محبوب بامتا گھی اب دوپونڈ کے مہر بند بوں میں بھی دستیاب ہے۔ یاد رکھئے.....“

”ہوائی جہاز صرف شمالی دیت نام کے سرحدی علاقوں پر بمباری کیا کریں گے۔ جب ان

سے پوچھا گیا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخابات میں کھڑے ہوں گے تو انہوں نے فرمایا.....“

”امی بھی کھائیں۔ ابو بھی کھائیں۔ کھائیں دادا جان“

”جب صدر ڈیگال سے صدر جاسن کے اعلان پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو وہ بولے“

”آپ عالم جی کے دھاگے استعمال کیجئے۔ میں ہمیشہ یہی استعمال کرتا ہوں۔“

ڈرامے میں بھی آپ دیکھیں گے کہ لوق ووق جنگل ہے۔ ہیر وکن لاچار ہے۔ بے یار و مددگار آکسٹرا

کی مغموم بیک گراؤنڈ مین پر گلیسرین کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔ یکا یک سینے پر دو ہتھ مار کر گر جاتی

ہے۔ ”ہائے اللہ میں کیا کروں؟“۔

یکا یک ایک صاحبہ کا چہرہ سولہ بلکہ بیس سگڑ میں نمودار ہوتا ہے۔ ”بہن یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ نیل

نیکس کی چادریں خریدیے۔ کم خرچ۔ پائیدار اور رنگ پکے۔“

ذکر ایک موثر شناس کا

پچھلے دنوں اخبار میں ہمارے دوست نقش زبیری کا احوال ”آج کا شاعر“ کے سلسلے میں چھپا ہے۔ نقش زبیری تو ہم رواروی میں لکھ گئے۔ ہماری مراد شمس زبیری سے ہے۔ نقش تو ان کے پرچے کا نام ہے۔ جس کی جمع نقوش محمد طفیل صاحب لاہور سے نکالتے ہیں۔ ان واحد اور جمع میں ایک سارٹھن بھی گئی تھی۔ لیکن وہ ایک الگ قصہ ہے لوگوں نے یہ پڑھ کر مصالحت کرا دی تھی کہ

اصل نقوش و نقش و مناقش ایک ہے
حیراں ہیں یہ مناقشہ ہے کس حساب میں

شمس صاحب سے ہماری یاد اللہ بہت پرانی ہے۔ ان کی خوبیوں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اظہر من الشمس ہیں۔ وہ شاعر ہیں اور ایسے ویسے نہیں بلکہ مراد آبادی۔ اسے ہماری کمزوری جانے کہ ہمیں مراد آباد کی ہر چیز پسند ہے۔ شاعر بھی، برتن بھی اور مردے بھی جو زندہ ہو جاتے ہیں۔ وہ فقط شاعر نہیں۔ کیونکہ شاعر تو ہم بھی ہیں۔ بلکہ عروضی بھی ہیں۔ عروض وہ علم ہے جو انھیں مرحوم نے اپنی بکری کی مدد سے ایجاد کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعری تو کر لیکن از رکافات عمل غافل مشو۔ اس فن میں وہ مہارت ہے کہ بڑے بڑوں کے چراغ ان کے سامنے نہیں جلتے۔ جیسا کہ اس مذکورہ بالا مضمون میں لکھا ہے، وہ مرغبانی کے بھی ماہر ہیں۔ مرغ کا ماہر تو ہر مسلمان طبعا ہوتا ہے۔ لیکن بالعموم کھانے کی حد تک۔ مرغبانی اس سے ایک الگ چیز ہے۔ لوگ دور دور سے ان سے مرغیوں کے علاج کے نسخے پوچھنے آتے ہیں۔ تاکہ پیاریوں سے انھیں بچا سکیں اور موٹی کر کے کھا سکیں۔ موٹر کی مرمت بھی ایسی کرتے ہیں کہ ملکینکوں اور مستریوں کو کان پڑواتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن توڑنا جوڑنا بھی خوب جانتے ہیں اور یونانی طب اور ہومیو پیتھی وغیرہ میں بھی دخل در معقولات کر لیتے ہیں۔ گویا یہ ایک انار سو بیاروں کا علاج ہے۔

ایسے جامع حیثیات لوگوں پر ہمیں ہمیشہ رشک آیا ہے۔ ہم صد اسے یک فنے ہیں۔ بس لکھتے

پڑھنے کی غنڈہ بد تو رکھتے ہیں لیکن نہ چار پائی ٹھونکنی آتی نہ جانوروں کا علاج معالجہ ہمارے بس کی بات ہے۔ حتیٰ کہ بال کاٹنے کے فن شریف تک سے واقف نہیں۔ یہی توجہ ہے کہ میر کی طرح خوار پھرتے ہیں وکی پوچھتا نہیں۔ اس کے مقابلے میں شمس صاحب کو دیکھئے کہ ایک نہیں دو دو تین تین رسالے نکالتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی فیض رسانی کے دریا بہاتے ہیں۔ ان کے دفتر جائے تو یہ نقشہ نظر آئے گا کہ مینے میسرے پر کاتبوں کے پرے جتے ہیں۔ جوی نویس وی نویس وی نویس کرتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف پنج پر احباب مرغیاں بغل میں والے بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب غنڈہ آدم کے مشاعرے کا دعوت نامہ انہیں دے رہے ہیں کہ ضرور قدم رنج فرمائیے گا۔ اور غزل کے علاوہ بستر اور چند ایک خوش گوشا شعر بھی ہمراہ لائے گا۔ ادھر ایک صاحب نے ایک پنشن خوار ٹرانز سٹران کی میز پر لایا ہوا ہے۔ حضرت یہ ریڈیو کا ساز بھی کیا ساز ہے، پنج رہا ہے اور بے آواز ہے۔ ایک صاحب ٹیلیویشن چادر میں باندھ کر لائے ہیں اور شکایت کر رہے ہیں کہ نہ جانے کیا خرابی ہو گئی ہے اس میں، کوئی ڈھنگ کا پروگرام ہی نہیں آتا۔ ڈرامے پھسپھسے، گانے بے سرے اور جانے کون سی گھنڈی خراب ہو گئی ہے کہ آدھے پروگرام اس میں انگریزی اور ہنگلہ کے آتے ہیں۔ آپ مشورہ دیں تو اسے بیچ کر دوسرائی وی سیٹ خرید لوں؟ ایک صاحب کے موٹر کے کار بورڈ میں کچھ خرابی ہے۔ وہ بھی مفت مشورے لینے کو موجود بلکہ شمس صاحب کا دامن سمجھتے رہے ہیں کہ موصوفہ بیچے کھڑی ہیں۔ تک نظر کرم کی بھیک ملے۔ نقش کے تازہ شمارے کا ادارہ یہ بھی ساتھ ساتھ لکھا جا رہا ہے۔ اور ٹشی کو بھی ہدایت کر رہے ہیں کہ فلاں اشتہار کے پیسے جا کر لے آئیے اور پریس میں بیس ریم کاغذ بھی دیتے آئیے۔ مخاطب سے بھی بات ہو رہی ہے کہ ہاں صاحب کیا مصرع طرح ہے مشاعرے کا۔ آدمی کو بھی مینس نہیں انساں ہوتا۔“ اس میں قافیہ میسر رہے گا یا انسان؟ اور شیخ صاحب اپنی مرغی کو لے جا کر ایک خوراک منجگر آڈیوین کی دے دیجئے اور اس کے سر میں روغن آمہ کی مالش کیجئے۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی اور ہاں مرزا جی آپ کے ریڈیو سیل ختم ہو گئے ہیں۔ بازار سے جا کر لیجئے اور ڈال لیئے۔ اچھا تو مضطر صاحب آپ کی غزل میں نے دیکھ لی۔ اسے ہم بحر متقارب مشن بحث بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور بحر منسرح متدارک چار کنی بھی۔ آپ کی غزل میں ایٹائے جلی بہت رہتا ہے۔ اس کی مقدار کم کیجئے گا۔ ہاں تو احسان صاحب آپ کو بھی نسخہ دیتا ہوں۔ اپنی بیگم کو آریکا دن میں چار بار دیں۔ ۱۰۰ کی پوٹیشی میں اور خود ضعف دماغ کے لئے جوارش جالینوس، جنون فلاسفہ اور تر پھلا کا استعمال جاری رکھیں۔ احمد میاں آپ نے اپنے کار بورڈ میں پانی ڈالا ہوتا۔ اس کو آپ خشک چلاتے ہیں تبھی تو آپ کے ٹائر اتنی جلدی ٹھس جاتے ہیں اور بارن خراب ہو جاتا ہے۔ کاتب صاحب شہر مت بچائیے۔ آپ ہی کے لئے لکھ رہا ہوں ادارہ یہ۔ ہاں تو میں کیا لکھ رہا

تھا۔ ”فی زمانہ ادب اور زندگی کا رشتہ ایسا پیچیدہ ہو گیا ہے اور اس کے مہجبات.....“

کن نصیبوں پر ہوئے موزن شناس۔ شمس صاحب کی رکاب میں ہم نے ہر بھانت کی ہر ساز کی، ہر نسل اور ہر عمر کی موٹریں دیکھیں۔ ہم کئی بار ان کی معیت میں سفر کر چکے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایسا اعجاز ہے کہ موٹر میں سیٹیں نہیں ہیں اور چل رہی ہے۔ نمبر پلیٹ نہیں اور چل رہی ہے۔ پٹرول نہیں اور چل رہی ہے۔ حتیٰ کہ انجن نہیں اور چل رہی ہے۔ ایک بار کوئی شخص پرانی موٹر نوچ کھسوت پیسے اتار کوڑے پر پھینک گیا۔ شمس صاحب کا ادھر سے گزر ہوا کہنے لگے۔ اصل نسل کی تو اچھی ہے۔ جا کے اس کی سیٹ پر بیٹھے۔ جب میں ہاتھ ڈالا تو اپنے غسل خانے کی چابی مل گئی۔ وہی اس میں لگ گئی اور موٹر اشارت۔ یہ بہت دن پہلے کی بات ہے۔ یورپ والوں نے تو بغیر پیسے والی موٹریں اب آکر بنائی اور چلائی شروع کی ہیں۔

یہ نہ خیال کیا جائے کہ ان کو موٹریں ہمیشہ مفت کوڑے میں پڑی مل جاتی ہیں۔ بے شک ان کی حالت اور شکل کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے لیکن اکثر ان میں سے زر کثیر خرچ کر کے خریدی جاتی ہیں۔ ایک روز ہم جہانگیر روڈ سے ان کے ساتھ بیٹھے۔ ہم نے کہا یہ البیلی کار ہم نے پہلے تو نہیں دیکھی۔ کب لی؟ کتنے میں لی؟ فرمایا۔ ابھی کل ہی تولی ہے۔ چوالیس روپے میں۔ پینتیس روپے دے دیئے ہیں۔ نو روپے ابھی دیئے ہیں۔ تین تین روپے کی تین قسطوں میں۔ موٹر کو بلا پٹرول اور بلا انجن کے چلانے کا تجربہ رسالے میں ان کے بہت کام آیا۔ ان کے پاس روپیہ نہیں اور نقش چل رہا ہے بلکہ پیسوں والے پرچے اتنا اچھا نہیں چلتے۔ شاوی نہیں کی اور زندگی اچھی خاصی گزار رہے ہیں۔ بس ایک معاملے میں آکر رہ جاتے ہیں۔ شعر بغیر وزن کے نہیں لکھ سکتے۔ ایک نہ ایک تو کمزوری تو ہر شخص میں ہوتی ہے نا؟۔

ذکر حضرت مریض الملت کا

ہمارے مخدوم حضرت حفیظ جالندھری کا ایک شوقیٹ آج کل ایک چورن کے اشتہار کے ساتھ باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔ یہ ایک خط ہے جو انہوں نے اس چورن کے موجد حکیم صاحب کو لکھا ہوگا ”مکرمی! آپ نے جو ہائے کی گولیاں تیار کی ہیں۔ سبحان اللہ، مجھے ان سے بہت آرام ہے۔ براہ کرم ایک ڈیڑھ ان گولیوں کا اور بھیج دیجئے۔“

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ہمارے شاعر پہلے شاعری کرتے ہیں۔ پھر نثر سے منہ منھا کرتے ہیں۔ اور آخر میں تیر بہدف اکسیری دواؤں۔ چاروب معدہ چورنوں۔ بلاد و دانت اکھاڑنے والے منجنوں اور عینک توڑ سرموں کے شوقیٹ لکھتے ہیں۔ پہلی دونو تیں تو خیر ہم پر بھی آچکی ہیں۔ تیسری کا انتظار ہے۔ حفیظ صاحب سے اگر ہمیں شکایت ہے تو یہ کہ ہم ان کے بہت قریب رہے ہیں۔ نہایت نیاز مند بلکہ فیضان کے لحاظ سے شاگرد و رشید۔ کئی بار ان سے درخواست کی کہ قبلہ ہماری شاعری کے متعلق کوئی شوقیٹ عنایت ہو۔ اس قسم کا کہ ”میں نے حضرت ابن انشا کا کلام استعمال کیا۔ اس سے مجھے بہت افادہ ہوا ہے۔ یہ چربے سے پاک ہے۔ اور دماغ سے بھرپور۔“ چاہتے تو ہمارے نام خط بھی لکھ سکتے تھے کہ مکرمی اپنے مجموعہ کلام کی دس جلدیں دی، پی سے بھیج دیجئے تاکہ بیٹھا پڑھتا رہوں اور استفادہ کرتا رہوں اب صورت حال یہ ہے کہ ہماری اپنی سرکولیشن تو خاصی ہے، جگہ جگہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا سرٹیفکیٹ نہ ہونے کے باعث ہماری شاعری رہی جاری ہے۔ اور تو اور ریڈیو پاکستان والے تک جو ہر روز سائل جھنجھانوی اور گھائل گورداسپوری کے سے شاعروں کی غزلیں گواتے ہیں، اور معیار کے بارے میں متعصب نہیں، ہمیں شاعر نہیں جانتے۔ حفیظ صاحب سے مایوس ہو کر بلکہ اتفاقاً کہیے، حال ہی میں ہم نے ایک حکیم خازق سے سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہے کہ ”ابن انشا صاحب کی شاعری نفع کو نافع ہے۔ خون صالح پیدا کرتی ہے۔ اگر خالص گھی سونے کے کشتے سے بہتر ہے تو انشا صاحب کی شاعری خالص گھی سے بھی بہتر ہے۔“ اس سند کے ساتھ ہم نے اپنا مجموعہ بجائے کتب

فروشوں کے عطاروں اور دوا فروشوں کے ہاں رکھوا دیا ہے۔ بسوں میں بھی فروخت ہوتا ہے۔ جس بھائی کو ضرورت ہو آواز دے کر طلب کر لے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم چورن کی افادیت سے منکر ہیں یا اسے شاعری سے کم درجے کی چیز سمجھتے ہیں۔ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ یہ بھی ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ چورن تبخیر کو دور کرتا ہے۔ جب کہ شاعری معدے میں تبخیر پیدا کرتی ہے۔ شاعر کے معدے میں شعر لکھنے کے فوراً بعد ایک باؤ گولا سا اٹھتا ہے اور وہ سامعین کی تلاش میں آدم بو، آدم بو پکارتا بھٹکتا پھرتا ہے۔ کوئی اور سخن شناس نہ ملے تو کسی آتے جاتے پھیری والے ریزہ می والے ہی کو روک لیتا ہے اور کلام عطا فرما کر اپنی تبخیر کو اس کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ یہی توجہ ہے کہ جس علاقے میں شعر و شاعری کا زیادہ چرچا ہو وہاں فقط اسپروہی کی نہیں بلکہ سوڈا واٹر کی بوتلوں، کاربنا، مولیٰ کے نمک اور تمباکو والے پانوں کی کھپت خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ ملاں صرف یہ ہے کہ محض اس وجہ سے کہ ہم شعر بناتے ہیں، چورن نہیں بناتے، ہم حفظ صاحب کی نظروں میں بار نہ پاسکے۔ سنا ہے علامہ اقبال مرحوم بھی ایسی ہی غیر فیاض طبیعت کے مالک تھے۔ ان کا ایک شوقیٹ ایک مرہم کے بارے میں تو کوئی چالیس برس سے چسپ رہا ہے کہ یہ چیز ناسور، بھسکندہ، داد، خارش اور مغلیٰ پھوڑے کا حکمی علاج ہے۔ لیکن کسی ہم عصر شاعر کے دل پر انہوں نے تعریف کا چھایا رکھا ہو، یہ ہمیں نہیں معلوم۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہمارے حفیظ صاحب کو دواؤں سے بھی اتنا ہی شغیف ہے، جتنا شاعری اور قوم کی خدمت سے۔ ہم پہلی بار ملے تو یہی سمجھے کہ کوئی خاندانی طبیب ہیں۔ دیکھا کہ فرش پر دری بچھی ہے۔ دری پر قالین بچھا ہے۔ قالین پر بستر بچھا ہے۔ اور بستر پر ہمارے حفیظ صاحب بچھے ہیں بلکہ بچھے جا رہے ہیں۔ قریب ایک الماری دھری ہے کہ جب ذرا گردن اٹھائی دیکھ لی۔ اس کے نیچے کے خانے میں شاعری کے بستے اور خام مال یعنی مضامین تازہ کے انبار اور قافیوں ردیفوں کے بچھے دھرے ہیں۔ اس کے اوپر کے خانے میں مجوئیں ہیں، جو شاندار ہیں۔ عرق ہیں۔ شربت ہیں۔ اس سے اوپر آئیے تو قطار در قطار ہومیو پتھی کی گولیوں کی شیشیاں کچی ہیں۔ چوتھا خانہ انگریزی دواؤں کیلئے مخصوص ہے۔ گولیاں۔ پوڈر۔ کپسول۔ انجکشن، تھرمایسٹر وغیرہ۔ سب سے اوپر کا تختہ ایپرویدک اور سنیا سیوں کی عطیہ دواؤں کے حصے میں آیا ہے۔ اس پر مختلف جڑی بوٹیاں، ایک کھل۔ گھیکوار کا تازہ گچھا۔ نیم کی

نہولیاں۔ حتیٰ کہ ایک نیولا بھی پڑا ہے۔ معلوم نہیں مردہ ہے یا جان کے خوف سے دم سادھے بیٹھا ہے۔ کچھ واجبی سی گفتگو تو شاعری کے بارے میں ہوئی۔ اس کے بعد فرمایا۔ تمہارے چہرے پر زردی سی کیوں ہے۔ اختلاج تو نہیں ہوتا۔ کنشیاں تو درد نہیں کرتیں۔ اور دن کو تارے تو نظر نہیں آتے؟ ہم نے قبول دیا کہ یہ آخری علامت درست ہے۔ فرمایا۔ کل اپنی غزلوں کا دیوان اور قارورہ لے کر آنا اور آج کے لئے یہ نسخہ نوٹ کر لو۔ سلفا ڈائزن۔ نکس و امیکا اور مصطکی رومی ایک ایک تولہ لے کر گھیکوار کے رس میں کھل کر دو اور پھر خمیرہ گاؤ زبان میں رکھ، ورق نقرہ پیچیدہ، شربت دینار کے اڈھے کے ساتھ نوش جان کر جاؤ۔“

ہم نے کہا۔ ”شربت دیدار؟ یہ کہاں سے ملے گا۔؟“
 بولے ”شربت دیدار نہیں بے وقوف۔ شربت دینار۔“

ڈاکٹر اقبال ڈاکٹر تو تھے ہی۔ خواہ نام ہی کے تھے۔ کیونکہ انجکشن وہ نہ لگا سکیں، کسچر وہ نہ دے سکیں اور فیس وہ نہ لے سکیں۔ اس پر عقیدت مندوں نے انہیں حکیم الامت کا لقب بھی دے دیا۔ وہ آخری عمر تک حکیموں کے زیر علاج ضرور رہے اور یہ بات سچ ہے کہ انہی کے ہاتھوں مرے لیکن خود طبابت کبھی کی ہو، یہ کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ اس کے مقابلے میں حفیظ صاحب کو، کہ ان کی ساری عمر بیماریوں اور دواؤں کے دشت کی سیاحی میں گزری ہے، لوگوں نے فردوسی اسلام، شاعر پاکستان حتیٰ کہ خان بہادر تک کہا۔ لیکن حکیم قسم کے خطاب سے محروم رکھا۔ ابوالاثر کے لقب میں بے شک ایک اشارہ سا ہے کہ ان کی دواؤں میں اثر ہوگا اور ان کے ہاتھ میں شفاء ہوگی۔ لیکن ایسے شخص کے لئے یہ کافی نہیں۔ جس کی جو سانس آتی ہے اور جاتی ہے، اپنے اور قوم کیلئے نفع لکھنا اور دوا دارو کرنے کے لئے وقف ہے۔ آخر خود انہوں نے مریض الملک کا لقب اپنے لئے پسند کیا۔ اور ہم نے طبیب القوم کی اعزازی ڈگری انہیں پیش کی۔

حفیظ صاحب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اتنے بڑے ماہر طب یعنی بیک وقت دید۔ حکیم۔ ڈاکٹر۔ ہومیو پیتھ عامل کامل ہونے کے باوجود مریضوں کے محتاج نہیں۔ پیشہ ور حکیموں کو ہم نے دیکھا ہے کہ بیٹھے لوگوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کب کوئی آئے اور وہ اس کے حلق میں کوئی جو شانہ یا

ضیاعہ مع دوا کے بل کے اتاریں۔ لیکن حفیظ صاحب نے کہ ہمیشہ سے بے ہمد وباہمہ، خوددار اور خود کفیل واقع ہوئے ہیں نہ کبھی کسی کا راستہ دیکھا نہ کسی کے بیمار ہونے کی دعا مانگی۔ انہوں نے اپنی ذات ہی میں وہ ساری بیماریاں پیدا کر رکھی ہیں یا ڈھونڈ رکھی ہیں، جن کا کتابوں میں ذکر آیا ہے یا آتا باقی ہے۔ جس طرح وہ خدمت برائے خدمت اور ادب برائے ادب کے قائل ہیں اسی طرح دوا برائے دوا بھی ان کا اصول معلوم ہوتا ہے۔ خود ان دواؤں کو بھی جو وہ نوش جاں کرتے ہیں، بعض اوقات پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس مرض کی دوا ہیں۔ پانی کے ایک گھونٹ کے ساتھ کوئی کپسول نیچے چلا جا رہا ہے۔ دوسرے کے ساتھ چھچھر خیرہ جو ابر والا اس کا تعاقب کرتا ہے۔ تیسرے کے ساتھ کوئی فقیری ٹونکا یا کشتہ ہے۔ اس کے اوپر سے ہومیو پتی کی گولیوں کا ایک پھنکا بھی مارا ہے۔ سانسے شربت برزوری کی بوتل دھری ہے کہ آیا بود کہ گوشہ چشمے بمانند۔ اسپول کی دھونی بھی لے رہے ہیں۔ اور کپوٹڈر بھی کسی انجکشن کی پککاری لئے اشارے کا منتظر ہے۔ پھر دوا ہی پر بس نہیں۔ دعا بھی ہو رہی ہے۔ اپنی جان شیریں پوری طرح حکیموں، ڈاکٹروں اور خود اپنے دست شفا کو ہتہ نہیں کر دی۔ بلکہ کچھ شافی حقیقی کے لئے بھی چھوڑ دیا ہے۔ بہر حال ہماری دعا ہے کہ انہیں اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست۔ یہ یونہی زندہ رہیں اور تالیف نسخہ ہائے وفا کرتے رہیں۔ کیونکہ ہم تو انہی کے مریض ہیں۔ ان کی شاعری کے مریض۔ ان کی محبت کے مریض۔ معمولی مریض نہیں بلکہ کہنہ مریض۔ مایوس العلاج مریض۔

تعمیری شاعری

گزشتہ ہفتے کراچی کے ایک اونچے ہوٹل میں ایک محفل کلام و طعام برپا ہوئی۔ جس میں شریک ہونے والوں میں قابل ذکر ایک تو ہم تھے۔ ہمارے علاوہ کچھ اور ادیب جوش ملیح آبادی، سید محمد تقی، جمیل الدین عالی، جی الانہ وغیرہ بھی۔ تقریب اس کی صابر تھاریانی صاحب کا کلام تھا۔ صابر تھاریانی گجراتی اور اردو کے ایک خوش گوشااعر ہیں اور ملک کے ممتاز آرکیٹیکٹ۔ قدرتی طور پر ان کی شاعری بھی تعمیری رنگ کی ہے۔ جوش صاحب نے ان کے گجراتی کلام کو اردو کے سانچے میں ڈھالا ہے اور اس خوبی سے کہ جوائنٹ جہاں لگی ہے وہیں رہے اور مطلب بخوبی ادا ہو جائے۔ اپنی طرف سے اس پر چونکا گچ بہت کم کیا ہے۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ ورنہ بعض اوقات ترجمہ کرنے والے شاعر اپنے مخصوص رنگ کا ایسا گہرا ڈمپیر چڑھاتے ہیں کہ اصل کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔

صابر صاحب نے اپنے کلام کا نام ”صابر کے موتی“ رکھا تھا، جوش صاحب نے اردو ترجمے میں بھی یہی نام رہنے دیا ہے۔ جو کلام کی آب و تاب کے لحاظ سے تو ٹھیک ہے لیکن مناسبت اور تلازمے کا حق اس سے ادا نہیں ہوتا۔ صابر صاحب کا کلام رفعت اور شکوہ میں ایک عالی شان قصر یا مکان کی طرح ہے اور مضبوط ایسا جیسے آری سی کے ستونوں پر بنا ہو۔ نام میں اس کی رعایت دینی چاہیے تھی۔ بام عشق، چوبارہ ناز، گنبد ہجران، بحر اب وصال، فصیل معرفت، اس مجموعے کا کچھ بھی نام ہو سکتا تھا۔ سیدھا سیدھا بھی نام رکھتے تو اس دیوان کو دیوان خانہ صابر کہہ سکتے تھے۔

مغنی نہ رہے کہ اچھی اور پائیدار شاعری کی بنیاد مطالعہ اور ریاضت فن ہوتی ہے۔ الحمد للہ کہ صابر صاحب کے ہاں یہ بنیاد بہت مضبوط ہے۔ آج کل کے لوگوں کی طرح نہیں کہ محض موزوں طبعی کے سہارے شاعری شروع کر دیتے ہیں۔ ان کا شاعر بننا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا بلا امتحان پاس کئے اور لائسنس لئے خود کو آرکیٹیکٹ کہلانا۔ یہ لوگ خشت اول ہی کج رکھتے ہیں لہذا ان کی شاعری پیسے کے دینار کی طرح تریا تک میڑھی چلی جاتی ہے۔ یا پھر ریت کی دیوار کی مثال جانیں کہ اب گری کہ اب گری۔ پچھلے دنوں ہم نے کئی مجموعے ایسے دیکھے جو کے ڈی اے کے کسی ٹھیکیدار سے بنوائے معلوم ہوتے

تھے۔ کچھ دنوں واہ واہ ہوتی ہے پھر ایسی شاعری کا سالہ نگنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہم نے صابر صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ مشہور گیت بھی آپ ہی کا لکھا ہوا ہے ”اک بنگلہ بنے نیارا“۔ معلوم ہوا نہیں ان کا نہیں۔ خیر کسی اور آرکائیٹ کا ہوگا۔

اسی جلسے کی تقریروں سے معلوم ہوا کہ جوش صاحب نے صابر صاحب کا دیوان بنایا ہے اور

صابر صاحب نے جوش صاحب کا مکان بنایا ہے۔ ہم نے دیوان تو دیکھا ہے بھان اللہ، مکان نہیں دیکھا جس سے پتہ چلے کہ شاعر کیسا مکان بناتا ہے۔ ہمارے ایک دوست عطا اللہ خمار آرکائیٹ ہیں۔ ایک روز غزل لائے جس میں جا بجا وزن کا خلا تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ شاعری میں اتنے دروازے کھڑکیاں رکھنے کا رواج نہیں۔ ان سے ہم نے اپنے مکان کے نقشے کی فرمائش کی تو بولے۔ چھوٹی بحر میں چاہیے یا بڑی بحر میں۔ ہم نے کہا یہاں بحر کا کیا سوال ہے۔ بولے بعض لوگ مکان کو لمبا لمبا پھیلا لے جاتے ہیں، بعضے ارد گرد جگہ زیادہ چھوڑتے ہیں۔ اور زیر تعمیر رقبہ کم رکھ کر اوپر منزلیں اٹھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ چھوٹی بحر کا مکان ہوتا ہے ہم نے کہا۔ ہمیں تو چھوٹی سی کالنج چاہیے بس رباعی کی طرح۔ لیکن خدارا ایسا مت کرنا جیسا رنجور امر دہوی صاحب کے مکان میں کیا ہے کہ ایک کمرے کا دوسرے کمرے سے تعلق ہی نہیں۔ فرمایا وہ تو غزل گو ہیں، غزل کے ایک شعر کا دوسرے سے کیا ربط ہوتا ہے؟ خیر صابر صاحب کے متعلق پتہ چلا کہ جب نقشہ بناتے ہیں تو محنتیں آرکائیٹ بناتے ہیں۔ ان کی تعمیر کردہ ڈھاکے کی مسجد بیت المکرم ہم نے دیکھی ہے۔ کیا لف و نشر مرتب ہے۔ بیت کے ہر دو معنوں کا التزام ہے۔

کھانے کی میز پر بیٹھے تو ہمارے داہنے ہاتھ بھی ایک علم دوست آرکائیٹ تھے اور بائیں ہاتھ بھی۔ بالکل سامنے ہمارے جمیل الدین عالی تھے اور ہم ان سے ذکر کر رہے تھے کہ لاڑکانہ کے میلہ مویشیاں والے مشاعرے کے لئے ہم نے ایک غزل آپ کی زمین میں نکالی ہے۔ وہی آوارہ۔ چمن آرا۔ شمیم آرا وغیرہ کے قافیوں والی زمین۔ فرمایا۔ تم نے رسالہ تعمیر ادب کے سالنامے کے لئے افسانہ بھی لکھ لیا کیا؟ ایڈیٹر صاحب تقاضا کر رہے تھے۔ ہم نے کہا لکھیں تو کیسے؟ پلاٹ ہی نہیں ملتا۔ اس پر ہمارے داہنے ہاتھ والے مہربان بزرگ نے کھانے سے ہاتھ روک کر کہا کہ فیڈرل کالونی آپ کو پسند ہو تو ایک پلاٹ آپ کو وہاں میں دلا سکتا ہوں۔ ہم ابھی ان کا شکر یہ ادا کر رہے تھے کہ بائیں ہاتھ والے صاحب نے کہنی مار کر پیش کش کی کہ زمین چاہیے تھی تو آپ مجھ سے فرماتے اب خواہ مخواہ آپ کو غزل نکالنے کے لئے اتنی دور عالی صاحب کی زمین پر جانا پڑتا ہوگا۔

انٹرویو علم دریاؤ ہے

ایک اخبار میں ریڈیو پاکستان لاہور کی اناؤنسر مس زاہدہ بٹ کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ انٹرویو کرنے والے نے ان سے پوچھا کہ آپ کی پسند کیا چیزیں ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

”کرہیلے گوشت“ بچے، قلم، بال بنانے کے نت نئے نمونے اور پراسرار ناول“ ہماری اردو اخبار نویسی جب سے صنعت بنی ہے، دن دوئی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ رات کو زیادہ اس لئے کہ اخبار کا زیادہ تر کام رات ہی کو ہوتا ہے اور منجھے ہوئے اور مشاق اخبار نویس کی نشانی یہ ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی بعض دوسری مخلوقات کی طرح اس کے دیدے رات کو تو خوب پٹ پٹ کھلتے ہیں اور اندھیرے میں اسے بہت دور کی سوجھتی ہے۔ لیکن دن کو ناک کے آگے بھائی نہیں دیتا۔ ٹامک ٹومیاں مارتا پھرتا ہے۔ خیر یہ بات تو کچھ پہلے بھی تھی۔ لیکن اخبارات ترقی کے دور سے پہلے ایسے جامع نہ ہوتے تھے کہ ہنڈیا بھوننے اور سر میں کنگھا کرنے تک کی ترکیبوں پر حادی ہوں۔ چوگنی پانچویں کلاس کے بچے ہمارے زمانے میں جواب مضمون لکھنے کی مشق لکیر دار کا پیوں پر کیا کرتے تھے۔ اب سیدھے سیدھے اخبار میں کرتے ہیں۔ مضمون بھی چھپتا ہے، تصویر بھی چھپتی ہے۔ کسی زمانے میں لوگ اس بات کو ترسا کرتے تھے کہ ان کی تصویر اخبار میں چھپ جائے۔ اب ہم اس بات کو ترستے ہیں کہ نہ چھپے لیکن ایڈیٹر لوگ کہتے ہیں کہ مضمون چاہے دو نہ دو، تصویر ضروری ہے۔ ایک صاحب نے ایک ہفتہ دار اخبار کو پیاز کترنے کی ترکیب بھیجی تھی کہ پیاز لیجئے اور چاقو لیجئے۔ پھر چاقو سے پیاز کتر لیجئے۔ یہ بہت دن تک نہ چھپی کیونکہ اس کے ساتھ ان صاحب نے تصویر نہ بھیجی تھی۔ آخر ایڈیٹر کے تقاضوں پر تقاضے آئے تو پورے میک اپ میں کلفٹن پر جا کر ریت پر لیٹ کر انہوں نے تصویر بنوائی۔ چونکہ رنگین تھی لہذا اخبار مذکور نے سرورق پر چھاپی اور اندر تعارف کرایا پیاز کترنے کی مشہور ماہر مس نزہت جمال۔

انٹرویو کا پرانا انداز بھی اب فیشن باہر ہوا کہ سیاسی لیڈر کے پاس گئے تو اس سے سیاست کی باتیں پوچھ رہے ہیں۔ ادیب کا انٹرویو ہے تو ادب سے متعلق باتیں پوچھی جا رہی ہیں۔ بننے کا ہے تو آئے دال کا بھاؤ زیر بحث ہے اور بزاز کا ہے تو چار گرہ کپڑے کی قسمت پر گفتگو ہے۔ اب یہ مطلوب

خلاف آداب ظہر ہے۔ پچھلے دنوں ایک صاحب نے جوش ملیح آبادی کا انٹرویو لیا اور یہ پوچھ کر چلے آئے کہ وہ آم کیسے کھاتے ہیں اور بیڑ کیسے گنتے ہیں اور جس گھڑی کو سامنے رکھ کر شام کو شراب پیتے ہیں وہ کس کارخانے کی بنی ہوئی ہے اور سر کے بال جب قائم تھے ان میں کون سا تیل لگاتے تھے۔ دفتر آ کر یاد آیا کہ کچھ گفتگو ادب اور شاعری کے متعلق بھی کرنی چاہیے تھی۔ لیکن تب تک وقت گزر چکا تھا۔ ایک صاحب نے مولانا مودودی کا انٹرویو بھی کیا تھا۔ بڑی مشکل سے اجازت ملی۔ ان کے ارد گرد ان کے عقیدت مند اور جماعت اسلامی کے سرکردہ لیڈر بھی ملفوظات سننے کے مشتاق بیٹھے تھے۔ آخر انٹرویو ہوا رپورٹرنے پوچھا کہ حضرت قبلہ! میں آپ کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ ان کی جلد سازی کون کرتا ہے؟ آپ کی شخصیت میں مجھے بڑی جاذبیت محسوس ہوتی ہے۔ آپ شیعروانی کہاں سے سلواتے ہیں؟ آپ کی محبوب تو تھ پیسٹ کون سی ہے جو تانے کتنے نمبر کا ہے؟ انٹرویو خاصہ دور جا چکا تھا کہ ایک صاحب نے ٹھوکا دے کر رپورٹر کے کان میں کہا کہ مودودی صاحب دینیات کے مفسر بھی ہیں۔ ایک آدھ سوال اس موضوع پر بھی چاہیے۔ تب ان صاحب نے سوال کیا کہ مولانا! اسلام کے پانچ ارکان کیا کیا ہیں۔ ذرا گنوائیے تو۔ اور کلمہ طیبہ کیا چیز ہوتی ہے؟

انٹرویو کے علم دریاؤ کا دوسرا اصول یہ ہے کہ کسی مسئلے پر جامع اور بے لاگ رائے چاہیے تو ایسے آدمی سے لینی چاہیے جو اس سے تعلق نہ رکھتا ہو تاکہ تعصب اور جانبداری کا شائبہ نہ آجائے۔ پچھلے دنوں ایک اخبار کے رپورٹرنے ہم سے پوچھا کہ مشرق وسطیٰ کو کھالوں کی برآمد کے کیا امکانات ہیں؟ ہم نے کہا بھیا ہم سوداگرچہ نہیں۔ ادیب ہیں۔ یہ سوال تم حاجی رحمۃ اللہ برکت اللہ سے پوچھو۔ ہم سے تو میر و مصحفی کے متعلق کوئی سوال کرنا ہو یا جدید شاعری کا کوئی مسئلہ ہو تو گفتگو کرو۔ فرمانے لگے ادبی مسائل کے انٹرویو میں جوڑ یا بازار میں مکمل کر چکا۔ حاجی رحمۃ اللہ سے بھی مل آیا ہوں اور ان سے نئے ادب کے اسالیب پر سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے۔ آپ تو کھالوں کے متعلق بتائیے۔ اس میں عذر رہے تو یہ ارشاد ہو کہ یونس واؤچہ کا بھاء چڑھنے کا اسناک مارکیٹ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ ہمیں یقین ہے کہ یہ لوگ غالب کے زمانے میں ہوتے تو ان سے یہی سوال کرتے کہ اپنی کھاہ پاپاخ آپ کس دکان سے دھلاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک رپورٹر کو ہم نے ایک کونھی کی باورچن سے یہ سوال کرتے سنا کہ بی بی شکیمیر کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے۔ اور غالب کی برہان قاطع میں تیرے نزدیک کیا کیا غلطیاں ہیں؟

زائدہ بٹ صاحبہ نے ایک سانس میں اپنی پسندیدہ اشیا کی فہرست جو گنتائی ہے، یہ بھی انٹرویو نگاری کا ایک تازہ اسلوب ہے۔ ہم نے پچھلے چھ ماہ کے اخباروں سے لوگوں کی چند کی کچھ اور مثالیں بھی

جمع کی ہیں۔ تازہ خواہی داشتن گرداغ ہائے سینہ را۔

ایک صاحب نے کہا:

مولانا راشد الخیری کی کتابیں۔ کبڈی۔ آم کا اچار۔ لارل ہارڈی۔ مین کے پکوڑے۔ اور
ماؤز سے تنگ۔

ایک بزرگ نے فرمایا:

مولانا مودودی کی تعلیمات۔ صوفیہ لارین۔ اصلی گھی کی جلیبیاں اور بانا کے جوتے۔

ایک بھلے مانس بولے:-

مرزا غالب۔ پودینے کی چٹنی۔ تمباکو والا پان۔ راگ بھائیشری اور گو بھی کا پھول۔

اور یہ آخری فہرست ہماری فلموں کی ایک مشہور رقاصہ نے اپنے انٹرویو میں دی۔
بھولو پہلوان۔ کیوی بوٹ پالش۔ نظریہ اضافیت۔ کچی کیریاں اور ہشتی زلیور۔

اخبار کل اور آج کے

ہمارے مہربانوں میں ایک بزرگ ہیں پرانے خیال کے۔ وقتاً فوقتاً آ کر ہمیں قرب قیامت کی بشارت دیتے رہتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو قیامت کی تاریخ بھی ڈال جاتے ہیں۔ ہمیں زندگی کا بیمہ کرانے سے بھی انہی نے باز رکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ پریم کی قسطیں ڈوب جائیں گی۔ کیونکہ پالیسی کی معاوضہ ہونے سے پہلے قیامت کا آنا یقینی ہے اور محشر کے اتنے بڑے میدان میں آپ کمپنی والوں کو کہاں تلاش کرتے پھریں گے کہ لاؤ میرے پیسے۔ ان کی مقررہ کردہ قیامت کی تاریخ ٹل جاتی ہے تو فرماتے ہیں کہ کسی نیک آدمی کے اعمال آڑے آ گئے۔ لیکن یہ بات کچھ ایسے ناگوار لہجے میں کہتے ہیں جیسے 'نیک' سے ان کا مطلب ناپاک راہی ہے۔ ہمیں زبان حال سے وہ ہمیشہ یہی کہتے نظر آئے کہ قیامت کو آنا ہے تو ہمارے جیتے جی آئے ہمارے بعد آئی تو کیا آئی۔ ان کا بس نہیں چلتا ورنہ خود ہی اٹھا کر ضرور پھونک دیں۔

قیامت آنے کی جتنی نشانیاں پہلوں نے مقرر کی ہیں، ہمارے ان بزرگ کے نزدیک نہ صرف وہ سب کی سب پوری ہو چکی ہیں بلکہ اتنی کچھ فالتو وجوہات بھی جمع ہو گئی ہیں کہ شاید ایک قیامت میں پورا نہ پڑے۔ ان کے منانے کے لئے دو تین آئیں۔ ان کی ذاتی رائے تو اس سے بھی آگے کی ہے۔ وہ یہ کہ ہر دوپٹے کے پیچھے جو سر سے سرکتا ہے اور ہر چولی کے لئے جو اونچی ہوتی ہے، ایک سالم قیامت کا آنا واجب ہو جاتا ہے۔ خیر دوپٹوں اور چولیوں کے قیامت ڈھانے کی بات تو ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ بلکہ کئی بار تو کسی بت کا فرق قیامت خیزی کے عالم میں دیکھ کر رحم بھی آیا اور یہ خیال بھی کہ اسے اپنے دست حق پرست پر مسلمان کیجئے اور اس کی عاقبت سنواریئے۔ لیکن پھر دیکھا کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ اکثر تو تبلیغ شروع کرنے کے پہلے دوسرے روز ہی ہمارا اپنا ایمان متزلزل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور قشقہ لگا کر دیر میں بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔

بے حیائی اور بے مردوقی، جھوٹ بولنا اور پورا نہ تولنا وغیرہ دھمیں پرانی ہوتی دیکھ کر ہمارے ان مہربان نے قیامت کو جلد تر وقوع میں لانے کے اور بہانے ڈھونڈنے شروع کر دیئے ہیں۔ ابھی کل

ہی ہمارے پاس تشریف لائے اور بولے ”ہائے۔ ہائے اخبار والوں نے اردو کا کیا سیتا اس کیا ہے۔
 معنی اور صحیح عبارتوں کی تو ان لوگوں کو کیا توفیق سیدھی سیدھی عبارت میں بھی الما غلط انشا غلط اخبار پڑھو تو
 یوں لگتا ہے جیسے مسلسل منڈیوں کے بھاؤ پڑھے جارہے ہیں۔ ہمیں خدا نے زبان کا یہ حشر ہوتے دیکھنے
 سے پہلے کیوں نہ اٹھالیا۔ پھر اپنے محبوب موضوع کی طرف آتے ہوئے بولے۔ یہ قیامت بھی کم بخت
 نہیں آ پاتی۔ خراب تو اسے آنا ہی پڑے گا۔ بھلا یہ اردو ہے؟ فلاں نے فلاں کو چیلنج کر دیا۔ رٹ فائل کر
 دی۔ کورم ٹوٹ گیا۔ اخبار کی عبارت تو ایسی ہونی چاہیے کہ پڑھنے والا طلسم ہو شرابا کی طرح پڑھتا
 جائے۔ ہاتھ سے رکھنے کو جی نہ چاہے۔

ہم نے جان کی اماں پا کر عرض کیا کہ جیسی عبارتیں آپ فرماتے ہیں وہ فسانہ عجائب قصہ گل
 یا صنوبر وغیرہ ہی میں نیچتی ہیں اخبار میں تو مرنے مارنے۔ لپاؤ کی وغیرہ کی خبریں ہوتی ہیں یا پھر اقتصادی
 تبصرے۔ یعنی آٹے دال کا احوال آ جاتا ہے۔ اس پر انہوں نے فوراً ہمارا قطع کلام کر کے اپنے تھیلے میں
 سے ایک بوسیدہ پرچہ نکالا اور فرمایا۔ دیکھو اس طرح سے کہتے ہی بخور سہرا۔ بات اس میں بھی آٹے دال
 کی ہے۔ لیکن سبحان اللہ کیا سلیقہ ہے۔

ہم نے کہا۔ ”کیا چیز ہے یہ کوئی داستان ہے؟“ فرمایا۔ ”داستان نہیں۔ اخبار ہے۔ پچھلی
 صدی میں لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ سحر سمری نام تھا اور ایڈیٹر تھے اس کے لالہ گھیر نرائن عیاش۔“
 ”پڑھیے۔“ ہم نے نیچاریگی سے کہا۔

”سینے“ وہ بولے۔ ”ان دنوں غلہ کی گرانی ہے۔ گرانی خاطر کی فراوانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج
 ہے۔ آسپائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔ فائدہ کشوں کی برق آہ شر پار سے خرمن ماہ چل گیا۔ گروہ نادان
 خورشید غم کے پاؤں کے نیچے کچل گیا۔ بے قماش نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا۔ جس نادان دوانا
 نے حال بربادی سنارودیا۔ ایک تو معاش نہیں جائے تلاش نہیں۔ دوسرے دفور غم سے گندی رنگ ہر بشر کا
 نیلا ہوا۔ گویا مفلسی میں آنا گویا ہوا۔۔۔۔۔ خون دل بجائے شراب ہے۔ لخت جگر کباب ہے۔ چکنی چپڑی
 باتوں سے تدبیر نہیں چلتی۔ بہت سر پکٹتے ہیں۔ دال نہیں لگتی۔ حاکم اس طرف عنان توجہ موڑتا نہیں۔ بس
 کیا کریں اکیلا چنا بھاڑ پھوڑتا نہیں۔“

ہم نے کہا۔ بس بس۔ آپ کا مطلب ہم سمجھ گئے۔ فرمایا۔ ”آپ نے دیکھا نہیں۔ آسپائے
 فلک نادان دوانا۔ گندی رنگ۔ اکیلا چنا۔ اس میں کتنی رعائیں آگئی ہیں۔ انسان گڑ نہ دے گڑ کی سی
 بات تو کرے۔“

ہمیں معلوم نہیں یہ اخبار روز نامہ تھا یا ہفتہ وار یا مرضی دار یعنی جب ایڈیٹر کی مرضی ہوئی نکال دیا۔ ہمارے تصور میں اس اخبار کے دفتر کا نقشہ کچھ یوں آتا ہے کہ دو تین بزرگ چوکی بچائے کاغذ کے تاؤ سامنے رکھے بیٹھے ہیں۔ افیم کی پیالیاں پاس پڑی ہیں۔ ایک طرف برقی کا دو تا۔ گنڈیریوں کا جھبیا دھرا ہے اور چراسی نے ابھی ابھی حقے پر چلم لاکر رکھی ہے۔

ایڈیٹر صاحب پوچھتے ہیں۔ ”اماں کتنا ہو گیا۔ کیا خبر دے رہے ہیں۔“

سب ایڈیٹر صاحب ”حضرت وہی آنے وال کی گرانی والی خبر ہے“

ایڈیٹر:- ”کہاں سے لی تھی یہ خبر۔“

سب ایڈیٹر:- ”ابھی ابھی چندو خانے سے سن کر آیا ہوں۔ بہت معتبر ہے۔“

ایڈیٹر:- ”اور کیا کیا مواد ہے اس پرچے میں۔“

سب ایڈیٹر:- ”حضور غزلیں ہیں فیض آباد والے مشاعرے کی۔ ایک داستان ہے جو مسلسل

چل رہی ہے اپنے مرزاغن کی۔ طلسم حیرت کشا۔ ابھی دو سال اور چلے گی انشاء اللہ۔“

ایڈیٹر:- ”ایڈیٹوریل کس چیز پر لکھیں۔“

سب ایڈیٹر:- ”اب کے ایٹائے جلی پر لکھئے۔ آپ کے حریف ہیں نہ میر مجنوں ان کے

شاگردوں کے ہاں آج کل ایٹائے جلی کی بھر مار ہے۔ بلکہ اب کی تو ایڈیٹوریل پورا منظم ہونا چاہیے۔“

ایڈیٹر:- ”نہیں۔ نہیں۔ یہ نیاز مانہ ہے۔ روم اور روس میں ساہے لڑائی ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ

ایسا ایڈیٹوریل لکھتا ہوں کہ روس کے چھکے چھوٹ جائیں۔“

سب ایڈیٹر:- ”ہاں۔ ہاں۔ سبحان اللہ۔ اب کے پرچہ کس تاریخ کو نکالنے کا ارادہ ہے“

ایڈیٹر:- ”جب چاہیں گے نکالیں گے۔ ہم ایڈیٹر ہیں۔ خربہ اوروں کے باپ کے نوکر تھوڑا ہی

ہیں۔“

پچھلی صدی کے اخبار بے شک اردو میں نہیں، اردوئے معلے میں ہوتے تھے۔ نئے زمانے کی آ پادھانی نے زبان کا لطف غارت کر دیا۔ اس زمانے میں سنی سنائی خبروں اور چندو خانے کی گفتگو اخبار بھرنے کے لئے بہت تھی۔ اب ادھر تا ر آر ہے ہیں۔ ٹیلی پرنٹر کھا کھاٹ چل رہا ہے اور فون کی تھننی بج رہی ہے۔ خبروں کا پشمارہ ہوتا ہے جو میسج نہیں سمٹتا۔ پرانے دفینوں کا ماحول بھی بہت پرسکون ہوتا تھا۔ کاتب بیٹھا لکھ رہا ہے۔ ایڈیٹر کو آواز دی۔ ”حضور پاؤ کا لم رہ گیا ہے۔ اس کے لئے میٹروے

دیجئے۔“

ایڈیٹر پکارتا ہے۔ ”لکھو۔ آج چوک میں دو تانگوں کی نگر ہوگئی۔ تین آدمی زخمی ہو گئے، ایک کی حالت خراب ہے۔ آگے خود بڑھالو۔“

تھوڑی دیر بعد کاتب پھر پکارتا ہے۔ ”جناب دو تین سطر میں پھر بھی خالی بجتی ہیں۔“

ایڈیٹر صاحب فرماتے ہیں۔ ”اچھا ان میں اس خبر کی تردید دے دو کہ ہم نے تحقیق کی۔ یہ خبر سراسر غلط ثابت ہوئی۔“

اُس زمانے کے خریداروں اور پڑھنے والوں کو بھی اللہ نے بہت فرصت دی تھی۔ ایک خبر کو بار بار پڑھتے تھے۔ سارا اخبار اوپر کی سرخی سے پرنٹ لائن تک چاٹ جاتے تھے اور زبان و بیان، قافیہ ردیف کی خوبیوں پر سردھنتے تھے۔ ان کے لئے آنے کی مہنگائی بجائے خود کوئی خبر نہ ہوتی تھی۔ یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ لکھنے والے نے اس میں تلازموں اور عبارت آرائی سے کیا رنگ پیدا کیا ہے۔ آج کل تو خبریں ہی اتنی ہوتی ہیں کہ ان کے خلاصے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ اوپر کی خبر زیادہ سے زیادہ اتنی رہ جائے گی۔ ”آٹا مہنگا ہو گیا لوگ پریشان ہیں۔“ بلکہ اتنی بھی نہیں۔ ”آٹا مہنگا ہو گیا“ کافی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ لوگ آٹا مہنگا ہونے سے پریشان ہوا کرتے ہیں۔ آگے چل کر مزید اختصار کرنا پڑے گا۔ محض آٹا لکھ دینا کافی ہوگا کیونکہ مہنگائی کا سبھی کو علم ہوتا ہے۔ آپ نے اس دکاندار کا قصہ سنا ہوگا، جس نے اپنی دکان پر لکھوار لکھا تھا۔ ”یہاں تازہ مچھلی فروخت ہوتی ہے۔“ ایک صاحب نے کہا۔ ”یہاں“ کا لفظ زائد ہے۔ سبھی کو معلوم ہے کہ مچھلی یہاں فروخت ہوتی ہے، کہیں اور نہیں۔ دکاندار نے یہاں مٹا دیا۔ ایک دوسرے منطقی آئے۔ بولے ”فروخت ہوتی ہے۔“ زائد ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دکانوں پر مچھلی فروخت ہوا کرتی ہے، خریدی نہیں جاتی۔ ان کی تفصیل ارشاد میں فقط ”تازہ مچھلی“ کے الفاظ رہ گئے۔ ایک اور ہمدرد نے کہا۔ بھائی لفظ تازہ بھی زائد ہے۔ تم باسی تھوڑا ہی بیچو گے۔ ایماندار آدمی ہو۔ اب فقط مچھلی رہ گیا۔ ایک بزرگ عمر نے یہ بھی کٹوا دیا۔ کہا دو فر لاکھ سے بوہی بتا دیتی ہے کہ یہاں مچھلی بکتی ہے، عطر نہیں۔ چنانچہ وہ بھی مٹا دیا گیا۔ خیال کہتا ہے۔ آئندہ خبروں کے کالم میں فقط سرخیاں ہوا کریں گی۔ ”ویت نام“ لڑائی جا رہی ہے۔ ”آٹا مہنگا“ ڈیکال کامیاب، مشرقی پاکستان طوفان، صدر جاسن پریشان، ماؤزے تنگ خوش۔“ بلکہ شاید یہ بھی نہیں۔ کیونکہ یہ باتیں سبھی کو معلوم ہیں۔ اچھا ہی ہے۔ اخباروں میں قسمت کا حال بتانے کے لئے اور منڈیوں کے بھاؤ کے لئے اور اشتہارات کے لئے اور جگہ نکل آئے گی۔ جو آج کل خبروں میں ضائع ہو جاتی ہے۔

سورج کا ڈبہ گول ہو گیا

اخبار میں ایک برطانوی سائنسدان کا بیان آیا ہے کہ سورج کی معیاد ختم ہونے والی ہے۔ ایک روز یک لخت اس کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اس کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ صبح گیا یا شام گیا۔ یہ خبر پڑھ کر ہماری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا کیونکہ اس امر کے باوجود کہ ہمیں سورج پر بعض اعتراض ہیں، اس کی خوبیاں اظہر من الشمس ہیں۔ مثلاً یہی کہ نہ اس میں تیل پڑتا ہے نہ بجلی کا خرچ ہے پھر بھی اچھی خاصی روشنی دیتا ہے۔ ہمارا اس پر اعتراض فقط یہ ہے کہ یہ غلط وقت پر نکلتا ہے۔ یعنی صبح چھ سات بجے جبکہ ہماری بھرپور نیند کا وقت ہوتا ہے۔ اگر دوپہر کو یا شام کو نکلا کرے تو کتنی اچھی بات ہو۔ لیکن کوئی نہ کوئی نقص تو ہر چیز میں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کہتے ہیں داغ تو سورج میں بھی ہوتا ہے۔

سورج اگر ختم ہو گیا تو اس کے عواقب بڑے سنگین اور دور رس ہوں گے۔ عام لوگ تو اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ سب سے زیادہ زد تو دھو بیوں پر پڑے گی۔ کیونکہ ان بچاروں کا تو روزگار ہی کپڑے دھونا ہے۔ دھو تو خیر لیں گے سکھائیں گے کیسے؟ دوسری کاری ضرب ان کارخانوں اور دکانوں پر پڑے گی جو چھتریوں بناتے بیچتے ہیں۔ ٹھنڈی بوتلوں والوں کا کاروبار بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پھر اس کا اثر دنیا کے علاوہ دین پر بھی پڑنے کا اندیشہ ہے۔ رمضان شریف کے دنوں میں سورج بڑے کام آتا ہے۔ روزہ رکھنے میں تو خیر کوئی ایسی مشکل نہیں کیوں کہ تر کے رکھا جاتا ہے۔ لیکن لوگ کھولا کیسے کریں گے؟ اس کے لئے تو غروب آفتاب کی شرط ہے۔ ہم اپنے دوست خوبہ عبدالغنی بیدل کے بارے میں بھی فکر مند ہیں۔ ان کا اصول ہے کہ صبح ستاروں کی چھاؤں میں چرند پرند کے ساتھ اٹھ بیٹھتے ہیں اور سورج نکلنے تک سیر اور ورزش کرتے ہیں۔ نہ سورج ہونہ نکلے۔ ظاہر ہے قیامت تک سیر کرتے رہیں گے۔ یا ذنر چیل چیل کر بے حال ہو جائیں گے۔ اب تو لوگ تاریکی سے گھبرا کر سویرا ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔ آئندہ رات کے ہونے کی تمنا کیا کریں گے۔ کیونکہ رات کو کم از کم چاند تو ہوتا ہے۔ دن میں تو تارے تک نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں تو ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ مویوں کو بھی مال کی کمی پڑ گئی تو پاپوش میں کس چیز کی کرن لگایا کریں گے۔ اور ہم اردو کے محاورہ دان آئندہ کس چیز کو چراغ دکھایا کریں گے؟

ہم ان سائنسدانوں کے ہاتھوں بہت تنگ ہیں۔ کبھی کہتے ہیں۔ دنیا ختم ہونے والی ہے۔ سامان باندھ لو۔ تیار رہو۔ کبھی فرماتے ہیں۔ سورج کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اس کے سر ہانے یسین پڑھو کہ عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے۔ ہمیں تو یہ ساری ان برطانوی سائنسدان صاحب کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ برطانیہ کے اقبال کا آفتاب کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔ لیکن پھر غروب ہوتا

شروع ہوا تو ہوتا ہی چلا گیا۔ اب انگریز کہتے ہیں کہ ہم تو ڈوبے ہیں میاں تم کو بھی لے ڈوئیں گے۔ یہ تو خیر ہمارا نظریہ ہے۔ یقین ہے آگے چل کر اس سلسلے میں اور نظریے بھی سامنے آئیں گے۔ امریکہ کو بین الاقوامی کمیونزم کی سازش نظر آئے گی کہ اندھیرا کر کے یہ لوگ ہم پر میزائل پھینکنا چاہتے ہیں۔ روس امریکی سامراج کی سازش کا سراغ لگائے گا کہ اب امریکہ کے تیل کے اجارہ داروں کی بن آئے گی۔ مٹی کا تیل غریب ملکوں میں جس بھاؤ چاہیں گے بیچیں گے۔ پینکٹ ذیلی کا وقائع نگار سیاسی یوں بھانڈا پھوڑے گا کہ یہ امریکی امپیرلسٹوں اور روسی ترمیم پسندوں کی ملی بھگت ہے کیونکہ چین مشرق کی طرف ہے اور سورج مشرق ہی سے نکلا کرتا تھا۔ کچھ لوگ ریڈ کارڈز کی جلد بازی اور بے تیزی کو بھی اس کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔ جن سنگھ والے فوراً بھانپ جائیں گے کہ اس واردات کے پیچھے ہندوستانی مسلمان ہیں اور پاکستان ہے۔ یہ لوگ گائے کو کاٹ کر تو ہم بیوں کی چھاتی پر مونگ دلا ہی کرتے تھے، اب سورج کی بھی جڑ کاٹ رہے ہیں تاکہ ہمارے دھرم میں کھنڈت پڑے کیونکہ یہ کسے معلوم نہیں کہ ہم لوگ پراچین زمانے سے چڑھتے سورج کی پوجا کرتے آئے ہیں۔

اتنا بڑا واقعہ ہو جانے پر ہر طرف ہلچل سی مچ جائے گی۔ اخبارات سورج نمبر نکالیں گے۔ ہا کر آواز لگاتے پھریں گے۔ ”ہو گیا۔ ہو گیا۔ سورج کا ڈبہ گول ہو گیا۔“ بیانیوں میں ہر چیز کا خیر مقدم کرنے والے اب کے بھی یہ بیان دیں گے۔ کہ ہم سورج کے ختم ہونے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اب سب کو مل کر صدر ایوب کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہیں۔ اپوزیشن والے کہیں گے۔ ”بالغ حق رائے دہندگی کو نظر انداز کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا تھا۔“ چودھری خلیق الزاں بیان دیں گے کہ ”میں نے لارڈزٹ لینڈ کو ۱۹۲۱ء ہی میں بتا دیتا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔“ ڈاکٹر عاشق حسین بنالوی فرمائیں گے کہ ”علامہ اقبالؒ نے مجھے اور ملک برکت علی مرحوم کو ہدایت کی تھی کہ سورج کا خیال رکھنا۔ اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ لیکن رئیس امر وہوی اپنے ہفتہ وار کالم میں بتائیں گے کہ سورج کے نہ ہونے کا خوابوں کی نفسیاتی تحلیل پر کیا اثر پڑے گا۔ جمیل الدین عالی انسٹیکلو پیڈیا اور تاریخ نگہری کے حوالے دے کر بتائیں گے کہ سورج بڑی پھولی چیز ہے۔ آشوریوں اور قدیم رومنوں کے دنوں میں بھی اس کا وجود تھا۔ وہ اس کے سارے نام بھی گنا جائیں گے کہ اسے اشتر، مجھوس، مقہار، بدلوک، مشہاری، شقلون، سقلاوہ اور قرقراف کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ ایک بیان حضرت اسلام سلمانی بی اسے کا بھی آنا ضرور ہے کہ اس واقعے کے بعد مجاہدوں کے ریٹ میں

اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے اور میں ہیرڈریس برادری سے سورج کے متبادل انتظامات پر تبادلہ خیالات کرنے کے لئے عنقریب مغربی پاکستان کا طوفانی دورہ کروں گا۔

ہم نے اس خبر کا صرف ضروری حصہ کالم کے شروع میں دیا ہے ورنہ تو خبر لمبی ہے۔ اور اس میں بہت سی فروعی تفصیلات ہیں۔ جن سے ہمیں یا ہمارے قارئین کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً یہی کہ یہ حادثہ آج سے تین کروڑ سال بعد پیش آئے گا۔ اگر آتا تو!۔

باعث تحریر آنک

لاہور میں عرائض نویسوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس کی صدارت جسٹس انوار الحق صاحب نے کی اور اس سے خطاب کرنے والوں میں ہمارے مکرم ڈاکٹر سید عبداللہ بھی شامل تھے۔ یہ قیاس کرنا غلط ہوگا کہ ہمارے یہ دونوں واجب الاحترام بزرگ کسی کچہری کے آگے چوکی رکھ کر اور چھتری تان کر عرضیاں لکھتے ہیں لہذا اس تعلق سے بلائے گئے ہوں گے۔ سید عبداللہ بے شک وقتاً فوقتاً حکومت اور ملت کے دربار میں عرضیاں دیتے رہتے ہیں کہ اردو کو فوراً دفتروں اور کالجوں میں جگہ دی جائے۔ لیکن جسٹس انوار الحق صاحب کی توہائی کورٹ کے نام سے اپنی کچہری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کا مقدمہ سرکار دربار میں پیش ہو اور گواہ عشق طلب ہوں تو وہ بھی کاغذی پیرہن زیب تن کئے ہوں اور مستثنیٰ کی صف میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے دوش بدوش کھڑے نظر آئیں۔ بہر حال اس جلسے میں یہ حضرات شریک ہوئے یہ کہنے کے لئے کہ جب اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے۔ تو پھر مشاہدہ کس حساب میں ہے۔ یعنی مدعی پاکستانی مدعا علیہ پاکستانی۔ منصف پاکستانی، وکیل پاکستانی پھر عدالت کی زبان انگریزی کیوں؟ اردو کیوں نہیں؟

اب سن رہے ہیں کہ عرائض نویس اپنی تنظیم الگ بنا رہے ہیں جس کا نام پینشن ریسٹرز گلڈ ہوگا۔ جب راسٹرز گلڈ بنی ہے۔ اس وقت ہم نے سفارش کی تھی کہ اس میں عرضی نویسوں اور نسخہ نویسوں یعنی ڈاکٹروں کو بھی شامل کرنے میں مضائقہ نہیں۔ آخر یہ لوگ بھی کچھ نہ کچھ لکھتے ہیں۔ کم از کم ان لوگوں سے تو اچھے ہیں جو کہلاتے ادیب ہیں لیکن اب ایک زمانے سے کچھ نہیں لکھتے۔ کوئی ایسا ہے جس نے اپنی آخری تحریر ۱۹۲۲ء میں لکھی تھی۔ کسی کا کوئی مضمون ۱۹۳۲ء کے یو پارگنز جیلپور کے سالنامے میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ کوئی ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ غزلیں کہا کرتا تھا۔ اگر کہو کہ صاحب آپ اب کیوں نہیں لکھتے تو جواب دیتے ہیں کہ ایک تو قدر نہیں ہے۔ دوسرے فرصت نہیں ہے۔ اتنا تھوڑا ہے کہ ہم نے راسٹرز گلڈ کی ممبری کا فارم اپنے ہاتھ سے بھرا ہے کسی اور سے نہیں بھروایا اور دستخط بھی بقلم خود کئے ہیں۔ اس زمانے میں جو خواتین گلڈ کی ممبر بنیں ان میں سے کچھ تو واقعی ناول افسانہ یا غزل لکھتی تھیں لیکن ایک بی بی ایسی بھی ملیں

جن سے ہم نے پوچھا کہ آپ کیا لکھتی ہیں تو بولیں۔ گھر میں دھوبی کا حساب لکھتی ہوں جی۔

قصہ مختصر یہ کہ ہم نے عراقی نوویسوں کی بہت وکالت کی کہ ان کو گلڈ کا ممبر بنایا جائے لیکن ہمارے دوسرے رفیق نہ مانے۔ اس میں کچھ شبابہ حسد کا بھی ہوگا۔ کیونکہ جس طرح کی قاعدے کی عبارت عراقی نوویس لکھتے ہیں اس کے لئے مشق اور ریاضت درکار ہے۔ یہ نہیں کہ قلم اٹھایا اور افسانہ

گھسیٹ دیا۔ الما غلط۔ انشا غلط۔ ہم خود ایک زمانے سے لکھتے ہیں لیکن یہی آسان آسان چیزیں نظم غزل، مضمون وغیرہ۔ ایک باز ایک عرضی لکھنے کا اتفاق ہوا تو قدر عافیت معلوم ہوئی۔ عدالت نے اسے دیکھتے ہی واپس کر دیا کہ اس میں میں میں کی بجائے فردی لکھ کر لایئے اور نیچے العبد لکھ کر دستخط کیجئے اور باعث تحریر آنکہ اور منکہ سے اسے شروع کیجئے۔ اور بڑی بات یہ کہ خوشحالی کا روناویوں میں نہیں چلتی۔ اسے خط شکستہ میں لکھ کر لایئے تاکہ پڑھی نہ جاسکے۔ آپ کی عرضی تو کوئی بچہ بھی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔

ہمارے مفید اور مفت مشورے نہ گلڈ کے قیام کے وقت چلے نہ اب ان کی کچھ قدر ہے۔ ہم نے سفارش کی تھی کہ گلڈ ایک طرف تو ان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرے جن کو لکھنا چاہیے دوسری طرف ان کا کچھ تدارک کرے جو ہر مہینے ایک تروتازہ ولولہ انگیز اسلامی تاریخی ناول اپنی زنجیل سے یوں نکالتے ہیں جیسے مداری اپنی ٹوپی میں سے خرگوش نکالتا ہے۔ ان ناولوں میں فقط نام مقام مختلف ہوتے ہیں مضمون اور پلاٹ واحد ہوتا ہے۔ ہیر و شمیر زنی میں بھی ماہر ہوتا ہے۔ معاملات عشق میں بھی جدھر سے گزرتا ہے، ایک طرف کفار کے کشتوں کے پستے لگتے جاتے ہیں، دوسری طرف شہزادیاں مشرف بہ اسلام ہوتی جاتی ہیں۔ تاکہ ہیر و اور اس کے جاں نثار ہمراہیوں کو ضرورت رشتہ کے سلسلے میں زیادہ محسوس نہ کرنا پڑے۔ قاری پڑھتے پڑھتے دین و دنیا دونوں کے مزے لوٹتا ہے۔ دمشق و غرناطہ کی فضاؤں پر پرواز کرتا رہتا ہے۔ لیکن جو نئی ناول ختم ہوتا ہے دھڑام سے سر زمین حقیقت پر آگرتا ہے اور بعض اوقات تو خاصی چوٹ لگتی ہے۔ عراقی نوویسوں کی تحریروں میں کم از کم ایسا خطرہ جان و ایمان تو نہیں۔ عالی صاحب کو چاہیے کہ عراقی نوویسوں کی بغاوت کو فرد کریں۔ اور ان کو رائٹر گلڈ کے سیاہ عاطفت میں جگہ دیں۔

حکیم نقل بطورا

آج صبح ہم نے اخبار کھولا تو اس میں کئی خوشی کی خبریں نظر آئیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کراچی کے ہسپتالوں کو سختے کے کاٹے سے بچاؤ کی دوا یعنی سیرم نومبر سے ملنے لگے گی۔ دوسری یہ کہ کراچی کارپوریشن نے پبلک کے پرزور اصرار پر وسط ستمبر سے شہر کی صفائی کی مہم شروع کرنے کا محکمہ ارادہ کر لیا ہے۔ کیونکہ اکتوبر میں دس سال ترقیات کے جشن منائے جاتے ہیں۔ ایک اخبار میں کے ڈی اے کی سرگرمیوں کے متعلق چار صفحے کا ضمیمہ بھی دیکھا جس میں کے ڈی اے کے محکمہ پانی کے انجینئر کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ اس میں پہلی بار یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ شہر کی شادابی کے لئے پانی از بس ضروری چیز ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ خود کو کتوں سے کوانا چاہتے ہیں، وہ نومبر تک انتظار کر لیں۔ اس کے بعد اپنا شوق بتنا جی چاہئے پورا کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس اعلان کی نقلیں کتوں میں بھی تقسیم کر دی گئی ہوں گی تاکہ اپنا منہ بند رکھیں۔ دہن سگ نہ اعلان دوختہ بہ۔ کورنگی سے ایک صاحب کتوں کے لئے ”کٹا گزٹ“ نکالنا چاہتے تھے اور اس کی کثیر الاشاعتی کے بارے میں بڑی امیدیں رکھتے تھے۔ اگر وہ نکل آیا ہو تو یہ اعلان جلی حروف میں اس میں چھاپ دینا چاہیے ورنہ ہم اہل شہر کو مشورہ دیں گے کہ آج کا اخبار ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کریں۔ جو نہی کوئی کتا ان کی طرف لپکے۔ اسے ڈانٹ دیں کہ ڈرور موئے۔ یہ دیکھ اعلان آ گیا ہے کہ نومبر تک کا منامع ہے۔ کیونکہ ابھی دوا نہیں بنی ہے۔ ٹیلیوژن پر بھی اس کی تشہیر ضروری ہے۔ کیونکہ بڑے گھروں کے تو کتے بھی باقاعدگی سے ٹیلیوژن دیکھتے ہیں۔

اب رہی کراچی کارپوریشن کی صفائی کی مہم، کارپوریشن والے سیدھی انگلی یہ اعتراف کیوں نہیں کر لیتے کہ انہیں اس کا خیال ہمارا کالم پڑھ کر آیا ہے اور عشرہ ترقیات محض بہانہ ہے۔ ہم نے لاہور کا ذکر کیا تھا کہ وہاں جا بجا کوڑے کے ڈھیروں میں بانس کھڑے کر کے بینز پھیلا دیئے گئے ہیں کہ صفائی نصف ایمان ہے۔

تفصیلات پڑھنے پر معلوم ہوا کہ اس مبارک اور ضروری مہم کے لئے کارپوریشن کے ہیلتھ

ڈپارٹمنٹ انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ اور باغبانی ڈپارٹمنٹ کو کچھ نیند سے جگا کر کہا جائے گا کہ ہاں تو صاحبو دکھاؤ ذرا اپنے جوہر۔ بیلٹھ ڈپارٹمنٹ اس سلسلے میں کیا کرے گا۔ اس کا کچھ اشارہ بھی اس اعلان میں ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کو نوٹس دے گا کہ اپنے اپنے گھروں پر سفیدیاں کراؤ۔ جو نہیں کرائے گا اس کے..... وغیرہ وغیرہ..... اس سے یہ معلوم ہوا کہ دوسرے جگہ بھی نوٹس دیں گے لیکن کس بات کے اس بارے میں ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہمیں ڈر ہو گیا ہے کہ ہم نے سواری بیچنے کے لئے مانگی تھی کہیں اوپر کے لئے نڈل جائے۔ ہم نماز بخشوانے کی فکر میں ہیں، کارپوریشن روزے ہمارے گلے میں ڈالنے کی سوچ رہی ہے۔ ہم نے پوری خبر کو دوبارہ پڑھا۔ اس میں کہیں اس بات کا اشارہ نہیں کہ لوگ بھی چاہیں تو کارپوریشن کو نوٹس دے سکتے ہیں کہ اٹھواؤ کوڑے کے ڈھیر۔ کرو صاف تالیاں شہر کی۔ ایک صاحب نے تو ابھی سے یہ فال بد زبان سے نکال دی ہے کہ دیکھنا یہ کارپوریشن شہر والوں کو کھٹکی بنا کے جھوڑے گی۔

پچھلے دنوں اخبار میں اس قسم کی خبر بھی دیکھی کہ آئندہ ڈاکٹروں اور انجینئروں کو بلدیہ کے چیئرمین مقرر کیا جایا کرے گا۔ ہر چند اس خبر میں یہ ذکر نہیں کہ موجودہ چیئرمین اور وائس چیئرمین وغیرہ کسی اسپتال میں ڈاکٹر لگا دیئے جائیں گے۔ تاہم اس تجویز کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ آخر اتنے سارے ڈاکٹر کس مرض کی دوا ہیں۔ ان سے کچھ کام تو لینا ہی چاہیے۔ ہمارے ذہن میں کچھ اس قسم کا منظر آتا ہے کہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر ایم بی بی ایس خان (محمد باقر بن سلطان خاں) بلدیہ کے دفتر میں چیئرمین بنے بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سننے کے لئے سنسنی سے تھکاپ ہے اور دوسرے میں تھرمامیٹر جس سے اپنا کان کھجا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک اہلکار فائل بغل میں دا بے داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت خوش خلقی سے چیز اسی کو آڑ رو دیتے ہیں کہ دو کپ کوئین کچر کے بنا کے لاؤ۔

وہ صاحب عذر کرتے ہیں کہ میں ابھی پی کے آیا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ”ایک اور میں کیا ہرج ہے۔ کچر تو ہے، چائے تو نہیں کہ نقصان کرے۔ آپ کو کوئین کچر پسند نہیں تو فلو کچر بھی ہے۔ اچھا تو کیا بات ہے؟“

”جناب پرائمری اسکول چاہتے رچھوڑ لائن میں۔“

”کیا علامات ہیں؟“

”جناب بچے نا تعلیم یافتہ ہیں۔“

”ایکسرے کرایا؟“

”جی کس چیز کا؟“

”کس چیز کا؟ اسکول کے بچوں کا۔“

”جی وہ تو نہیں کرایا۔ کرائیں گے۔“

”دیکھئے صاحب۔“ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ اسکول کے لئے تو ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ فی الحال سارے بچوں کو جمع کر کے ایک ایک ٹیکہ پیسنے کا لگا دیجئے۔ بہت دوا ہے ہمارے پاس اور اسکول جہاں بنانا مقصود ہے، وہاں فی الحال ڈی ڈی ٹی چپڑک دیجئے۔“

وہ صاحب دوسری فائل آگے بڑھاتے ہیں کہ ابدالی روڈ کی حالت بہت خراب ہے۔ لوگ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ بعضوں کی تو ٹانگ بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ ”ہاں ہاں ابدالی روڈ کی حالت واقعی خراب ہے۔ جا بجا سے فیر کچر ہے۔ اس کا بھی ایکس رے کرنا ضروری ہے۔ فی الحال تو پولیس کی تہ جما کر پٹی باندھ دی جائے۔“

”جی سڑک کے؟“

”ارے نہیں۔ زخمی ہونے والوں کے۔“

اس مسند پر ڈاکٹروں کا حق ثابت ہے تو حکیموں کا کیوں نہیں۔ ہمارے مہربان فاضل طب حکیم نقل بطور اصحاب بھی اس کام سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ دفتر میں مسند بھی ہے۔ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ جو شخص فائل لے کر اندر آتا ہے، پہلے اس کی نبض دیکھتے ہیں۔ اسے جو شانہ سے کا پیالہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد احوال سنتے ہیں۔ ابکار یہاں بھی وہی بات دہراتا ہے کہ پرائمری اسکول چاہیے اور سڑک مرمت طلب ہے۔ حکیم صاحب فکر مند ہو کر فرماتے ہیں۔ ”جی ہاں۔ میں نے بلد یہ کے مسائل کا قاروہ دیکھا ہے۔ واقعی بڑی خراب حالت ہے۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ سارے عملے کو جلاب دینا پڑے گا۔“

اب رہا پانی۔ تو گویا ریسرچ اور تحقیقات کے بعد کے ڈی اے کے انجینئروں نے بھی یہ راز پایا ہے کہ شہر کی شادابی سے پانی کا قریبی تعلق ہے۔ یہ بات ہم نے بھی کبھی تھی لیکن ہم ٹیکنیکل آدمی نہیں ہیں۔ ہمارے پاس اس دعوے کے لئے ثبوت میں شواہد اور دلیلیں نہیں تھیں۔ بہر حال اس اہم انکشاف کے بعد کیا ہم توقع کریں کہ ہماری ٹنکی میں پانی آیا کرے گا اور علامہ اقبال ٹاؤن کے پارک کی طرف توجہ کی جائے گی۔ جس میں کتے لومتے ہیں بلکہ اب تو وہ بھی لومتے لومتے تنگ آ گئے ہیں۔

سرکاری یوم اقبال

ہمارے عزیز دوست جمیل الدین عالی دوہوں والے، تماشا مرے آگے والے نے اپنے ناطقہ کو سرگرمیاں کرتے ہوئے اخبار میں ایسا رقت انگیز مضمون لکھا ہے کہ جدھر جائے خلقت زار و قطار رو رہی ہے۔ سارا شہر دیوار گریہ بنا ہوا ہے۔ لیاری کی جھلیاں بہہ گئی ہیں اور محرم کی مجلسیں ماند پڑ گئی ہیں۔ ہم دوسروں کو کیا کہیں۔ ہمارا اپنا یہ حال ہے کہ یہ مضمون ہم لکھ نہیں رہے، ایک کرم فرما کو کھوار ہے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاتھ خالی نہیں۔ ایک تو یہ اس ہاتھ میں ہے۔ ایک اُس میں۔ بولتے جاتے ہیں اور اپنی اشک شونی کرتے جاتے ہیں۔

اس میں کچھ تاثر موضوع کی بھی ہے۔ ان کا یہ مضمون علامہ اقبال مرحوم کے بارے میں ہے اور خود علامہ مرحوم کے متعلق بھی وقائع نگار متفق ہیں کہ بات بات پر رو دیا کرتے تھے۔ جہاں قوم کا نام آیا ان کی آنکھوں سے اشک کا چشمہ رواں ہوا۔ عالی صاحب کا کالم جواب کے ذرا دھندلا دھندلا چھپا ہے اس کی وجہ بھی مشین کی خرابی نہیں۔ لکھنے والا کاتب بھی صاحب دل تھا۔ اس کے آنسو لکھتے میں کاغذ پر ٹپکتے گئے اور سیاہی پھیل گئی۔ مشین مین نے اسے درست کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بھی پڑھا لکھا تھا۔ قوم کا درد دل میں رکھتا تھا۔ سیاسی کو مزید پھیکا کرنے میں کچھ حصہ اس کا بھی سمجھئے۔

عالی صاحب پہلے سید ہا سید ہا مضمون لکھا کرتے تھے۔ مطلب اخذ کرنے کا کام قارئین پر چھوڑ دیتے تھے لیکن پڑھنے والوں نے کہا کہ جناب آج کل اتنی فرصت کسے کہ پڑھے بھی اور اس کا مطلب بھی سوچے۔ آج کل کالجوں یونیورسٹیوں تک میں تعلیم خلاصوں کے ذریعے اور امتحان گیس پیپروں کی مدد سے دیئے جاتے ہیں۔ آپ بھی اپنی بات کا خلاصہ آخر میں ایک دو تین نمبر ڈال کر لکھ دیا کیجئے۔ آخر حکایات لقمان والے لقمان اور گلستان سعدی والے سعدی بھی تو یہی کیا کرتے تھے۔ آج تک کسی نے اعتراض نہ کیا کہ قارئین پر کندہ پن کا گمان کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کے عالی صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں ضروری نکات مفید مشوروں کی صورت میں رقم کر دیئے اور یہ کام ایسا ہے کہ اس میں ان کا حریف کوئی نہیں۔ ان کی جو سانس آتی ہے اور جاتی ہے مفت مشوروں سے خالی نہیں ہوتی۔ "مولوی صاحب کا گھوڑا کے" مولوی صاحب کی طرح مشورہ دیا اور آگے چل دیئے۔ ہم نے کئی بار عرض بھی کیا کہ رک کر دیکھ لیا کیجئے۔ آپ کے مشورے کا نتیجہ کیا ہوا، کیا گل کھلا۔ لیکن

دریا کو اپنی موج کی خفیانوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

کراچی کے یوم اقبال کی عدیم المثال کامیابی سے خوش ہو کر جو سرکاری سرپرستی میں ہوا، عالی صاحب نے فرمایا ہے کہ آئندہ یوم اقبال برڈویشن، ہر ضلع، ہر تحصیل، ہر تھانے اور ہر گاؤں میں منایا جائے، اس سے قطع نظر کہ وہاں اقبال کو جاننے اور سمجھنے والا کوئی ہے کہ نہیں۔ یوم وغیرہ رضا کارانہ طور پر منانے کی عملی دقتوں سے واقف ہونے کی وجہ سے انہوں نے فرمایا ہے کہ یوم اقبال منانا ہر مقامی حاکم کا ایک غیر سرکاری فرض قرار دے دیا جائے کہ بس اتنا سارے سرکاری مراسلہ جاری کر دیا جائے کہ مقامی حکام تقریبات اقبال کی ہمت افزائی کریں۔ پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔

یہ بات ہمارے بھی تجربے میں آئی ہے۔ جہاں کوئی کمشنر یا ڈپٹی کمشنر ادب سے دلچسپی رکھنے والا آیا، سارا ضلع اشعار اور استعاروں میں باتیں کرنے لگا۔ بنیادی جمہوریتوں والے بھی غزلیں کہنا اور رسالے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر روز کسی نہ کسی کا یوم ہے۔ چونکہ سال میں صرف تین سو بیسٹھ دن ہوتے ہیں، لہذا بعض شاعروں اور ادیبوں کے نام قلمزدہی کرنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ ایک دن میں ایک سے زیادہ آدمیوں کا یوم منانا کچھ بھلا نہیں لگتا۔ ایک ضلع میں ہم ایک کام سے گئے۔ دیکھا کہ ایک گاؤں میں جھنڈیاں لگی ہیں اور لوگ دھمکیں پکارتے ہیں۔ ہم نے کہا کسی کی شادی یا عرس ہے کیا؟ معلوم ہوا نہیں۔ حضرت ملنگ گڑگاٹوی کا یوم ہے۔ ایک صاحب کو جو پیش پیش تھے، ہم نے روک کر پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے۔ کیونکہ ہم گڑگاٹوی میں رہے ہیں ان کا نام نہیں سنا۔ کہنے لگے سنا تو ہم نے بھی نہیں لیکن اوپر سے حکم آیا ہے۔ سنا ہے ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیگم کے ماموں تھے۔ کلام ان کا چھپا نہیں۔ رسالوں والے متعصب تھے۔ چھاپتے ہی نہ تھے ورنہ شاعر سنا ہے انجسے تھے۔ آج ہم ان کی یاد تازہ کریں گے۔ قوالوں سے ان کی غزلیں گوائی جائیں گی اور جو چندہ گاؤں والوں نے تھانیدار صاحب کو رضا کارانہ طور پر دیا ہے، اس سے ملنگ مرحوم کا دیوان چھاپا جائے گا۔

اندریں حالات ہماری سفارش یہ ہے کہ اگر ادب کی ترقی مطلوب ہے تو آئندہ کسی کو حاکم ضلع مقرر کرتے ہوئے دیکھ لیا جائے کہ آیا شاعر ہے۔ کہیں نرہسی ایس پی تو نہیں۔ یہ ہو جائے تو دیکھئے ادب میں کیسی بہار آتی ہے۔ سب لوگ کھیتی باڑی آپاشی وغیرہ چھوڑ کر یوم منانے میں لگ جائیں گے۔ کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ جو نہی کسی ضلع میں نیا ڈی سی چارج لیتا ہے۔ فوراً اہل معاملہ سراغ لگاتے ہیں کہ آئندہ لائحہ عمل کیا ہو۔ اگر موصوف گھوڑوں کے شوقین ہیں تو گھوڑوں اور مویشیوں کا میلہ کیا جائے اور میونسپلٹی سے ریس کورس

قائم کرنے کے لئے جگہ الاٹ کرائی جائے۔ اگر مزارع میں تصوف ہے تو عرس کئے جائیں اور مقامی درگاہ پر سفیدی کرائی جائے گی۔ اگر نمازی ہیں تو نماز سکھی جائے کیا عجب کبھی پڑھنی پڑ جائے۔ اگر پتہ چلتا ہے کہ شاعر ہے حضرت آفتاب اکبر آبادی کا شمار ہے تو سبھی اپنا قبلہ راست کر لیتے ہیں۔ فوراً ایک دھوم دھامی ملک گیر مشاعرے کا اعلان ہوتا ہے بلکہ ایک آدھ رسالہ بھی اپنی مشعر صاحب کی زیر سرپرستی آب و تاب سے نکلتا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نوبت چند روزہ ہوتی ہے۔ جونہی حضرت کا تبادلہ ہوا۔ ہم نے یہ دیکھا کہ بزم ادب کے دفتر میں کھلی بنولوں کی دکان کھل گئی اور ماہنامہ آفتاب ماہتاب کے دفتر میں کورے لٹھے کوڈیو قائم ہو گیا۔

خیر اقبال تو قومی شاعر ہے۔ تصور پاکستان کا خالق ہے تاہم یہ بعید از امکان نہیں کہ گاؤں کی یونین کونسل میں سرکلر پیچھے کر اب کے یوم اقبال منایا جائے تو اس قسم کی گفتگو ہو۔

”ایسہ کہیز اقبال بھی“

”ڈاکٹر اقبال“

”کون ڈاکٹر اقبال“

”ڈاکٹر اقبال نہیں جانتے۔ حکیم الامت ڈاکٹر اقبال“

”یہ ڈی سی صاحب ہیں یا سول سرجن جو ڈاکٹروں حکیموں کے دن منائے جانے لگے۔ یہ کیا لگتے ہیں ڈی سی صاحب کے۔“

”کچھ بھی نہیں لگتے۔ شاعر تھے بہت بڑے ۱۹۳۸ء میں مر گئے۔“

”مر گئے تو پھر یوم منانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں اتنا خرچ کیا جائے۔ جب کہ وہ ڈی سی صاحب کے رشتہ دار بھی نہ تھے۔ کہاں کے رہنے والے تھے۔“

”سیالکوٹ کے“

”سیالکوٹ کے؟ پھر تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ہماری بیگم کے گرائیں تھے۔ ضرور کوئی تکرارے

آدی ہوں گے۔“

بعد ازاں رپورٹیں طلب کی جائیں گی۔ کس کس گاؤں میں یوم اقبال منایا گیا کہاں نہیں۔ کوئی ہزار عذر کرے کہ جناب کوئی تو ال ہی خالی نہیں ملا۔ ہم یوم اقبال کیسے مناتے۔ کوئی عذر مسوع نہ ہوگا۔ تھانے دار باندھ کے لے جائے گا کہ بد معاش یوم اقبال نہیں مناتے؟ ڈی سی صاحب کے حکم کی سربتائی کرتے ہو؟ دو جی اسے حوالا ت میں۔ پڑھو اواسے بانگ در اصبح خود ہی بانگ دیتا ہے گا کہ حضور غلطی ہوئی۔ بال بچوں والا ہوں۔ آج ہی جا کے مناتا ہوں یوم اقبال۔

اک ذرا چاند تک

یہ امریکہ والے چاند پر کیا پہنچے، ان کا دماغ ہی آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بیسنی یہ کون سا کمال کیا تم نے جو اتنا اترا رہے ہو۔ اتنی دور کی کوڑی لار ہے ہو۔ یہ راکٹ اور قمری گاڑی وغیرہ کا کیا کھڑا گ ہے۔ ان میں بیٹھ کے تو کوئی بھی چاند پر پہنچ سکتا ہے۔ بات تب تھی کہ پیدل پاؤں جاتے۔ پیدل نہ سہی، ہیل گاڑی، تانگے یا رتھ میں پہنچتے جیسے کہ پرانے زمانے کے بھارتی پہنچے ہوں گے۔ بھارتیوں کے آسمان میں تھگی لگانے اور چاند پر جانے کا انکشاف بھارتی پروفیسر گوندانی نے کیا ہے۔ کچھ ایسا ہی بھلا سا نام ہے ان کا۔ ثبوت انہوں نے یہ پیش کیا ہے کہ پرانوں اور شاستروں میں چند لوگ کا نام آیا ہے۔ یہ امریکی نالائق کہتے ہیں وہاں آبادی نہیں ہے۔ حالانکہ وہاں کے باشندوں کا بھارت کے ہاں آنا جانا تھا۔ شیو پار بھی ہوتا تھا۔ شیو پار کی تفصیل پروفیسر گوندانی نے تو نہیں دی۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ بھارت سے گائے کے گوہر کے اُپلے وہاں بھیجے جاتے ہوں گے۔ کیونکہ اور کوئی قابل ذکر چیز بھارت میں ان دنوں پیدا نہ ہوتی تھی۔ وہاں سے اس کے بدلے کیا آتا ہوگا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اب وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔ ریت ہیں اور پتھر ہیں۔ تجارتی تعلقات کچھ دن اور رہتے تو یہ بھی نہ باقی ہوتے، بھارت کی سڑکوں پر کچھ نظر آتے۔

موجودہ زمانے میں چاند کے سلسلہ میں ریسرچ کی اولیت کا سہرا بھی امریکہ یا روس کے سر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان نہایت فخر سے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ سب سے پہلا ریسرچ کا ادارہ ”رویت ہلال کمیٹی“ یہاں بنی اور چاند کی طرف اڑان کا آغاز یہاں سے ہوا۔ اس کمیٹی کے اراکین ضروری سمجھتے تو چاند پر اتر بھی سکتے تھے۔ کیونکہ کوئی بیس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ ہی گئے تھے۔ آگے فقط، دو ڈھائی لاکھ میل کی مسافت رہ جاتی ہے۔ لیکن سچ یہ آن پڑا کہ یہ لوگ افطاری کا سامان ساتھ لے کر نہ گئے تھے۔ واپس آ کر روزہ بھی کھولنا تھا۔ ہم لوگ اس قسم کی ریسرچ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جس میں جان جو کھوں میں پڑتی ہو۔ اسی لئے جیسا کہ انجی کمیشن والے ڈاکٹر عثمانی صاحب نے حوالہ دیا ہے۔ کوکا کولا پر ریسرچ کرنا یا مصنوعی سنگ مرمر بنانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ یہاں ہم عثمانی صاحب سے

اختلاف کریں گے۔ جو رولے سائینس اور ایبالت کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ ابھی کل ہی ہم مفید عالم جنٹری کا مطالعہ کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ بیسویں صدی کی سب سے حیرت انگیز ایجاد کا سہرا بھی پاکستانی مرد درویش کے سر ہے۔ یہ ایک طلسمی انگلیشی ہے۔ جسے آپ ساڑھے تین روپے (مع محصول ڈاک) میں میاں عامل شاہ جلالی نزد ڈینسو ہال راجپی سے طلب فرما سکتے ہیں۔ اس کی خوبیاں کیا رقم کریں۔ اشتہار میں لکھا ہے کہ اس کے پہننے ہی ”آپ کی غریبی دور ہو جائے گی۔ دولت آپ کے قدم چومے گی۔ محبوب آپ کے قدموں میں آن کرے گی۔ آپ کے ہاں (آپ چاہیں نہ چاہیں) اولاد نہ ہوگی۔ دنیا آپ کی عزت کرے گی۔ طالب علموں کو امتحان میں کامیابی ہوگی۔ آپ مقدمہ جیت جائیں گے۔ چوری کی ہوئی چیز واپس مل جائے گی۔ وغیرہ“ اب ہمیں دکھا دیجئے روس اور امریکہ کی کوئی ایسی ایجاد جو ان سب کرامتوں پر حاوی ہو۔ اور لطف یہ ہے کہ اس پر قوم کو ہزاروں ملین ڈالر خرچ نہیں کرنے پڑے۔ میاں عامل شاہ جلالی نے خود ہی تیار کر لی ہے۔ ساڑھے تین روپے (مع محصول ڈاک) میں منگا کر اپنی انگلی میں پہننے اور چاند کو اشارہ کیجئے وہ خود دوز آئے گا۔ آپ کو اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ پھر جی بھر کے ریسرچ کر لیجئے اس پر۔

بہت دنوں سے لوگوں نے چاند پر جانے کے لئے ابھی سے پیشیں بک کرالی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ وہاں ابھی تک ہولٹ نہیں ہیں۔ جانے والوں کو قیام و طعام کا انتظام خود کرنا ہوگا اور بستر ہمراہ لے جانا ہوگا۔ آل چاند ٹورسٹ بورڈ پور پور رفتہ رفتہ سارے انتظام کر دے گا۔ فی الحال تو اس نے یہ اشتہار دیا ہے کہ ”چاند“ پر آئیے اور اس کے گڑھوں میں لوٹ لگائیے۔ عوام کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے کئی سال ہوئے اٹلی کے شہر پادیا کی میونسپلٹی کو وہاں کے ایک کنجڑے نے درخواست دی تھی کہ مجھے چاند پر سبزی کی دکان کھولنے کا لائسنس دیا جائے۔ اس شخص نے ایک مقامی اخبار میں اشتہار بھی دے دیا تھا ”خوخجری۔ خوخجری۔ خوخجری۔ چاند کے رہنے والوں کو مژدہ ہو کہ ہم نے چاند پر تازہ سبزیوں کا انتظام کر دیا ہے۔ بھنڈی، کرپلا، شلجم، ہنڈے، ہنڈے قندی، جس چیز کی ضرورت ہو۔ یاد فرمائیں۔ دام مناسب۔ دھنیا مفت۔“ اور حار قطعی بند ہے۔“

اس اشتہار سے بڑی غلط فہمی پھیلی تھی۔ لوگ سمجھے کہ چاند پادیا شہر کی میونسپلٹی کی حدود میں واقع ہے۔ یہ تک سنا تھا کہ جب روس کا پہلا راکٹ چاند کی حدود میں داخل ہوا تو پادیا کے مخرج چنگی نے روک کر پہلے اس کی تلاشی لی کہ اس میں گھی کا مین یا شکر کا بورا تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس کے بعد آگے جانے دیا۔ یہی وجہ اس راکٹ کے نشانہ خطا ہونے کی بھی بتائی گئی تھی۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ خبر مبالغہ سے خالی نہیں۔

آمدورفت کھلی تو دیکھئے گا دوسرے اہل حرفہ بھی، ادھر توجہ کریں گے۔ کراچی کے کچڑے، کباب مرچنٹ، مرغ جھولے والے، عامل کامل۔ ناگفتہ بہ بیماریوں کے معالج خالص، پنجاب کے گھی فروش، شادی دفتر والے، ہو میو پیٹھ، انجن ساز وغیرہ ادھر کا رخ کریں گے۔ اسلام سلمانی صاحب وہاں بھی پہلی بار برشا پ کا افتتاح کریں گے۔ رفتہ رفتہ بانا کی دکان، منشی فاضل کی تعلیمات کا اسکول، چھ مہینے میں گارنی سے پاس کرنے والے کالج، خوب جماعت خانہ اور بانو مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک یتیم خانہ کھلنے کی خبریں بھی آئیں گی۔ ایمپریس مارکیٹ سے بسیں چلا کریں گی۔ چلو بھائی چاند کی سواریاں۔ کراچی ٹراموے نے ٹرام بند کرنے کا فیصلہ ملتوی کر دیا ہے۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ سولجر بازار سے آگے پری ڈال کر چاند تک سلسلہ مالدیا جائے۔ ناکت وہی آٹھ پیسے رہے گا۔ چاند پر آدمی جائیں گے تو کتے بھی جائیں گے۔ ان کی آسانی کے لئے جا بجا آٹھ پیسے بھی کھڑے کرنے پڑیں گے تاکہ انہیں اپنے حوانج میں تکلیف نہ ہوا کھجے گاڑنے کے بہانے کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن بھی پہنچ جائے گی۔ وہ گئے تو کے ڈی اے اور سوئی گیس والوں کو بھی بلائیں گے کہ یارو چاند عجیب سپاٹ، ہموار میدان ہے۔ خط کو تار سمجھو اور اپنے بیلداروں کو لے کر پہنچو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جب ہم چاند پر جانے کا ارادہ کریں گے، وہاں پہلے ہی بورڈ لگا ہوگا کہ واپس جائیے ”سڑک برائے مرمت بند ہے۔“

یونیورسٹی میں شعبہ حماقت کھل گیا

پچھلے دنوں اخبار پڑھتے ہوئے ایک خبر پر ہماری نظر رک گئی۔ لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ حماقت نے فلاں ادیب شہیر کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ یہ سچ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی سے بھی اور یونیورسٹیوں کی طرح وفاق و قفا حماقتیں سرزد ہوتی رہی ہیں (ہمیں ڈگری دنیا بھی انہیں میں سمجھ لیجئے) اور جیسا کاٹھیا داڑیو پار منزل کے صدارتی خطبے میں سیٹھ کھلی بھائی بھائی باردا نوالے نے فرمایا ہے۔ دستخط اور گنتی پیارے وغیرہ سیکھنے سے آگے پڑھنا بھی بجائے خود حماقت۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی نے ایک مستقل شعبہ حماقت قائم کر دیا ہے تاکہ جو لوگ اس مضمون میں خصوصیت حاصل کرنا چاہیں وہ اس میں باقاعدہ فارغ التحصیل ہوں۔ ڈگری لیس اور آگے طلبہ کو فیض پہنچائیں۔ مع میرا پیغام حماقت ہے جہاں تک پہنچے

پھر خیال آیا کہ کہیں یہ کتابت کی غلطی نہ ہو۔ کیونکہ حماقت کوئی قانون یا جغرافیہ تو ہے نہیں کہ پڑھنے سے آجائے۔ یہ تو ایک خدا داد بات ہے۔ اللہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور اس وقت بھی اس فن شریف میں درک رکھنے والے اتنے لوگ موجود تھے کچھ بھارت میں مورکھ منزل اور پاکستان میں انجمن حقا کی شاخیں جا بجا کھلی ہیں۔ بھارت کے مورکھ منزل میں تو بعض وزیر بھی شامل ہیں یا پھر یہ ہوگا کہ وزارت میں وہ مورکھ منزل کی نمائندگی کرتے ہوں لیکن ان میں سے کوئی حماقت کو بطور مضمون کے شاید ہی پڑھا ہوگا۔ ہونہ ہو یہ شعبہ حجامت ہے۔ ہمارے کرم فرما حضرت اسلام سلمانی بی اے اور ان کی جماعت ایک مدت سے کوشاں تھی کہ اس فن کو فنون لطیفہ میں داخل کر کے یونیورسٹی میں اس کی تدریس کا انتظام کیا جائے۔ اب جا کر یہ کوشش بار آور ہوئی ہے۔ اب یہ ہوگا کہ ایک کمرے میں فلسفے کا استاد تقریر کر رہا ہے کہ دیکارت اور شوپنہار کے فلسفوں میں کیا فرق ہے۔ پاس کے کمرے میں پروفیسر خلیفہ امام دین طلبہ کو بتا رہے ہیں کہ داڑھی میں کتنا صابن لگانا چاہیے جس سے بال نرم ہو جائیں اور گاہک کی اٹنے استرے سے حجامت کرنے میں آسانی رہے۔

مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ نہ حماقت نہ حماقت۔ خبر کا تعلق شعبہ صحافت سے ہے۔ کا تب صاحب نے صحافت کو حماقت کیوں لکھا؟ ممکن ہے انہیں وقت پر تنخواہ نہ ملی ہو۔ لیکن اتنی سی بات پر گھر کے بھیدی کا پوری لٹکا ڈھادینا کوئی اچھی بات نہیں۔ صحافت سے وابستگی اگر حماقت ہے تو اس راز کو فری میسنوں کی طرح اپنے سینے میں رکھنا چاہیے۔ اپنی برادری سے باہر فاش نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوتے۔

یہ بات ہم بھی بیس برس سے جانتے تھے لیکن ایسے اوجھے نہیں تھے کہ ہر ایک سے کہتے پھرتے۔ یہی حال ہمارے دوسرے سینکڑوں صحافی بھائیوں کا ہے کہ ایک بات جو ان سے سرزد ہو گئی اسے نبھائے جا رہے ہیں بلکہ بعض تو یہ تک ظاہر کرتے ہیں جیسے بڑی عقل کی بات کر رہے ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ حماقت ہے تو اس کا احساس کچھ دن بعد جا کر ہوتا ہے۔ ہمیں آج کل ہور ہا ہے کہ سیدھی سادی دل کی بات لکھتے ہیں، وہ بھی خوش طبعی کے ساتھ جو کچھ ہے جہان کے بالوں کی طرح آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس پر بھی ادھر کچھ چھپا اور کسی گروہ کی طبع نازک پر گراں گزرا۔ ادھر لوگ وفداور ڈنڈے لے کر پہنچ گئے کہ نکالو اس شخص کو باہر۔

لاہور میں ہمارے ایک دوست نے جو اخبار کا فلمی صفحہ مرتب کرتے تھے کہیں لکھ دیا کہ فلم ”چڑیا کی دُگی“ کے مکالمے کمزور ہیں اور کہانی میں بھی جان نہیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ فلم ایک مشہور پہلو ان نے بنائی ہے۔ وہ اگلے ہی روز اپنے پٹھوں کے ساتھ اخبار کے دفتر پہنچ گئے۔ اس صحافی کو گریبان سے پکڑ لیا اور کہا۔ اگر مکالمے کمزور ہیں تو ہم تو کمزور نہیں اور اگر کہانی میں جان نہیں ہے تو تم میں کوئی جان ہے۔ ڈیڑھ پہلی کے آدمی ہو، باہر نکل دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ لوگ جمع ہو گئے۔ بڑی مشکل سے تو تھمبو کیا۔ جاتے ہوئے دھمکی دے گئے کہ آئندہ میری کسی فلم کے متعلق کچھ ایسا دیا لکھا تو اچھا نہ ہوگا۔ وہ دھوبی پٹڑا دوں گا کہ عمر بھر چونا لگا رہے۔

اب تو خیر حالات بہت بہتر ہیں۔ صحافیوں کو تنخواہ بھی مل جاتی ہے اور پریس کلب میں بیٹھ کر تمبولہ بھی کھیل سکتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تو بس یہی عشرت تھی کہ کمرہ بند کر کے قلم ہاتھ میں اٹھایا اور ساری دنیا ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہٹلر کو ڈانٹ دیا کہ خبردار اگر تو نے اور قدم آگے بڑھایا تو اور اینڈینوریل نکھوں گا کہ تاک رٹھنے کو دوڑا دوڑا آئے گا۔ اور ہماری حکومت بھی سمجھ لے کہ ہم اس سے نہیں ڈرتے۔ ہم آزادی تحریر کی خاطر اپنا مکان سچ سکتے ہیں اور سچ دیا ہے، کپڑے سچ سکتے ہیں اور سچ دیے ہر گھڑی سچ سکتے ہیں اور سچ سچ سچ دی ہے۔ لیکن اپنا قلم نہیں سچ سکتے۔ اپنا ضمیر نہیں سچ سکتے۔ یہودیوں

پھنکار رہے ہیں کہ دیکھو بہت ظلم ہو لیا۔ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے، اب کے مار کے دیکھو۔ ہمارے بزرگ مولانا اختر علی خاں مرحوم کا وہ قصہ تو بہت مشہور ہے کہ ولایت گئے اور وزیر اعظم انبلی سے ملے اور کہا۔ دیکھیے جناب کشمیر کا مسئلہ فوراً حل کر دیجئے ایک مہینے کی مہلت دیتا ہوں ورنہ..... انبلی صاحب کی سٹی کم ہو گئی۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ مٹی آواز میں بولے۔ ورنہ کیا؟

مولانا نے فرمایا ”ورنہ میں آپ کے خلاف زمیندار میں ادارہ لکھوں گا۔“

یہی چکا تھا کہ لوگ گھانا کھا کر فقیر ہو جاتے تھے لیکن اخبار ضرور نکالتے تھے۔ ہمارے ایک دوست کا ایک ہفتہ وار پرچہ تھا۔ اسے خود ہی مرتب کرتے، چھپواتے، دکانوں پر دیکر آتے، اشتہار کے بل کے لئے سینڈ کو فون کرتے کہ جناب بہت دیر ہو گئی۔ پیسے دلوائیے۔ میں اپنے چراسی کو بھیج رہا ہوں۔ اس کے بعد خود ہی تھیلا لے کر سائیکل پر بیٹھ سیٹھ کے دفتر پہنچ جاتے کہ مجھے ایڈیٹر صاحب نے بھیجا ہے، وہ بہت خفا ہیں۔ پیسے آج ہی دے دیجئے۔ ہاں ادارے اور مکالموں میں ان کا غلطہ دیکھنے کا ہوتا تھا۔ افسوس اس چسکے کے دن بھی انگریزوں کے ساتھ گئے۔ کوئی دو سال ہوئے ہمارے ایک دوست کو ایک اخبار میں بڑی سفارشوں کے بعد کالم لکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے پہلے ہی کالم میں اعلائے کلمۃ الحق کر دیا کہ میرا قلم مقدس ہے۔ میں اپنے ضمیر کے علاوہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہوں گا۔ صدر ایوب کوئی غلط کام کریں گے تو ان کے گریبان میں بھی ہاتھ ڈالنے سے نہیں ہچکچاؤں گا۔ دوسرے روز ہم ان کے کالم کے منتظر رہے۔ تیسرے دن بھی اور پھر منتظر ہی رہ گئے۔ ان کا کالم پھر نہ چھپا۔ معلوم ہوا لاٹ مار کر نکال دیے گئے۔ گھر میں بیٹھے چنے چاب رہے ہیں اور یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

سو بار ترادامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریبان تھا

یہ پاگل پاگل پاگل پاگل فلمی دنیا

ہم نے پچھلے دنوں انگریزی کی ایک فلم دیکھی۔ نام ہے اس کا The mad mad world یعنی پاگل پاگل پاگل پاگل دنیا۔ فلم دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ جو چار بار پاگل لکھا ہے دس بیس بار لکھنا چاہئے تھا۔ غالباً جگہ کی گنجائش مانع رہی ہوگی۔ آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک شاہراہ پر کچھ موٹریں ٹرک آگے پیچھے جارہے ہیں۔ ایک کار لڑھک کر گھرے کھڈ میں گر جاتی ہے۔ لوگ نیچے پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ گاڑی کا سوار قریب المرگ ہے۔ اس نے بتایا کہ یارو میں تو دنیا سے سفر کر رہا ہوں لیکن فلاں سطح مرتفع پر ایک خزانہ دبا ہے، لاکھوں کے نوٹ ہیں۔ نشانی اس کی دو کھجوریں ہیں، مابعد

اک طرف منہ پھیر کر رونے لگے بیماردار
اک طرف بیمار غم کچھ کہہ کے رخصت ہو گیا

بے شک بیمار غم کچھ کہہ کے رخصت ہو گیا لیکن بیمارداروں کے رونے کی بات صحیح نہیں۔ سب نے فی الفور دوڑ لگا دی۔ سب کو پہلے پہنچنے کی فکر تھی۔ باقی فلم دولت کے لئے اسی دوڑ کی ہے۔ آخر میں..... لیکن باقی آپ پردہ سیمیں پر دیکھئے۔ یہ فلم پر لطف تھی، بہت پر لطف چلتی رہی۔ اس میں سب کچھ تھا جو انشراح قلب کے لئے ضروری ہے لیکن اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو نہ تھی لہذا ہمارے دوست ہمیں پابست دگرے ایک مقامی، سراسر مقامی فلم میں لے گئے کہ فلم دیکھنی ہے تو یہ دیکھو۔ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سنو رہسرا۔ کس چیز کی کمی ہے خوبہ تری گلی میں۔ عشق و محبت اس میں۔ پند و نصیحت اس میں۔ مار کٹائی سے معمور، مزاح کے لٹوؤں سے بھر پور۔ ظالم ساج کا تانا بانا بھی ہے اور زندہ ناچ گانا بھی ہے۔ جا بجا بے لوث محبت کے پھول کھلتے ہیں اور آخر عاشق معشوق گلے ملتے ہیں۔

فلم کا نام ہم نہیں لکھتے۔ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں بلکہ نہ لکھنے میں ایک حکمت ہے۔ اس شخص کا ذکر آپ نے سنا ہوگا جو غصے میں بھرا کف اڑاتا سینما کے منیجر کے پاس پہنچا اور کہا میری بیوی اس وقت ایک غیر مرد کے ساتھ بیٹھی سینما دیکھ رہی ہے۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔ منیجر نے اسے تو بٹھایا، اندر ہال

میں سکرین پر اعلان کرادیا کہ باہر کسی بی بی کامیاء پرستول لئے بیٹھا ہے۔ ہم دو منٹ کے لئے لائن بند کرتے ہیں۔ وہ بی بی اور اس کا ساتھی چپ چاپ اندھیرے میں نکل جائیں۔ دو منٹ کے بعد لائن کھولی گئی تو ہال قریب قریب خالی تھا۔ پس جو فلم والا چاہے اسے اپنے سے متعلق کر لے۔ ہمارے دو دوستوں نے تو سوالات کر کے ”کسوٹی“ کے قاعدے سے بھی اس فلم کا نام پوچھنے کی کوشش کی۔

”یہ فلم پنجابی کی ہے؟“ ہمارے عبید اللہ بیگ نے پوچھا۔

”جی۔“ ہم نے جواب دیا۔

”مارکنائی کے سین سے شروع ہوتی ہے؟“ ہمارے افتخار عارف نے سوال کیا۔

”جی۔“

”اس میں وجہ بے وجہ مری اور سوات کے مناظر ہیں“

”جی۔“

”وہ بڑھکیں مارتا ہے؟“

”جی۔“

”مسخرہ الٹی چھلائیں لگاتا ہے؟“

”جی۔“

”طوائف کا کونٹھا اس میں ہے؟“

”جی۔“

”جیل کی سلاخیں بھی؟“

”جی۔ جی۔“

سب ایک دوسرے کے لئے ایثار کرتے ہیں؟ بلکہ ایثار کرنے کے لئے ایک دوسرے پر

رے پڑتے ہیں؟

”جی۔“

”من کی آنکھیں پٹ پٹ کھلتی ہیں؟“

”جی ہاں۔ جی ہاں۔“

”اسے بنے ہوئے پچاس سال سے زیادہ ہو گئے۔“

”آپ پروڈکشن کے معیار کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں۔“

”اس میں ’لال موری پت‘ گایا گیا ہے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟“

”اس میں فردوس بھی ہے۔ اعجاز ہے۔ غالباً نفع بھی“

جی ہاں۔ لیکن آپ کے سوالوں کا کوئی ختم ہو گیا۔ اب فلم کا نام بتائیے۔“

”روکھے ہو کر بولے“ جناب آپ ہی بتا دیجئے۔ ہم بار گئے۔“

ہم نے کہا۔ ”آپ نے تو ساری نشانیاں بتا دیں۔“

تب انہوں نے بتایا کہ ہیرو کی مار کٹائی، طالب و مطلوب کا بچھڑنا ملنا، مری اور سوات کے سین، بے گناہ قیدی، طوائف کا کوٹھا، اپنی چھلانگ لگانے والا مسخرہ اور بڑھکیں مارنے والا ولن سب فلموں میں مشترک ہوتے ہیں۔ لال موری پت کا بھی ہر فلم میں ہونا ضروری ہے۔ حتیٰ کہ کاسٹ بھی قریب قریب پنجابی فلموں کی ایک ہی ہوتی ہے لہذا بتائیں تو کیا بتائیں۔

یہ بیان ان صاحب کا تھا۔ ہم پر اس کی ذمہ داری نہیں کیونکہ ہم تو عید بقر عید پر فلمیں دیکھنے والے ہیں۔ ہم تو اپنے مختصر تجربے کی روشنی میں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ فلمیں خصوصاً پنجابی فلمیں، تہہ دیکھنے کی نہیں۔ جاتے ہوئے غالب کی طرح اپنے ساتھ نوہ گزلے کے جانا چاہیے۔ جو رلانے والا سین ہو تو آپ کی آنکھیں تولنے سے پونچھے۔ کو لہے منکانے کا سین ہو تو آپ کی آنکھیں ہاتھ رکھ کر بند کر دے۔ بنسانے والا سین ہو تو آپ کی بغل میں گدگدی کرے۔ آپ نڈھال ہونے نہیں تو آپ کو اسپر دکھلائے۔ غنڈہ سٹکھائے۔ آپ کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر ساری فلم کے دوران میں آپ کے کانوں میں انگلیاں دیے رکھے۔ ہم اپنے ساتھ کسی فالتو آدمی کو نہ لے گئے تھے لہذا اپنی ہی انگلیاں کانوں میں دیے رہے۔ پنجابی فلموں کا ہر کردار آغا حشر کا ترتیب یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنا اونچا بولتا ہے کہ سینماؤں کو اسپیکر فائر لگانے کی حاجت نہیں۔ وہاں کوئی آلہ آواز دہی کرنے والا ہو تو اس کا لگانا مستحسن ہوگا۔

اس فلم میں چھ گانے، آٹھ مزاحیہ سین، دس دردناک مناظر، تین قاتلانہ حملے، بارہ لپاڑکیاں اور پندرہ سسپنس تھے۔ یہ سالہ جس سے دوسرے ملکوں میں پچاس فلمیں بنائی جاتی ہیں، ہمارے ہاں ایک ہی فلم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے فلمساز محنت نہیں کرتے۔ پچھلے دنوں ٹیلیوژن پر فلم سازوں اور فلم بینوں کا ایک مباحثہ ہوا تھا۔ وہاں ایک فلم میں نے اس بات کی تعریف کرنے کی بجائے اس پر اعتراض کیا۔ ٹیلیوژن والوں نے دونوں پارٹیوں کے درمیان احتیاطی طامیزوں کا ایک جنگا بنادیا تھا ورنہ ایک فلم ڈائرکٹر تو اس فلم میں کو ضرور مار بیٹھتے۔ بائے بائے ہمارے ملک کے پاگل پاگل پاگل پاگل فلمساز۔ اگر وہ برامائیں تو یوں سہی۔ یہ پاگل پاگل پاگل پاگل فلمیں دیکھنے والے کہ ایک ہی فلم کو مختلف ناموں سے بار بار دیکھے جارہے ہیں۔

انجمن معین الاموات

اخبار میں آیا ہے کہ گزشتہ بدھ گوتڑھی شاہو میں ”انجمن معین الاموات“ کا جلسہ ہوا جس میں نئے سال کے لئے عہدے دار منتخب کئے گئے۔

معین کا مطلب ہے مددگار، اعانت کرنے والا۔ اموات جمع ہے موت کی۔ ہم نے یہ نام پہلی بار سنا تھا لہذا اس کے معنی کچھ غور کرنے سے سمجھ میں آئے۔ لیکن جب سمجھ میں آگئے تو ہم نے فوراً اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے کہا کہ

دیکھو، لاہور والے تم کراچی والوں سے بازی لے گئے۔ اپنی انجمن بنالی۔ جو کام تم لوگ یہاں فردا فردا کرتے ہو، اب وہاں اجتماعی طور پر ہوا کرے گا۔ اب یہ آباد کاری والوں پر زور دے کر قبرستانوں کے لئے مزید زمین منظور کرا لیں گے۔ یہاں تم لوگوں سے یہ بھی نہ ہوسکا۔

آج کل نیکی کا زمانہ نہیں، بجائے اس کے کہ اس امر ضروری کی طرف توجہ دلانے پر وہ ہمارا شکریہ ادا کرتے پھر گئے اور کہنے لگے۔

”دیکھو جی۔ تم ہر پھر کر بات ہم پر لاتے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔ خود تمہارے پڑوس میں تابوت لکھا حکیم غزرائیل علی خاں مالک ہلاہل دواخانہ بھی تو موجود ہیں اور اب تو ہومیوپیتھیوں کو بھی خلق خدا کے مارنے جلانے کا اختیار مل گیا ہے۔ طب چین و جاپان والے تو مریض پر دوا کرنے کے لئے لائسنس تک نہیں لیتے۔ ان نیولوں اور سائنس دانوں اور درویش کی چنگلی والوں کو بھی تم بھول گئے، جن کی ایک پزیرا کام، آشوب چشم، بواسیر، ہیضہ، کھنٹی ڈکاروں، گٹھیا اور تلخ کا شرطیہ علاج ہوتی ہے، بلکہ چہرے کی رنگت سفید اور سفید بالوں کو کالا کرنے کے لئے بھی مزید کسی دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ادھر سے ہماری توجہ ہنسی تو خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ ملاوٹ کا کام کرنے والوں کی انجمن ہے، جنہوں نے لکڑی کے برادے، بھٹے کی لال اینٹوں کے سفوف اور کیکر کی چھال وغیرہ کی چھوٹی

صنعتوں کو ترقی دے کر اتنا بڑا بنادیا ہے۔ اب تک یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ تعمیر مکانات یا ایندھن کے کام کی بھی جاتی تھیں۔ ہلدی مرچ مسالوں اور چائے کے طور پر ان کا استعمال کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ موہل آئل بھی فقط بسوں اور ٹرکوں وغیرہ میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ کسی نے نہ سوچا تھا کہ یہ گھی کا نعم البدل ہے اور اس سے انسانی جسم کی گاڑی بھی خوش اسلوبی بلکہ زیادہ، تیزی اور تیز رفتاری سے چلائی جاسکتی ہے۔ زندگی کی راہ جو پہلے ساٹھ ستر اسی سال میں طے ہوتی تھی، موہل آئل باقاعدگی سے استعمال کرنے والے اسے دو تین ہی سال میں طے کر لیتے ہیں۔

اس پر ہم اپنے پرانے کرم فرما سینٹھ ہلدی بھائی چونا بھائی، نوٹوں والے، پرانے کوٹوں والے کے پاس گئے اور اس انجمن کے بنانے پر مبارک باد دی۔ انہوں نے فوراً موہل آئل میں تر تراتی جلیبیوں کی پلیٹ ہماری طرف بڑھائی، جو ہڑکا پانی ملے دودھ کی چائے کے ڈبل کپ کا آرڈر دیا جس میں کیکر کی چھال کے علاوہ جنوں کا چھلکا بھی استعمال کیا گیا تھا، جو اعصاب کے لئے خصوصاً گھوڑوں کے اعصاب کے لئے مفید مانا گیا ہے۔ اس کے بعد بھس ملے تمباکو بیڑی ہمیں پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”بابا! انجمن نہیں ہے۔ ہم تو درویش گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شہرت سے ہمیں نفرت ہے۔ نام و نمود کا شوق نہیں، اسی لئے خفیہ تہ خانوں میں اپنا کام کرتے ہیں اور پبلک کی خدمت بجالاتے ہیں۔ اگر کوئی منصفی کرے تو دیکھے کہ فیملی پلاننگ والوں سے زیادہ مفید کام تو ہم کرتے ہیں۔ آخر آبادی کو کم ہی تو کرنا ہے۔

اس کے بعد بھٹے کی اینٹوں سے بنے ہوئے کتھے اور پمپل کی لکڑی کی سپاری کا پان پیش کرتے ہوئے کہا۔ حکومت کبھی ہے اناج بچاؤ۔ جب ہم نے اناج بچایا اور اپنے گوداموں میں بھر لیا تو اب حکم نکالا ہے کہ یہ بری بات ہے۔ اسے باہر نکالو، سستا بیجو۔ بابا، تم اخبار والا ہے، حکومت کو سمجھاتا کیوں نہیں۔ رزق جیسی اصول چیز کو سستا کیسے بیچ دیں۔

اب ہم نے سوچا کہ ہونہ ہو یہ انجمن بسوں، ٹرکوں اور رکشادالوں نے بنائی ہے۔ ہمیں افسوس

ہوا کہ ہمارا دھیان سب سے پہلے اس طرف کیوں نہ گیا، جو پبلک کی خدمت کے لئے اپنی جان جو کھوں میں ڈالنے سے گریز نہیں کرتے اور فٹ پاتھ پر ٹرک چلا کر اور تالے میں بس گرا کر ثابت کرتے ہیں کہ انسان ہمت کرے تو بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانا بھی کچھ مشکل کام نہیں۔ ہم پتہ پوچھتے پوچھتے ٹرک ٹرانسپورٹ یونین کے دفتر پہنچے تو اس کے سیکرٹری جنرل نے فوراً ٹرانسپورٹ کی آواز دہی کر کے سوار کے چپکے سے ہماری تواضع کی اور کہا۔ ”ابھی حقہ تازہ کر کے لاتا ہوں۔“

ہم نے کہا ”ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی انجمن معین الاموات کی اس ماہ میں کیا کارگزاری ہے اور آیا بس والوں کا پلہ بھاری رہا ہے یا ٹرک اسے ہارن دیئے بغیر پاس کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔“

ہماری بات ان کی سمجھ میں آئی تو فوراً تھری ڈیسٹر میں گفتگو کرنے لگے اور پھر فوراً تھری ڈیسٹر میں آنے کو کہتے کہ ہم نے وہاں سے بھاگنے میں سلا متی دیکھی۔ اس اثنا میں سامنے ”انجمن معین الاموات“ شاخ کراچی کا بورڈ نظر آ گیا۔ ہم نے ہانپتے کانپتے اندر داخل ہو کر کہا:

”صاحبو! ہماری مدد کرو.....“ اس پر ایک صاحب جو منکوں کے درمیان بیٹھے لٹھانا پ رہے تھے، بولے ”جناب ہمارا کام تو مردے کو اس کی ابدی آرام گاہ تک پہنچانا ہے۔ زندوں کے امور میں ہم دخل نہیں دیتے۔ وہ سامنے ٹرک آرہا ہے۔ پہلے اس کے سامنے لیٹ جائیے پھر ہم آپ کی ضرورت مدد کریں گے۔“

دراصل ہم صوفی ہیں

بہنئ کے ایک پرچے میں اشتہار آیا ہے۔

شراب مت پیجئے

صوفیانہ زندگی بسر کیجئے

شراب ہم نہیں پیتے، نہ پینے کا جواز تو ہمارے پاس کوئی نہیں، بس نہیں پیتے۔ اس بات کو ہم نے کبھی کوئی اہمیت بھی نہیں دی تھی۔ اس اشتہار کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ دراصل ہم صوفی ہیں، صوفیانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بے اختیار ازراہ عقیدت اپنے ہاتھ پر بیعت کرنے کو جی چاہا۔ اس میں شک نہیں کہ کہیں تو ای ہو رہی ہو تو ہمیں بھی آپ گھٹنا پہنے، ملل کا کرتا زیب تن کیے، چاندنی پر پھسکڑا مارے، تہرک ٹھونکتے اور سر ہلاتے پائیے گا۔ تو والوں پر قال اور حاضرین پر حال طاری ہو تو ایک آدھ نعرہ مستانہ بھی ہم سے سرزد ہو جاتا ہے لیکن اس سے آگے نہیں۔ اپنے پر قد و قوالا لکین وغیرہ ہونے کا شبہ ہمیں کبھی نہ ہوا تھا۔ نہ یہ امکان کبھی ذہن میں آیا تھا کہ ہم یہ حیات مستعار گزارنے کے بعد عرس سراپا قدس وغیرہ کے سزاوار ٹھہریں گے۔ ہمارے مزار پر لوگ چادریں چڑھایا کریں گے اور لٹنگ لوگ بھنگ گھونٹا کریں گے۔ ہمارے نام لیواؤں سے لوگ نئے کے نمبر پوچھا کریں گے اور اولاد کے لئے تعویذ لینے آیا کریں گے؟ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

بہنئ کا یہ پرچہ جس میں یہ اشتہار چھپا ہے، فلمی پرچہ ہے۔ جس کا مطلب بخوبی یہ لیا جاسکتا ہے کہ ایڈیٹر نے دو بوتل ٹھہرائی کر اسے ایڈٹ کیا ہو گا اور کاتب نے چاند و کادم لگا کر اس کی کتابت کی ہو گی۔ اشتہارین کے طور پر نشہ بندی کمیٹی کا نام ہے۔ جانے یہ کون لوگ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شراب مت پیو، پیو بچاؤ اور گورنمنٹ کو دو تا کہ ڈیفنس پر خرچ کر سکے۔ مطلب یہ کہ تمہاری جگہ فوجوں کو شراب پلا سکے۔ واقع شراب بڑے کام کی چیز ہے۔ بچھلی جنگ میں جھمب سے بھاگنے والے سوراؤں کے مورچوں سے شراب کے کنٹر نکلے تھے۔ بھارتی حکومت کو معلوم تھا کہ یہ لوگ باغی ہوش حواس تو پاکستانی مجاہدین سے لڑنے سے رہے کہ کہیں اقدام خودکشی میں چالان نہ ہو جائے۔ پی کر البتہ ضرور لڑیں گے۔

ایک چوہے کو کہیں شراب کا پیالہ پڑا مل گیا۔ جانے کیا سمجھ کر غٹ غٹ پی گیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ پچھلے پاؤں پر سیدھا کھڑا ران پر ہاتھ مار رہا ہے اور لٹکا رہا ہے کہ نکالو جلی کو باہر۔ آج دودھ ہاتھ ہو جائیں۔ خیر وہ پھر چوہا تھا۔ بھارتی فوجیوں میں سے اکثر مورچہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جو پکڑا آیا اس نے یہ عذر کیا کہ یار مجھے معاف رکھو، میں نشے میں ہوں۔

ابھی بہت دن نہیں ہوئے کہ اسی شہر بمبئی سے انجمن مہمان شراب بننے کی خبر آئی تھی۔ ان لوگوں نے بھی اس قسم کا اشتہار دیا تھا کہ شراب پیو اور صوفیانہ زندگی بسر کرو۔ ان لوگوں نے حافظ وغیرہ کے کلام سے جن جن کراپے مطلب کے شعر دیئے تھے۔ جستجو نشہ بندی کمیٹی نے بھی کی تھی۔ لیکن انہیں سارے اردو فارسی ادب میں ایک بھی شعر ایسا نہ ملا جس میں ترک شراب کی تلقین کی گئی ہو۔ جس کا دیوان اشعار بھی بنکارتا ملے گا کہ پلا ساتی ہے باقی۔ یعنی جتنی سے باقی ہے میری بانٹی میں ڈال دے۔ بہت دن کی بات ہے پنجاب میں نمپرس سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن بنی تھی۔ یہ لوگ جلسے کرتے اور اس میں تمباکو نوشی کے خلاف دھواں دھار تقریریں ہوتیں۔ لوگوں پر تو چنداں اثر نہ ہوا۔ جو حقہ پیتے تھے برابر شریعت حقہ کے پابند رہے۔ ہاں مولوی محمد حسین آزاد کی اردو کی پہلی کتاب میں جہاں لکھا تھا، ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ باپ بیٹھا حقہ پی رہا ہے، انہوں نے حقہ کو حذف کر دیا۔ بس یہ رہ گیا کہ باپ بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ ظالموں نے یہ خیال نہ کیا کہ انسان خالی بیٹھا دیکھتا ہی بیوقوف لگتا ہے۔ اگر حقہ کے ذکر سے لوگوں کے حقہ کی طرف راغب ہونے کا اندیشہ تھا تو اب لوگ بیٹھے بیٹھے کاہل اور احمادی نہ ہو جائیں گے؟ خالی بیٹھے الگساٹے سے کیا بہتر نہیں کہ انسان حقہ ہی پئے! خیر ان لوگوں نے اتنا تو کیا، نشہ بندی کمیٹی والوں نے تو اتنے کی بھی توقع نہیں کہ اردو شاعری سے شراب کے موضوع کے اشعار ہی نکلوا دیں۔

ایسے اشعار نکلوانے کی بات ویسے ہے دقت طلب۔ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ اس بنیاد پر تطہیر ہوئی تو اردو میں بس گائے اور بکری اور بلی کی فریاد قسم کی نظمیں رہ جائیں گی۔ ایک بار حلقہ ادب صالح کی طرف سے تحریک ہوئی تھی کہ گزشتہ راصلوۃ، آئینہ ہمارے شعرا کو حرام اور ممنوع اشیاء کے متعلق شعر نہ کہنے چاہئیں۔ ان صاحبوں کا مطلب بھی شراب ہی سے تھا۔ کیونکہ سورا اور جھٹکے کے گوشت کے متعلق لکھنے میں شعرا پہلے سے احتیاط کرتے آئے ہیں۔ ہم بھی اس حلقے کے بغوش تھے۔ لہذا سیکرٹری صاحب نے ہم سے بھی کہا کہ کیا شراب کے بغیر انسان کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ لکھنا ہی ہے تو اور مشروبات موجود نہیں؟ ان کی فرمائش پر ہم نے بادام، گنے کے رس، سوڈا واٹر اور لسی کے مضامین باندھے لیکن یہ اعتراض کرنے میں باک نہیں کہ وہ کچھ مقبول نہ ہوئے۔ شاید ہم سے بہتر شاعر اس کی کوشش کرتے تو کامیاب ہو جاتے۔

یونیورسٹی پروفیسر اور طوطے کی توپ

کراچی کے اہل نظر جو تازہ بستیاں آباد کر رہے ہیں، ان میں ایک کراچی یونیورسٹی اسٹاف ٹاؤن بھی ہے۔ اس کا شمار ان ٹاؤنوں اور بستیوں میں نہیں ہے جن کے لمبے چوڑے اشتہار اخباروں میں آتے ہیں کہ آئیے سبز باغ میں مکان بنائیے، ایسا عمدہ موقع ہے کہ آپ کو ہر طرف ہر ایسی ہر نظر آئے گا۔ پھر ایک دن معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کے ڈی اے سے منظوری لینا بھول گئے۔ پھر یہ پتہ چلتا ہے کہ زمینوں کے اصل مالک سے بھی جو کچھ فلاں کا زمیندار ہے، سودا پوری طرح طے نہ کیا تھا کیونکہ انسان خطا و نسیاں کا پتلا ہے۔ بعض بزرگ تو ان تازہ بستیوں کے آباد کرنے والوں میں سے جو خریداروں کو ہزار ہزار گز کے پلاٹ مٹی کے مول آسان قسطوں پر دیتے تھے آخر حوالات میں بھی گئے

ع گز بھر زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ہم نے ایک آدھ بار ایسے ایک بزرگ کی سفارش بھی کی کہ بھول چوک میں ایسا ہو جاتا ہے۔ افسر متعلقہ نے کہا: ہم بھی تو انسان ہیں۔ خطا و نسیاں کا مرکب ہونے کی رعایت ہمیں بھی تو دیجئے۔ انہوں نے بھول چوک میں پلاٹ بیچے اور لوگوں کی رقیس کھائیں، ہم نے بھول چوک میں انہیں پکڑ لیا۔

غیر اس وقت بات کراچی یونیورسٹی کے اسٹاف ٹاؤن کی ہے۔ جس میں ہمارے دانشور طبقے کی کریم یعنی بالائی رشتی ہے یا جمی ہوئی ہے۔ یعنی یونیورسٹی کے استاد اور عملے کے دوسرے آدمی مقیم ہیں۔ اس کا سروے گھر کے ایک بھیدی یعنی یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ کے ایک استاد اے ٹی عمر صاحب نے کیا ہے۔ اس میں عورتوں مردوں کی آمدنیوں، تنخواہوں، بچوں، نوکروں حتیٰ کہ ان کے نوالوں تک کو گنا گیا ہے۔ اگر کاتب صاحب جنہوں نے اس روز شورے کے تیزاب کو سونے کا تیزاب لکھ دیا تھا، آج نوالوں کو نواسوں لکھ جائیں تب بھی ہرج نہیں کیونکہ عمر صاحب نے اپنے جائزے میں سب سے پہلا انکشاف یہی کیا ہے کہ اس ٹاؤن والے فیملی پلاننگ سے بے اعتنائی برتتے ہیں ید طولی رکھتے ہیں۔ ہر چند کہ فیملی پلاننگ کا بورڈ بھی چوراہے میں نصب ہے کہ جو بولے سونہال۔ بڑا کنبہ جنجال۔ چھوٹا کنبہ خوشحال وغیرہ، لیکن جو کوئی بھی آتا ہے، اسے ٹھوکر ہی لگاتا ہے۔ حتیٰ کہ دم تحریر اس میں بچوں کی تعداد

۴۵ فیصد ہو گئی ہے۔ یونیورسٹی کے متعلق تو ہم بوجہ احترام کچھ نہیں کہتے لیکن یونیورسٹی ناؤں ضرور باز پچھ اطفال بن گیا ہے۔

اساتذہ کی اس ہستی کے متعلق یہ جان کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ اس میں خواندگی کا تناسب ستر فی صد ہے۔ آسان زبان میں یہ کہہ کر اپنی یونیورسٹی کے ستر فی صد اساتذہ پڑھے لکھے ہیں۔ بعض ملکوں میں یہ تناسب اس سے زیادہ بھی ہوتا ہے۔ بعض یونیورسٹیوں کے تو سو فیصد اساتذہ تعلیم یافتہ پائے گئے لیکن ہمارے ملک میں جہاں عام لوگوں کا تناسب خواندگی میں فیصد سے زائد نہیں، اساتذہ میں سے ستر فی صد کا لکھا پڑھا ہونا بھی بڑی بات ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے لکھے پڑھوں کا اتنا بڑا تناسب اگر اور کسی طبقے میں ہے تو وہ بے روزگاروں اور گداگروں کا ہے۔ سال گزشتہ حیدرآباد میں گداگروں کا جو سروے ہوا تھا اس سے معلوم ہوا تھا کہ ان میں گدڑی کے کیسے کیسے لال ہیں۔ مڈل اور ہائی اسکول تک پڑھے تو بے شمار ہیں لیکن گریجویٹ بھی نایاب نہیں۔

شروع میں اور لوگوں کی طرح ہم بھی سب پروفیسروں کو پڑھا لکھا سمجھتے تھے۔ کم از کم یہ ضرور گمان تھا کہ حرف شناس ہوں گے اور اپنے دستخط کر لیتے ہو گے۔ ہمارے سامنے کے فٹ پاتھ پر پروفیسر جی خان جو اس پیشے میں آنے سے پہلے گھسیٹے خان کہلاتے تھے اور گنڈیریاں بیچتے تھے، اب آج کل لوگوں کو قسمت کا حال بتاتے ہیں اور بیاہ شادی، محبوب اور مقدمے وغیرہ کے ضمن میں نامراوؤں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ ایک باریک معاملے میں ہمیں ان کی گواہی کی ضرورت پڑی تو ہم نے ان سے کہا، پروفیسر صاحب لیجئے اس کاغذ پر دستخط کر دیجئے۔ فوراً انگشت چپ سامنے کر دیا کہ لیجئے، انگوٹھا لگا دیئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی تمام تر توجہ باطنی علوم پر رہی ہے۔ اس لیے ظاہری علوم کی انہوں نے زیادہ پروا نہیں کی۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ اسکول گئے بغیر آپ نے ستاروں کے علم اور جنات پر عبور کیسے حاصل کیا تو فرمانے لگے۔ یہ اللہ کی دین ہے۔

ممکن ہے یونیورسٹی کے اساتذہ کہیں کہ ان کو فٹ پاتھ کے پروفیسروں یعنی قسمت کا حال بتانے والوں، طوطے سے تو پچلوانے والوں اور موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والوں کے زمرے میں کیوں شمار کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہی اعتراض ان لوگوں کو بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ کیوں ملایا جا رہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ بعض یونیورسٹی پروفیسروں کی تحریر و تقریر دیکھنے کے بعد اس اعتراض میں خاصا وزن محسوس ہوتا ہے۔ جس نے ایم اے کر لیا۔ پروفیسر بن گیا۔ بھلا طالب علموں کے سامنے غالب پر تقریر کر لینا کون سا بڑا اکمال ہے، کسی مجمع کے سامنے تقریر کر کے میرے کاسرمہ تو ذرا بیچ کر دکھائیں اور ایسا پروفیسر تو شاید کراچی یونیورسٹی میں ایک بھی نہ ہوگا جو طوطے سے تو پچلوا بندوبست بھی چلوا سکے۔ جنات کو قابو میں کرنے کا عمل تو شاید ہمارے وائس چانسلر صاحب تک کو معلوم نہ ہو۔

چڑیا گھر کے دروازے صحافیوں پر کھل گئے

رشک اور حسد اچھے جذبے ہوں یا برے، بہر حال انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ کئی بار ہمیں، کہ اپنی خودی کو بلند کر کے اپنا شمار ادیبوں میں کرتے ہیں، خیال آتا ہے کہ ہمارے صحافی یعنی اخبار نویس بھائی کتنی اچھی قسمت لے کر آئے ہیں۔ پچھلے دنوں کراچی کے کسٹمر صاحب نے مکانات کے لئے پلاٹ دیے تو صحافیوں کو۔ اگرچہ اس میں گیارہوں کے ساتھ ساتھ کسی کسی گھن کا بھی فائدہ ہو گیا۔ یعنی ہمارے یار عزیز ابراہیم چلیس بھی لامکان سے لینڈ لارڈ ہو گئے۔ لیکن ادیب بچارے من حیث القوم اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور نالے کو رسا باندھتے رہ گئے۔ غالباً کسی نے کسٹمر صاحب کو مشورہ دیا ہو گا کہ آج کل کے ادیب جب بغیر پلاٹ افسانہ بلکہ ناول تک لکھ سکتے ہیں تو کیا بغیر پلاٹ کے مکان کھڑا نہیں کر سکتے؟ یہ عالی خیال لوگ سنگ و خشت سے جہاں پیدا کرنے کے محتاج نہیں۔ یہ وہ شاہین ہیں کہ پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ شہروں میں بھی ہمیشہ صورت خورشید جیتے آئے ہیں، ادھر ڈوبے ادھر نکلے۔ ادھر ڈوبے ادھر نکلے۔ یعنی اس محلے سے مالک مکان نے نکال دیا تو کسی دوسرے محلے میں جا بسے۔ وہاں مکان دار نے اپنے نرغ کو بالا اور اپنی نوا کو تلخ کر دیا تو کہیں اور جا براہے۔ فراغت ادیب کی دشمن ہے۔ کسی ادیب کو کھانے کو روٹی اور رہنے کو مکان مل جائے تو پھر وہ ادیب نہیں رہتا۔ رہتی دنیا تک زندہ رہنے والا ادیب پیدا نہیں کر سکتا۔ وغیرہ

ہمارا اپنا معاملہ عجیب ہے۔ ہم نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ ہمیں کبھی ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو۔ گا کہ ہم کیا ہیں۔ ادیب ہونے کا دعویٰ کریں تو ذی علم نقاد فرماتے ہیں کہ تم اخباری اشتہاری آدمی۔ کس برتے پر تپانی۔ لکھتے ہو تو اخبار میں لکھتے ہو جو دوسرے روز ردی میں بک جاتا ہے۔ ادب عالیہ وہ ہوتا ہے کہ ناشر کے گودام میں پڑے پڑے اسے کیڑا بھی کھا جائے یا چوہا بھی کتر جائے تو اسے زوال نہیں۔ دوسری پہچان اس کی یہ ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے ڈکٹری اور اسپر دو دنوں کی ضرورت بار بار پڑے۔ ادھر سے مایوس ہو کر جرنلسٹ برادری میں جائیں تو وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ یہ شعر گو اور افسانہ نویس بہت اونچا اڑنے لگا ہے۔ صحافیوں میں قدم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسے کہ کشتہ نہ شدا ز قبیلہ مانعست، جو شخص پریس کلب میں شطرنج، کیرم اور تبولان کھیلنے اور چائے، سگریٹ کی عاشقی میں آدمی کی بجائے آدمی کا کشتہ نہ بن جائے اسے ہم اپنے میں نہیں گنتے۔ نہ اسے ہم زمین کے پلاٹ کا مستحق جانتے

ہیں۔ اے صاحبو چاہو تو ہمیں چگاڑ کہہ لو کہ کبھی ادب کے شہتر سے چنے ہیں اور کبھی صحافت کی شاخ سے اٹے لٹکے ہیں۔

لاہور اور لراچی کے ادیب کہ مدت سے کاغذ پر ادیبوں کی ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے نقشے لیے پھرتے ہیں۔ آج کل اپنی بے خانمانی اور دربدری کا عشرہ ترقیات منانے کی سوچ رہے ہیں۔ خیر سے ان کی امیدوں اور عرضداشتوں کا تیسرا انچبالہ منصوبہ جلد ہی شروع ہونے والا ہے کیونکہ جنوری میں راسٹر گلڈ کی تیسس کو دس سال ہو جائیں گے۔ اپنے صحافی بھائیوں کو ہم مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کو نہ صرف پلاٹ ملے بلکہ اس رعایت کا بھی اعلان ہو گیا ہے کہ وہ صحافی جو واقعی مستند صحافی ہیں، یعنی جن کے پاس اپنے اخبار کا شناختی کارڈ ہے، اسے دکھا کر چڑیا گھر مفت دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اعلان کراچی کارپوریشن کے چیرمین صاحب جاتے ہوئے کر گئے ہیں۔ ہم نے تحقیق کیا آیا یہ شاندار رعایت ادیبوں کو بھی دی جائیگی؟ کارپوریشن کے دفتر سے معلوم ہوا کہ جی نہیں۔ اپنا منہ دھور کھینے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا بھر میں کسی صحافی کے ساتھ اس قسم کی رعایت نہیں برتی جاتی۔ وائرلپ مین اور آرٹسٹس ٹیوڈ وغیرہ اور نہ جانے کون کون کہ اپنے کو بڑا اتیس مار خاں اخبار نویس جانتے ہیں، چڑیا گھر جائیں تو ان کو پورے پیسے دیکر ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ پاکستانی صحافیوں کی طرح نہیں کہ پاس دکھایا اور دھناتے موٹھوں پر ٹاؤ دیتے چار آنے ادا کئے بغیر چڑیا گھر میں داخل ہو گئے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ شام کو چڑیا گھر کا وقت ختم ہونے پر ان کو نکالنے کا بھی حکم ہے یا یہ لوگ چاہیں تو رات بھی وہاں رہ سکتے ہیں۔ ایک زمانہ میں تو وہاں بہت سے چنجرے خالی ہوتے تھے۔ اب کا کہہ نہیں سکتے۔ کیونکہ مسئلہ فقط ٹھکانے کا ہے۔ کھانے کے لیے تو چڑیا گھر کے تماشا گاہی مونگ پھلی، پرل چاول، بھٹے، کیلے وغیرہ چڑیا گھر کے مکیٹوں کے لیے لے ہی جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ادیبوں نے کیا تصور کیا ہے کہ ان پر چڑیا گھر کے دروازے بند ہیں۔ چلنے مکان اور پلاٹ نہیں ملتا نہ سہی۔ ہم اس پر اصرار نہیں کرتے۔ کیونکہ لامکانی میں بھی ایک مزہ ہے لیکن چڑیا گھر کے پاس انہیں بھی جاری کر دیئے جائیں تو بڑی حد تک ان غریبوں کی اشک شوقی اور پرانی بے انصافیوں کی تلافی ہو جائے۔ جب کبھی ہمارا دل طرز تپاک اہل دنیا دیکھ کر جل اٹھے تو چڑیا گھر میں جا بیٹھے۔ گھاس کا بھی وہاں وافر انتظام ہے کہ کھونے اور کھانے دونوں کام آسکتی ہے۔ وہیں شام کو صبح اور صبح کو شام کر دیا۔ اس انتظام سے عام ادب دوستوں اور قاریوں کو بھی سہولتیں ہو جائیں گی جو ادیبوں کی شکل دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ پھر یہ ہوگا کہ جسے حضرت گلدھامیٹھوی یا عقرب امرت سری یا گورخر رومانی کی زیارت کا شوق ہوا، چونی میں چڑیا گھر کا ٹکٹ لے کر اندر جا کر انہیں دیکھ لیا کرے گا۔ چونی تو انہی کی زیارت سے وصول سمجھنی چاہیے۔ باقی جانور مفت میں دیکھ لیے۔

سائل اور گدا

سنا ہے کہ شہر میں گدا گدوں کو اٹھانے کا ہفتہ شروع ہو گیا ہے پہلے گدا گرختی داتا کو دیکھ کر اس کے پیچھے بھاگتے تھے۔ اب آگے بھاگتے ہیں کہ کہیں پکڑوانہ دے۔ شہر کے اکثر یتیم اپنے والدین کے ہمراہ حیدر آباد کو ہجرت کر گئے۔ کچھ جو تماشائے اہل کرم دیکھنے پر مصر رہے، اب پولیس والوں کے مہمان ہیں۔ یہ بھی برانہ ہوا۔ چند دنوں کے لیے روٹی کیڑا نیک، مائی نیک، باوا کے ذمے نہ سہی، سرکار کے ذمے ہی سہی۔ پھر ایک ہی ہفتے کی تو بات ہے، باقی اکاون ہفتے تو اپنے ہی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس بار پولیس در بدر پھر کر چندہ مانگنے والوں پر بھی گرفت کر رہی ہے۔ یہ سن کر ہمارے بعض دوستوں نے جو رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹر ہیں، اپنی پیشانی پر سے (ہمارا مطلب ان کے اخباروں رسالوں کی پیشانی ہے) سالانہ چندہ وغیرہ کے الفاظ اڑا دیئے۔ اور تو اور چند فلم چند ایڑی وغیرہ والوں کو بھی لوگوں نے گڑبڑا دیا ہے کہ بھائیو خطرہ ہے۔ کہیں کوئی ایس جیم بچہ شہزادہ نہ آ نکلے۔ پرانے شاعروں کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ جب کبھی چوروں کی پکڑ دھکڑ ہوتی تھی تو دزدو حنا کے نام کا بھی پرچہ چاک ہوتا تھا۔ ہاتھ پر مہندی لگاتے میں۔ جو نشی علاقے مہندی سے بچ رہتے ہیں ان کو اصطلاح میں دزدو حنا کہتے ہیں۔ لیکن پولیس والوں سے یہ توقع کرنا کہ تعزیرات اور ضابطہ فوجداری کے علاوہ ڈکسٹری میں بھی دیکھا کریں اور ایم اے اردو میں داخلہ لیں، ذرا زیادتی ہے۔ ایک بار لاہور پولیس نے ایک پیکٹ پکڑا تھا کیونکہ منجر کی اطلاع تھی کہ اس میں فارغ بخاری صاحب نے پشاور سے زیر دم رکھ کر بھیجا ہے۔ بڑی احتیاط سے کہ پھٹ نہ جائے، پیکٹ کو کھولا گیا تو تصدیق ہوئی کہ ان کے مجموعہ کلام زیر دم کا مسودہ ہے (ZERO BOMB) نہیں ہے۔

ہم اپنے ان شاعر احباب کو بھی جن کے تخلص سائل، گدا وغیرہ ہیں یہ مشورہ دیں گے کہ اس ہفتے گھر سے نہ نکلیں۔ گدا کے تخلص سے پرہیز کا مشورہ تو ہم ایک اور بنا پر بھی دیں گے۔ ہمارے وطن پنجاب بالخصوص لاہور کے صحت مند لوگ بعض اوقات بے ضرورت بھی ہر لفظ کے تلفظ میں دو چشمی کا

اضافہ کر لیتے ہیں آج کل اتنی فرصت کسے کہ ٹائٹیں گنتا پھرے، دوہیں یا چار۔ اور پھر سینگ ان میں سے کسی کے بھی نہ ہونے کے باعث ایسی غلط فہمی ایک حد تک قابل معافی بھی کہی جاسکتی ہے۔ اسی طرح خطوں میں اپنے نام کے ساتھ حقیر فقیر لکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں کیونکہ ہمارے ایک دوست جو اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ خاکسار لکھا کرتے تھے۔ خاکساروں کی پکڑ دھکڑ کے زمانے میں ایک دن رات کے لیے حوالات ہو آئے ہیں۔

ادھار کے لفظ سے خیال آیا کہ مالٹنا کا مصدر اس کے ساتھ بھی لگتا ہے۔ یوں تو آج کل دعا مالٹنا بھی خطرے سے خالی نہیں لیکن ادھار میں تو پیسے ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں۔ یعنی بنانا یا ثبوت ہے۔ ہمارے احباب جانتے ہیں کہ صرف مشتاق احمد یوسفی کا نہیں ہمارا بھی بٹلنگ سے پرانا تعلق ہے۔ وہ اس طرح کہ شاید ہی اس ملک میں کوئی بنک ہو جس سے ہم نے کبھی قرض نہ مانگا ہو۔ اور اس نے انکار نہ کیا ہو۔ حالانکہ اچھے زمانے میں ہم خود بینکوں کی داغ بیل دے دے مدد کرتے رہے ہیں۔ ایک بار ایک مشہور بنک نے اخبار میں یہ درخواست طبع کرائی تھی کہ ہمارے ہاں روپے جمع کرائیے۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ گھر میں بھی روپیہ بیکار ہی پڑا ہے، اچھا ہے ان لوگوں کی مدد ہو جائے، ساری رقم وہاں جمع کرادی۔ سو روپے سے کچھ اوپر ہی ہوں گے اور ہمیں یقین ہے کہ بنک مذکور نے کسی کاروبار میں لگا کر لاکھوں کے دارے نیارے کیے ہوں گے۔ لیکن چند ماہ بعد بنک کاروبار میں سر تبدیل ہو گیا۔ کہاں تو یہ عجز والی حاج کہ اخبار میں ضرورت روپیہ کی اپیلیں شائع کر رہے ہیں اور کہاں یہ کہ ہمارا کھاتہ خود ہی بند کر کے پانچ روپے چرہا سی کے ہاتھ ہمارے پاس بھجوا دیے کہ صاحب اپنا اکاؤنٹ کہیں اور کھولے۔ اس سے زیادہ کا تو آپ کے کھاتے کی اسٹیشنری ہی کا خرچ ہے۔ ہم یہ ذکر بھول گئے کہ مہینے بھر کے بعد ہم نے پانچ روپے چھوڑ کر باقی رقم نکوالی تھی اور اس کے بعد پہلی کو چیک جمع کرتے اور دوسری کو روپیہ نکوالی لیتے۔ کیوں نہ نکلاتے۔ ہمارا اپنا روپیہ تھا۔

بات گدواؤں سے چلی تھی، مضمون کی رعایت سے آوارہ ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ گدا گروں کے متعلق یہ فرض کر لینا درست نہ ہوگا کہ سبھی فراڈ ہوتے ہیں۔ بعض کی مجبوریاں پیدا انہی بھی ہوتی ہیں۔ ابھی کل ہی ایک لڑکا معصوم صورت گلے میں تختی لوکائے آیا، جس پر لکھا تھا کہ میں گوٹکا بہرا یتیم ہوں۔ راہ مولا مدد کیجئے۔ ہم نے ایک روپیہ دیا اور چکار کر پوچھا کہ بر خودار کب نے گونگے بہرے ہو؟ بولا جی پیدائش ہی سے ہوں۔

میلہ مویشیاں میں اول انعام ایک شاعر کو ملا

اخبار میں آیا ہے کہ اردو کے مشہور شاعر اور صحافی جناب خلیق قریشی مدیر روزنامہ ”عوام“ لاکھپور کو کشمیری میلہ مویشیاں کے جلسہ تقسیم انعامات میں گورنر صاحب نے ایک ہزار روپے کے انعام سے نوازا ہے۔ پہلے ہم سمجھے کہ خلیق صاحب نے کوئی بھینس پالی ہوگی اور اسے مقابلے میں داخل کیا ہوگا۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ انعام خود ان کو ملا ہے۔ جب ہمیں ایک اور طرح کی غلط فہمی ہونی شروع ہوئی تو ایک دوست نے وضاحت کی کہ اس میں خلیق صاحب کی صحت مندی اور ضخامت کی طرف کوئی اشارہ نہیں، یہ انعام ان کی قومی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ہے۔

خلیق صاحب قادر الکلام شاعر اور پرانے صحافی ہیں۔ وہ اس اعزاز کے ہمیشہ سے مستحق تھے۔ ہاں اس میں ہمیں کلام ہے کہ میلہ مویشیاں اس اعزاز بخشی کے لیے موزوں مقام تھا۔ ہمیں تو خیر معلوم ہے ہی کہ یہ انعام ان کی ادبی خدمات کا صلہ ہے لیکن لاکھوں قارئین کو فردا فردا ان کے گھر جا کر کوئی سمجھائے گا۔ ایسی غلط فہمی ہمیں ایک بار پہلے بھی ہو چکی ہے۔ ایک مشہور افسانہ نگار صاحب نے ایک بار ہم سے فرمائش کی تھی کہ آپ مقامی وٹرنری اسپتال والوں کے خلاف لکھئے۔ میں کئی روز سے وہاں جا رہی ہوں لیکن کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔ ہم نے ان سے کہا کہ جب شہر میں دوسرے اسپتال انسانوں کے علاج کے موجود ہیں تو آپ مویشیوں کے اسپتال جاتی ہی کیوں ہیں؟ وہ بہت ناراض ہو گئیں اور بولیں، میں وہاں اپنے علاج کے لیے تھوڑا ہی جاتی ہوں، اپنی بیمار بکری کو لے کر جاتی ہوں۔

قیاس کہتا ہے کہ میلہ مویشیاں کے موقع پر کوئی مشاعرہ ہوا ہوگا جس میں خلیق صاحب نے مویشیوں کے متعلق یا پھر ویسے ہی کوئی قومی یا رومانی نظم پڑھی ہوگی۔ دراصل آج کل مشاعرے کی رسم ہر تقریب پر ہے۔ پچھلے دنوں بیمہ کمپنیوں کی طرف سے ہوا۔ گزشتہ ماہ ایک مشہور میمن ریکس نے اپنے بچے

کے تختے پر پہلے بھرا کر مانا جاتا ہے، لیکن جب معلوم ہوا کہ اس میں خرچ زیادہ پڑتا ہے تو مشاعرہ کرالیا۔ ہمارے دوست اور مشہور شاعر دیوانہ میرٹھی نے ایک بار ہم سے آکر فرمایا کہ یہ بیان کیا کہ مجاہدوں کی سالانہ آل پاکستان کانفرنس میں پہلا انعام مجھے ملا ہے۔ ہم نے کہا، اچھا مبارک ہو۔ آپ تو چھپے رستم بن گئے۔ ہمارا خیال تھا نرے شاعر ہیں، اک ذری ہمارے بال بھی کاٹ دیجیے۔ بھنا کر کہنے لگے۔ جناب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے انعام بال کاٹنے پر نہیں، ملا اس کانفرنس کے مشاعرے میں غزل پڑھنے پر ملا ہے۔

آئندہ کے لئے ہماری سفارش ہے کہ اس قسم کی تقریبوں کے اعلانات زیادہ مفصل اور واضح ہوا کریں۔ ورنہ کل کلاں یہ بھی سننے میں آسکتا ہے کہ بزم اردو لاڑکانہ کے سالانہ مشاعرے میں کمشنر صاحب نے ایک بھینس کو انعام اور خلعت فاخرہ عنایت کی ہے۔ بعد میں تحقیق سے پتہ چلے کہ دونوں تقریبیں یعنی مشاعرہ اور میلہ موسیٰاں ایک ساتھ تھیں، اس لیے خبریوں بن گئی۔ ورنہ بھینس کو یہ انعام غزل پڑھنے پر نہیں ملا۔ عین ایسے ہی جیسے خلیق صاحب کو انعام زیادہ دودھ دینے پر نہیں ملا۔ پچھلے سال جشن مہران کے موقع پر بھی کچھ ایسی واردات ہو چلی تھی۔ خبر آئی کہ اس تقریب کے ضمن میں گھوڑوں کی نمائش اور مشاعرے کے لئے یکساں رقبے رکھی گئی ہیں۔ کچھ شاعروں نے شور مچایا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ گھوڑوں گدھوں کو ایک لاکھی سے نہیں ہانکنا چاہیے۔ ہم نے بھی ایک کالم اس موضوع پر لکھا اور ایک افواہ کی بنا پر ذکر کیا کہ دعوت نامہ ہمیں بھی آیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مشاعرے میں شرکت کے لیے ہے یا نمائش میں۔ سنا ہے خود منتظمین میں بھی بحث ہوئی کہ ہمیں بلایا جائے تو کس تقریب سے، بطور شاعر یا گھوڑے کی حیثیت سے۔ اس بحث میں اتنا وقت گزر گیا کہ ہم نہ جاسکے۔ ہم ذاتی طور پر تو اپنے کو شاعر ہی سمجھتے ہیں گھوڑا نہیں۔ لیکن چوں کہ جشن مہران میں بھی جلسہ تقسیم انعامات کیجا ہوتا ہے لہذا کیا عجب اس موقع پر بھی اخباروں میں اسی قسم کی خبر چھپتی کہ سکھر کی گھوڑا دوڑ میں ابن انشاء صاحب اول آئے۔

اردو ادب میں ہمارا مقام

اردو ادب میں ہمارا جو مقام ہے (ہماری اپنی نظر میں) اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کچھ کہیں گے تو کسی کی زبان تھوڑا پکڑی جاسکتی ہے۔ لوگ اسے خود ستائی پر محمول کریں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے مضامین میں ہم کورے ہیں۔ فنون لطیفہ سے ہمارے نابلد ہونے کی بات جواتی مشہور ہے اس کی کچھ اصل نہیں۔ ڈراما ہو یا موسیقی یا مصوری، کسی میں ہم کسی اور سے پیٹے نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے معیار بہت اونچے ہیں۔ لندن میں ہم نے سر لارنس ایور کا ایک کھیل دیکھا اور بہت خوش ہو کر اخباری نمائندوں سے ان کی ہونہاری کی تعریف اور ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی اور یہ واقعی سچ ہے کہ وہ برابر اسٹیج پر آتے رہے تو ایک دن نام پیدا کریں گے۔ شکسپیر کو بھی ہم بہت پسند کرتے ہیں اور اردو کے نقادوں سے متفق ہیں کہ اپنے زمانے کا آغا حشر تھا۔ موسیقی میں لوگوں نے ہمیں اس روز روشن آرا کی گائیکی پر سر ہلاتے پکڑا۔ ایک روشن آرا ہیں اور ایک اور ہیں جن کا بھلا سا نام ہے اور نور جہاں ہے۔ ان سب کے فن سے ہم محظوظ ہونے پر قادر ہیں بشرطیکہ ہمیں پہلے سے کوئی بتادے کہ یہ روشن آرا گارہی ہیں یا نور جہاں ہی ہیں۔ مصوری میں ہم اپنی ژرف نگاہی کے قائل ہیں۔ اس روز کسی نے ہمیں اپنی تصویر دکھائی۔ ہم نے پوچھا کس کی ہے۔ معلوم ہوا پکا سو کی ہے۔ ہم نے کہا یہ بات ہے تو بہت اچھی ہے۔ پکا سو کے کیا کہنے ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ اس کا ایک ایک نقش قریادی ہے اور رنگ کتنے اعلیٰ کو اٹنی کے لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے کراچی آرٹ کونسل میں کئی مقامی مصوروں کی نمائش دیکھی ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ پکا سو کا کوئی جواب نہیں۔

کتوں کے کاٹنے کے اوقات مقرر ہو گئے

اخبار کی خبر سے معلوم ہوا ہے کہ کراچی میں کتوں کے کاٹنے کے اوقات مقرر ہو گئے ہیں۔ وہ دن گئے جب یہ اپنی من مانی کیا کرتے تھے۔ جب چاہا کاٹ لیا، دانت گزودے۔ نہ دن دیکھتے تھے نہ رات دیکھتے تھے۔ اب ان کو گھڑی دیکھ کر کاٹنا ہوگا۔ بس صبح ۹ بجے سے ۴ بجے تک اجازت ہے۔ اس سے باہر نہیں۔ جمعہ اور ہفتہ کو فقط دو پہر تک کاٹ سکتے ہیں اور اتوار کو بالکل منع ہے۔ بعض اردو نوں اور تہواروں کی چھٹیاں بھی لازمی ہیں جن کی فہرست کوئی بھی کتا کار پوریشن کے دفتر جا کر ملاحظہ کر سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ہماری اطلاع کا ذریعہ بالواسطہ ہے کیونکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کتوں کے نام کوئی تحریری سرکلر جاری نہیں کیا گیا۔ شاید اس لئے کہ ہمارے ملک میں کتوں کی شرح خواندگی انسانوں سے بھی کم ہے۔ معلوم رہے کہ پاکستان میں انسانوں کی شرح خواندگی پندرہ فیصدی کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے دس فیصدی کو تو پڑھنے کی کتابیں نہیں ملتیں اور وہ اپنا پڑھا پڑھایا بھول جاتے ہیں۔ پانچ فیصدی کے قریب فلموں کے بورڈ اور ڈائجسٹ پڑھ پڑھ کر اپنی خواندگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض طبقوں مثلاً اعلیٰ افروں، ادیبوں، صحافیوں، اسکول ٹیچروں اور پروفیسروں وغیرہ کی ایک بڑی تعداد خواندہ ہے اور دستخط تو قریب قریب سبھی کر لیتے ہیں، حتیٰ کہ کہیں کوئی سیاستدان بھی پڑھا لکھا نکل آئے تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ لیکن عام آبادی کا یہ حال نہیں اور جانوروں کو تو نئی پالیسی تک میں نظر انداز کیا گیا ہے۔

آج کل اپنا ذریعہ معلومات تو بالعموم کوئی نہیں جانتا اور ہم صحافیوں کو تو بالخصوص اس کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی ہم بتا دیں کہ اس پابندی کا علم ہمیں سول اسپتال کے ذریعے سے ہوا ہے جنہوں نے کتے کا کاٹنے کے لیے علاج کی سہولت صبح ۹ بجے سے ۴ بجے تک کے لیے رکھی ہے۔ ظاہر ہے انہوں نے

سفارتی سطح پر یا کسی چوٹی کی کانفرنس میں کتوں کے ساتھ مقررہ اوقات میں کاٹنے کا کوئی شریفانہ معاہدہ طے کیا ہوگا۔ ورنہ وہ دن رات کے کبھی اوقات میں اسپتال کھلا رکھتے۔ بہتر ہوتا کہ وہ سول اسپتال میں اوقات کا بورڈ آویزاں کرنے کے ساتھ ساتھ اس معاہدے کی مناسب پبلیٹی بھی کرتے اور شہری آبادی کو بھی ہدایت کرتے کہ وہ اپنے آپ کو ان اوقات سے باہر کتوں سے ہرگز نہ کٹوائیں۔ ہمارے ملک میں ایسے غیر ذمہ دار لوگوں کی کمی نہیں جو جس وقت جی چاہتا ہے، کسی کتے کے منہ میں جا کر اپنی ٹانگ دے دیتے ہیں۔ یہ بری بات ہے۔ اگر کسی کو بہت ہی شوق ہے تو کسی اور جانور سے کٹوا سکتا ہے۔ کاٹنے والے دیگر جانوروں کی فہرست بھی غالباً کارپوریشن یا سول ہسپتال سے ان کے دفتری اوقات میں حاصل کی جاسکتی ہے۔

اوقات کی پابندی کے لیے کئی تجویزیں کارپوریشن کے زیر غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر کتے کو ایک ایک گھڑی مہیا کی جائے اور اسے وقت دیکھنا بتایا جائے۔ ہمارے خیال میں ایک ایک گھڑی شہریوں کے لیے بھی ہونی چاہیے تاکہ وقت بے وقت کتوں سے فرمائش نہ کر دیں کہ ہمیں کانو۔ سائرن بجانے کا انتظام بھی ہو سکتا ہے، مہذب ملکوں میں جہاں وقت کی پابندی جزو ایمان ہے، ہمیں نہیں معلوم اس سلسلے میں کیا ہوتا ہے۔ ولایت جا کر ہم اور ہی قصوں میں الجھ رہے اس مسئلے کا مطالعہ نہ کر سکے۔

ریڈیو اور ٹیلیوژن بھی اس سلسلے میں خبردار کر سکتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے بیشتر کتوں کو ٹیلیوژن دیکھنے کی سہولتیں بھی حاصل نہیں۔ حالانکہ پاکستان ٹیلیوژن کارپوریشن ان کے لیے lassie نام سے آج کل ایک خاص پروگرام چلا رہی ہے جس میں ایک کتا اور اس کے ساتھ پالتو انسان اور بچے وغیرہ ہیں۔

آگئے قوم کی بے لوث خدمت کرنیوالے ہمارے دوسرے اعلان کا انتظار کیجئے !!

جوں جوں ایکشن قریب آرہے ہیں لوگوں میں بے لوث خدمت کا جذبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ہم نے بعض چانسنے والوں سے کہا بھی کہ حضرت آپ اپنا گھربار دیکھئے کار بار دیکھئے۔ اتنے ایثار کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن جواب یہی ملتا ہے کہ ہم قوم کی ناز کو منجھار میں کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ایکشن میں کون کون کھڑا ہو رہا ہے؟ فی الحال معلوم نہیں۔ وثوق سے ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم کھڑے نہیں ہو رہے۔ کم از کم فی الحال ہمارا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں، کیونکہ ہم نام و نمود سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ البتہ اگر دوسرے امیدوار موزوں نہ ہوئے، جس کا ہمیں اندیشہ ہے تو شاید پبلک کے اصرار سے مجبور ہو کر قوم کی خدمت اور نظریہ پاکستان کی حفاظت کیلئے میدان میں آنا ہی پڑے کیونکہ بے جاضد ہماری طبیعت میں نہیں ہے۔ ہماری ذات اور خدمات محتاج تعارف نہیں اور ہمیں اعتراف ہے کہ ہم ہر طرح سے آپ کے قیمتی ووٹ کے مستحق بلکہ حقدار ہیں تاہم اس سلسلے میں ہمارے قطعی فیصلے کے لیے ہمارے دوسرے اعلان کا انتظار کیا جائے۔ جو جلد ہی اردو میں کیا جائے گا۔

ہمارے محترم بزرگ ڈاکٹر ایم اے خانزادہ نے البتہ ابھی سے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کر دیا ہے اور ہمارے پاس ان کا ایک کتابچہ پہنچا ہے جس کا عنوان ہے ”قرآن کریم کی ایک ہزار آیات،، ڈاکٹر صاحب جامع کمالات آدمی ہے۔ عام ڈاکٹروں کی طرح نہیں کہ صرف آدمیوں کا علاج کرتے ہیں۔ ان کا فیض عام ہے۔ انشاء اللہ شفیایاب ہو کر واپس آئیے گا۔ پہلے تو یہ خود کو فقط ڈاکٹر ایم اے خانزادہ ہی لکھا کرتے تھے۔ پھر شاید کوئی پرانا شجرہ، اپنا یا کسی اور کا، ان کے ہاتھ آ گیا اور یہ خود کو نواب لکھنے لگے۔ اب کے سرورق پر جگہ زیادہ خالی پائی تو اپنی ذات پر سے تصوف و سلوک کے کچھ پردے بھی اٹھادیئے ہیں اور ہم ان کا نام یوں لکھا پاتے ہیں

ڈاکٹر نواب ایم اے خانزادہ حنفی نقشبندی، بریلوی۔

اتنی نسبتیں مشخص ہونے کے باوجود ان کی وجہ شہرت کچھ اور ہی ہے۔ آپ ہمارے، کالموں کی رونق

ملکہ تغزل، شعلہ خن، موجد صوت واحد مس بلبل کے نفس یا طلق یعنی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ وغیرہ ہیں۔ چونکہ اتنے بڑے منصب کے لیے فی زمانہ قریبی عزیز ہونا ضروری ہوتا ہے، لہذا واضح ہو کہ یہ مس صاحبہ موصوفہ کے والد گرامی بھی ہیں۔

یہ بات پٹے تک محدود نہیں، بعض اور لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ جب تصدیقوں کو آئیں تو پہلے پکار دیں۔ سرورق پر جس طرح پرانی کتابوں میں ”حسب فرمائش، بے الیں سنت سنگھ“ وغیرہ لکھتے ہیں یہاں بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ کتاب مستطاب، بعون صنایع مکین و مکان، جس کی بنیاد پر ایک اسلامی مملکت کا دستور تیار کیا جاسکتا ہے، ملکہ تغزل، مس بلبل امیدوار قومی اسمبلی پاکستان الیکشن کی خصوصی درخواست پر لکھی گئی ہے۔ ورق الیئے تو معلوم ہوگا کہ خانزادہ صاحب سے لوگوں نے کہا تھا کہ، آپ ۱۹۱۴ء سے سیاست کے میدان میں آچکے ہیں۔ خود کھڑے ہو جائیے کیونکہ آپ کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ لیکن یہ نہ مانے اور اپنی جگہ بقول خود، اپنی سب سے ذہین اور فہیم اولاد مس بلبل کو کھڑا کیا۔ قارئین کرام ہم سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمات کے بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔ کیونکہ اظہر من الشمس ہونے کی وجہ سے ہم خود نہیں جانتے۔ اتنی تیز روشنی میں آنکھیں چند ہی جانے کے باعث کوئی کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب ہی کے الفاظ میں ان کے کو یہ مژدہ دیتے ہیں کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی تمام عمر مس بلبل کو مشورہ دیتا رہوں گا اور جب قربانی کی ضرورت پیش آئے وہ مجھے سب سے آگے پائیں گی، چونکہ لوگ قربانی کا نام سنتے ہی کھال لیے پھینچ جاتے ہیں لہذا ہم واضح کر دیں کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ لفظ یہاں استعاراً استعمال کیا ہے

دستور بنانا خصوصاً اسلامی دستور بنانا ہمارے ہاں گھریلو دستکاری بن چکا ہے۔ جہاں دو آدمی بیٹھ گئے، اسلامی دستور بنانا شروع کر دیا۔ صدر مملکت کا اعلان سنتے ہی ڈاکٹر صاحب اور مس بلبل نے ہمیں اور ہم جیسے ہی دو ایک اور صاحبان علم و فضل کو دعوت نامہ بھیجا تھا کہ اب کی اتوار ہمارے ہاں آئیے کھانا ہوگا اور کھانے کے بعد پاکستان کا دستور بنا کر صدر مملکت کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ افسوس کہ ہم نہ جاسکے اور دستور بننے میں اتنی دیر ہو گئی جس کے لیے ہم قوم کے آگے شرمندہ ہیں۔ ہم گھٹنے دو گھٹنے کے لیے چلے جاتے اور دستور بنا آتے تو ڈاکٹر صاحب کو یہ کتابچہ نہ چھاپنا پڑتا، جس کی پیشانی پر لکھا ہے کہ مقصد اس کا بھی ایک اسلامی مملکت کا دستور تیار کرنا ہے۔

اس الیکشن نامے کا نام ہم بتا چکے ہیں ”قرآن کریم کی ایک ہزار آیات“ انداز اس کا یہ ہے کہ پہلے آیت پھر ترجمہ پھر توضیح۔ توضیح میں لامحالہ مس بلبل کی زندگی اور خدمات اور عزائم کے حوالے اور اشارے آگئے ہیں۔ مثلاً آیت تو یہ ہے (ترجمہ) ”اور جس نے جہاد کیا خدا کی راہ میں۔ پھر قتل ہو گیا یا غالب آ گیا“ توضیح میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ مس بلبل اپنی بزم نعت و ادب کی جس کی وہ بانی اور مستقل صدر ہیں سارے اسلامی ملکوں میں شاخص قائم کریں گی۔ پھر آیت ہے (ترجمہ) ”اور قتل کیا داؤد نے جالوت کو اور دیا اللہ تعالیٰ نے اس کو ملک“۔ توضیح میں ارشاد ہوتا ہے کہ ”صدر ایوب کو نالائق کہنے والا خود نالائق ہے“ ایسے ہی ایک آیت کی توضیح میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ وزیر خارجہ نے یک طرفہ معاملہ اقوام متحدہ میں پیش کر کے غلطی کی۔ مس بلبل کو انتخاب مل گیا تو یہ کشمیر اور حیدرآباد دونوں کے معاملات اقوام متحدہ میں ایک ساتھ پیش کریں گی۔ ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ قومی اسمبلی کا ممبر جو ہوتا ہے وہیں نشست، گفتگو اور برخاستن کر کے گھر چلا آتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ذکر کا کیا محل ہے؟ ایسے ہی کم فہم نگس کے بارغ میں جانے پر معترض ہوا کرتے ہیں کہ اس سے پروانے کے خون کا کیا تعلق ہے؟ بات سیدھی صاف ہے مس بلبل اسمبلی کی ممبر بن گئیں تو ہم پاکستان کے تین کروڑ شاعروں کی طرف سے مطالبہ کریں گے کہ ان کو وزیر خارجہ بنایا جائے۔ اس لئے نہیں کہ ہم چاہتے ہیں یہ ملک کے باہر ہی رہیں، کبھی یہاں نہ آئیں بلکہ اس لئے کہ یہی ہیں جو اقوام متحدہ میں کشمیر اور حیدرآباد کے مسائل کو منظم کر کے پیش کر سکتی ہیں۔ اتنی لمبی لمبی نظمیں سننے کی کس میں تاب ہے۔ اقوام متحدہ کہے گی کہ بابا جاؤ کشمیر لے جاؤ اور حیدرآباد بھی لے جاؤ اور ہاں جو ناگڑھ بھی رکھا ہے۔ اپنے سوٹ کیس میں ایک طرف کو اسے بھی ڈال لو۔

ڈاکٹر خانزادہ صاحب کا یہ پمفلٹ ”پہرا اگر نہ تو اند پر تمام کند، کی تعریف میں آتا ہے۔

کیونکہ کچھ دنوں پہلے خود مس صاحب نے جو اپنا منشور انتخاب نظم میں چھاپا تھا اس میں نقطہ یہ لکھا تھا کہ:

میں چاہتی ہوں قومی اسمبلی پہنچ جاؤں

نعموں سے ساری سوتی ہوئی قوم کو جگاؤں

ارادہ یہ مبارک ہے لیکن مس بلبل نے ذہین اور فہیم ہوتے ہوئے بھی شاید نہیں سوچا کہ کسی کو

کچھ نیند چگا دیا جائے اور وہ بھی نعموں سے یعنی غزلیں وغیرہ گا کر تو وہ کتنا شور مچاتا ہے۔ فیل مچاتا ہے۔

جگانے والی کی جان کو آ جاتا ہے۔ اسی لیے رات کے وقت ریڈیو پاکستان والے اعلان کرتے ہیں کہ اپنا

ریڈیو آہستہ بجائیے۔ جب ایک آدمی فساد برپا کر سکتا ہے تو پوری قوم کو جگانے کا نتیجہ آپ خود سوچ سکتے

ہیں اور قوم بھی کون سی پاکستانی قوم؟

انٹرویو رضیہ بٹ کا

کل کے اخبار میں اردو کی مشہور و مقبول ناول نگار محترمہ رضیہ بٹ کا ایک بیان چھپا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ سیاستداں انتقالِ اقدار کا مطالبہ نہ کریں۔ فرمایا تو اور بھی بہت کچھ ہے مثلاً یہ کہ قوم کو متحد رہنا چاہیے اور ملک میں اسلامی معاشرہ قائم ہونا چاہیے اور قرضی اچھی اچھی باتیں ہیں سب ہونی چاہئیں لیکن اس وقت اس سے بحث نہیں کہ انہوں نے کیا فرمایا ہے۔ خوشی کا مقام یہ ہے کہ ان سے بیان لیا گیا ہے۔ ہم رضیہ بٹ کے سے مشہور و مقبول نہ سہی پھر بھی ادیبوں شاعروں میں قدم رکھتے ہیں۔ لہذا امید رکھ سکتے ہیں کل ہم سے کوئی اخباری رہنما سندھ یہ پوچھنے آئے گا کہ جناب انشاء صاحب ذرا جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کا مسئلہ تو حل کر دیجئے۔

دیکھا جائے تو ملک کی سیاسی گتھیاں جس طرح ناول نگار اور فلم ساز لوگ سلجھا سکتے ہیں اور کوئی نہیں سلجھا سکتا۔ آپ نے دیکھا ہوگا ناولوں اور فلموں میں کتنی کتنی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ہیر و اب مرا کہ مرا۔ ہیر وین اب رقیب و سیاہ کے قبضے میں آئی کہ آئی۔ ولن بھری سبھا میں آکر کھنڈت ڈال دیتا ہے کہ شادی نہیں ہو سکتی۔ لیکن بالآخر یعنی ناول کے آخری دس صفحوں میں اور فلم کے آخری دس منٹ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ظالم سماج منہ کی کھاتا ہے۔ ہیر و نکاح کے چھوہارے لٹاتا ہے۔ یہ ہم محترمہ رضیہ بٹ کے ناولوں کی بات نہیں کر رہے نہ کسی فلم کی کیونکہ ہمیں معلوم ہے ان کے ناولوں پر بھی فلمیں بنی ہیں جن سے متاثر ہو کر بعض خاتون ناول نگاروں نے اور بھی ناول لکھے ہیں جو اس وقت فلم سازوں کے زیر غور ہیں۔ یہ ہم ایک بات کر رہے ہیں۔ ہم ایک خاتون ناول نگار کو جانتے ہیں کہ سوئی میں دھماکہ نہیں ڈال سکتیں لیکن ہیر و کو سندھ کی تہہ سے زندہ سلامت نکال لاتی ہیں اور پہاڑ سے گرا کر رقیب کی ہڈیوں کا اس طرح سرمہ بناتی ہیں کہ پڑھنے والا عیش عیش کرتا رہ جاتا ہے۔

پی پی آئی کا نمائندہ جس نے یہ بیان لیا، نکلا تو سیاستدانوں ہی کی تلاش میں تھا لیکن ان میں اکثر منقار زیر پر ہیں۔ بیان دینے سے پہلے چاروں طرف دیکھ لیتے ہیں۔ کیا عجب کہ یہ تو انتقال اقتدار کی مخالفت کریں اور انتقال اقتدار ہو جائے۔ اس سے کاروبار اور ٹھیکوں وغیرہ کے سلسلے میں جو چند در چند قباحتیں پیدا ہو سکتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ اب رہ گئے اسلام سلمانی صاحب بی اے اور ہم اور رضیہ بٹ صاحبہ سو ہم حاضر ہیں۔ ہم سے جو چاہے تو کم کی خدمت کرا لے، جو چاہے آکر سیاسی گتھیاں سلجھوائے۔

ہماری اطلاع کے مطابق رضیہ بٹ صاحبہ کا بیان لینے کے بعد پی پی آئی کا نمائندہ محترمہ کوثر پروین صاحبہ کے پاس بھی گیا تھا۔ کوثر پروین صاحبہ کو کون نہیں جانتا۔ ملک کے مشہور اخباروں اور رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ کیل مہا سے کیسے دور کئے جائیں اور قیمہ بھرے کر لیے پکانے کا طریقہ کیا ہے۔ کپڑوں پر آم و مراد اور چارسیا ہی کے دھبے پڑ جاتے ہیں ان کو چھڑانے کی ترکیبیں بھی یہ رفاه عام کے لیے اکثر چھپواتی رہتی ہیں۔ جب اس نمائندے نے ان سے پوچھا کہ کوثر پروین صاحبہ انتقال اقتدار پر کوئی بیان دیجئے، بیچ بیچ کرنے لگیں اور بولیں انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اقتدار صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ آپ لکھ دیجئے کہ ان کے انتقال سے قومی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے کوثر پروین صاحبہ کبھی ہیں وہ کبھی پر نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ بھنڈی گوشت میں بھگا رو لگا کر اور ایک پلیٹ میں دو شامی کباب نکال کر نیک بیچوں کی طرح دوپٹے سر پر اچھی طرح اوڑھ کر اخباری نمائندے کے پاس آ بیٹھیں۔ پی پی آئی کے نمائندے نے ان کو حوصلہ دلایا کہ اقتدار صاحب کوئی بھی ہوں ان کا انتقال نہیں ہوا۔ ہو بھی تو ایسی افسوس کی بات نہیں۔ کیونکہ مرنا جینا تو خدا کے اختیار میں ہے، میرا اشارہ کسی اور طرف تھا۔

آپ نے محترمہ تمیز فاطمہ سلنگی کا نام بھی سنا ہوگا۔ ان کا نام کس نے نہیں سنا۔ جو لوگ ریڈیو پاکستان اور ریڈیو سیلون کا فرمائشی پروگرام سنتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ فرمائشیں وہ اور ان کی بہنیں ہی بھیجتی ہیں۔ ان کا گھر کوثر پروین صاحبہ کے گھر کے پاس ہی ہے۔ جب پی پی آئی کا نمائندہ ان کے گھر پہنچا، سلنگی بہنیں ریڈیو پاکستان کا فرمائشی پروگرام سن کر فارغ ہوئی تھیں اور نئی فرمائشیں بھیجنے کے لیے فونٹین پن میں سیاہی بھر رہی تھیں۔ نمائندے نے اپنا تعارف کرایا کہ پی پی آئی سے آیا ہوں اور آپ کا نام سن کر آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ آپ کا بیان چاہیے کہ یورپ میں جو کرنسی کا کرائس ہو گیا ہے اس

کا کیا حل ہے۔ تمیز فاطمہ سلنگی نے اسٹوڈنٹس انکش اردو ڈکشنری نکال کر پہلے کرنسی اور کرائس کے معنی دیکھے۔ کرنسی کا مطلب سکہ تو ٹھیک لیکن کرائس کا مطلب بحران تھا۔ بحران کے معنی کے لیے انہیں نور اللغات دیکھنی پڑی صفحہ ۸۷ پر لکھا تھا بحران (بالضم، یونانی، مذکر، طب کی اصطلاح) بیماری کا زور کا دن۔ یاد رہے کہ سلنگی بہنیں سیون شریف کے ایک مشہور خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ تمیز فاطمہ کی بہن دبیز فاطمہ نے فوراً نسخوں کی خاندانی بیاض نکالی اور کہا ایک تو یہ بھگو کر مریض کے سر پر رکھا جائے اور اسے تخم لنگاں کا شربت پلایا جائے اور کھانے کو سوائے طباشیر کے کچھ نہ دیا جائے۔

یہ نمائندہ شربت بزوری کا ایک گلاس پی کر اور کئی فلموں کے گانے پر گفتگو کر کے وہاں سے اٹھ آیا اور اب ہم بنادیں کہ اس کے بعد ہمارے پاس آیا اور نہ ہم کو اوپر کی تفصیلات کیسے معلوم ہو سکتی تھیں۔ ہم سے بھی اس نے کرنسی کے کرائس کے بارے میں پوچھا اور پونڈ اور ڈالر اور مارک کی قیمتوں کی گفتگو شروع کی۔ ہم نے اسے بتایا کہ یورپ کو تو کرنسی کا کرائس اب لاحق ہوا ہے، ہم جب کبھی ولایت حمے ہمارے لئے کرنسی کا کرائس ہو گیا۔ چنانچہ ہمارے سفر نامہ میں جو جا بجا آلو مز کھانے اور سستے سستے ہوٹلوں میں جانے کا ذکر ملتا ہے، اس کی علت یہی ہے۔ چونکہ ہمارا ارادہ مستقبل قریب میں پھر باہر جانے کا ہے، لہذا ہم نے اس نمائندے سے کہا کہ بھیا پہلے ایک گڈی پونڈوں اور ڈالروں اور مارکوں کی لا کر ہمارے سامنے رکھ۔ تب ہم فیصلہ کریں گے۔ بغیر دیکھے کیسے فیصلہ کر دیں۔ اس نمائندے نے ہم سے انتقال اقتدار والا سوال بھی کیا۔ ہم نے کہا، ہمارا بیان چھاپ دیجے کہ اگر سارا اقتدار ہمیں منتقل کر دیا جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا بلکہ ہم رضا کارانہ طور پر اس بار کو اٹھانے کی پیش کش کرتے ہیں۔ اگر قوم کے مسائل نہ بھی حل ہو سکیں تو کم از کم اپنے تو حل کر ہی لیں گے۔

سپاسنامے بند مت کیجئے

ہمارے محترم جناب رسول بخش تالپور نے فرمایا ہے کہ یہ لے لے اور لچھے دار سپاسنامے پیش کرنے کی رسم اب ختم ہونی چاہیے۔ اس کی بجائے کام ہونا چاہیے۔ ہمیں میر صاحب کا یہ ارشاد پڑھ کر بہت تعجب ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ سپاسنامے پیش کرنے کو کام میں شمار نہیں کرتے۔ کل وہ فرمائیں گے وزیروں مشیروں کو ان کے تقرر پر جو مبارکباد کے پیغام دیئے جاتے ہیں یا اخبار میں چھپوائے جاتے ہیں وہ بھی کام میں داخل نہیں۔ آفیسروں اور حاکموں کے ہاں مٹھائی لے جانا بھی کام نہیں۔ ہار اور گجرے پہنانا بھی کام نہیں۔ حکومت کے قصیدے کہنا بھی کام نہیں۔ ہم بڑے ادب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ کام نہیں تو پھر کام کسے کہتے ہیں۔ ہمیں تو یہی کام آتا ہے۔ ہمیں تو یہی کام سکھایا گیا ہے اور اس کی روشنی میں ہم نے ایک زمانے میں یہ شعر کہا تھا

کام نے ہم کو نکما کر دیا در نہ ہم بھی آدمی تھے عشق کے

جس طرح سائنس علم دریاؤں ہے اور اس میں باؤں بکسورے لگتے ہیں، اسی طرح سپاسنامہ لکھنا بھی ایک فن ہے۔ پیارے یہ ہمیں سے ہو، ہر کارے دہر مردے۔ ہم نے بھی ایک مدت اس پر ریاض کیا ہے اور گاتے گاتے کلاؤنت ہوتے ہیں، تب یہ ہماری گرفت میں آیا ہے۔ اس کے لیے ہم نے استاد ذوق کے قصائد سے لے کر زمانہ حال کے سیاسی اور سماجی کارکنوں کے بیانات اور اخبارات کے اداروں اور تمبر کی اشتہاروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور خود بعض ماڈل سپاسنامے تیار کئے ہیں جو بار عایت نرخوں پر ہم سے طلب کئے جاسکتے ہیں۔ یہ سپاسنامے ہر موقع کی ضروریات کو کا حقہ پورا کرنے کے اہل ہیں اور ان کی تعریف میں ہمارے پاس رو سا اور دیگر زعماء کے شوقیلیٹ موجود ہیں۔

دفتر میں سپاسنامے پیش کرنے والے کی ذہانت اور فطانت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب سامنے والا افسر اور آنے والا افسر دونوں موجود ہوں۔ ایک طرف مصلحت دامن کھینچتی ہے اور دوسری طرف وضع داری عیاں گیر ہوتی ہے لیکن

شیر سید حاتیر تاج وقت رفتن آب میں

وہ ایک طرف تو جانے والے کو بدیہ عقیدت پیش کرتا ہے کہ خان صاحب بڑے مہربان اور بے عدیل افسر تھے۔ ان کی لیاقت کا آدمی اس زمانے میں چراغ لے کر ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ سارا عملہ ان پر جان چھڑکتا تھا اور ان کا خلا پورا ہونا ناممکن ہے۔ ازاں بعد کھنکار کر آنے والے افسر کی طرف توجہ کرتا ہے کہ حضور والا ہم آپ کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ امید ہے آپ کے آنے سے ہمارے دفتر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا اور اب تک صوبائی بنیاد پر جو بے انصافیاں اور خوشامد خوری کی وجہ سے جو دھاندلیاں ہوتی رہی ہیں آئندہ ان کا سد باب ہو جائیگا اور صرف مستحقین کو ترقی ملے گی۔ خاکسار جس کا نام سنیا رٹنی میں سب سے اوپر ہونے کے باوجود ترقی کے لیے اب تک نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس روز سعید کا خاص طور پر منتظر تھا، اسی سپاسنامے کا ایک دوسرا ماڈل ہے جو لوگوں نے پہلے صدر ایوب کے آنے پر استعمال کیا تھا اور پھر ان کے جانے اور صدر یحییٰ کے آنے پر۔ آج کل صدر یحییٰ کے جانے اور ہمارے عوامی اور ہر دلعزیز حکومت کے آنے پر جو سپاسنامہ جلسوں میں استعمال ہوتا ہے وہی ہے، ہماری ہی دکان کا مال ہے۔

میر صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ اگر قصیدے اور سپاسنامے کام کی تعریف سے نکل گئے تو کتنے لوگوں کے روزگار پر زد پڑے گی۔ ہم جیسے مضمون بنانے والے، کیونکہ ”جناب معلى القاب“ وغیرہ فصیح و بلیغ الفاظ لوگ نہیں لکھ سکتے اور ہم جیسے شاعر جو، تم سلامت رہو ہزار برس، ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار، کی دعا تو دے دیتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ کتنے سال ہو گئے۔ اتنے سال مدوح جیا تو کہاں سے کھائے گا۔ کتابت کرنے والے خوشنویس اور پھولدار کاغذ پر چھاپنے والے مطبعے اور ان کو شیشے میں اتارنے والے فریم ساز۔ جو پیش کرتا ہے۔ وہ شیر دانی بھی نئی سلاتا ہے، کم از کم ڈرائی کلین تو کراتا ہی ہے اور اس روز باربر سے شیو کر کے اور بالوں کی کھونٹیاں نکلوا کے اور چہرے پر رنگ گورا کرنے والی کریم لکوا کے آتا ہے۔ پس بالواسطہ طور درزی نائی دھوبی جو تاپالش کرنے والے اور عطر پھیلانے والے بھی زرد میں آجاتے ہیں۔ میر صاحب نے اپنے بیان کے عواقب پر غور نہیں کیا۔ امید ہے کہ اب نظر ثانی فرمائیں گے۔ سچ یہ کہ ہمیں تو امید تھی اب اس کا روبرو کفر و غرغ حاصل ہوگا۔ سپاسناموں کی صنعت ترقی کرے گی۔ سپاسنامہ ڈو پلپسٹ کارپوریشن بنے گی، جس میں نوکری کے لیے ہماری درخواست پر بھی غور کیا جائے گا

کیونکہ اب آپ سے کیا پردہ۔ اخباروں میں جتنے ایڈیٹوریل نکتہ چینی کے ہوتے ہیں وہ تو کوئی اور لکھتا ہے، لیکن مبارکباد کے سارے ادارے، سارے کالم سارے قطعات، ہمارے لکھے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان پر ہمارے دوست اپنے نام ڈال لیتے ہیں لیکن پہچاننے والے رنگ تحریر پہچان لیتے ہیں یہاں تک کہ حاجی فضل احمد کشمیر والا کی طرف سے جتنے اشتہار چھپتے ہیں ان میں عبارت ہماری ہوتی ہے انہوں نے ہمارے ہی ایماء پر جناب ذوالفقار علی بھٹو کو سید ذوالفقار علی بھٹو لکھنا شروع کیا ہے۔ یہ باتیں ہم تعلیٰ کے طور پر نہیں فقط اظہار حقیقت کیلئے لکھ رہے ہیں۔

پس جہاں میر صاحب نے اتنے سارے سپانسامے سنے ہیں ایک سپانسامہ ہمارا بھی ہے۔ وہ یہ کہ حضور معلیٰ القاب آپ جو نوشیروان زمان اور کیواں بارگاہ حسن میں یوسف اور طاقت میں رستم اور دادو دہش میں حاتم ہیں۔ ہماری سنیے اور جو جی چاہے بند کیجئے، سپانسامہ بند مت کیجئے ہمارے روزگار پر لات مت مارو۔ بچے مشرقی روایات سے روگردانی مت کیجئے۔ ورنہ ہمیں کچھ اور کرنا پڑے گا۔ شاید کام ہی کرنا پڑے۔ یعنی ایسا کام جسے آپ بھی کام گردانتے ہوں اور جس کی ہمیں عادت نہیں رہی۔

ٹیکس

اخباروں میں ایک تصویر چھپی ہے جس میں ایک سار کو اپنی دوکان کے بند دروازوں کے آگے پکڑے تلے دکھایا گیا ہے۔ ارد گرد لوگوں کا ہجوم ہے۔ کوئی کہتا ہے پاؤ بھرتول دو، کوئی کہتا ہے اٹھنی کے باندھ دو۔ سار بھی خوش خوش بیٹھا ہے۔ سونے پر ٹیکس لگنے سے اس کی تو چاندی ہو گئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ سار میاں کو سونے کا کام چھوڑ کر پکڑوں ہی کی کیوں سوچھی، اور بھی تو بہت سے کام بیچ میں پڑتے تھے۔ رنگت پکڑوں کی بھی سونے کی سی ہوتی ہے۔ یہ تو خیر ہوئی ایک مشابہت اصل اشتراک دونوں میں کھٹائی کا ہے۔ پکڑے بھی کھٹائی میں پڑتے ہیں تو مزہ دیتے ہیں اور سونے کا یہ ہے کہ کھٹائی میں پڑنے کا اردو محاورہ یہیں سے نکلا ہے۔ جب کوئی سار سے تقاضا کرتا ہے کہ میاں اسٹے دن لگا دیئے میرے کڑے نہیں بنائے تو اس کے پاس گھڑا گھڑا یا عذر موجود ہے، ”میاں جی کھٹائی میں پڑا ہے آپ کا سونا۔ ذرا میل اس کی کٹ جائے، بس ایک دن میں بنا دوں گا“

سار میاں تو خیر عادت سے مجبور ہیں۔ کھٹائی میں ڈالنے کو سونا نہیں تو کچھ سہی۔ پکڑے ہی سہی۔ لیکن سونے کے ساتھ ایک دنیا کا کاروبار کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ اخبار میں ایک شکایت آئی ہے کہ باجے والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ آج بازار میں نکاح خواں حضرات کا پروٹسٹ دیکھا اور ایک بیان پھوپھی خدا بخش نے بھی اپنی قوم کی طرف سے نکالا ہے کہ چھپے قربان جاؤں، یہ کیسا ٹیکس لگا دیا ہے۔ آپ کے بچے جیسیں۔ ہمارا تو روزگار ہی شادیوں سے بندھا ہے۔ وزیر خزانہ صاحب میں داری، یہ ٹیکس معاف کر دو اور جگ جگ جیو۔

دیکھا جائے تو مسئلہ صرف دولہا دلہن یا ان کے والدین کا نہیں۔ نہ فقط صرافوں اور ساروں کے کاروبار کا ہے۔ شادیانے بجانے والوں اور نکاح خوانوں سے بھی آگے کا ہے۔ سونے پر ٹیکس لگنے کا خیمہ اور دریاں، دیکیں اور دیکھیں اور پرچیں اور پیالے کرائے پر دینے والوں پر بہت اثر پڑا ہے۔ جس دن سے ٹیکس لگا ہے اور شادیوں کا مندا ہوا ہے، یہ لوگ اپنی دریوں پر چاند نیاں بچھا کر ان سے صف ماتم کا کام لے رہے ہیں۔ باورچیوں کو بھی اس ٹیکس کے اعلان سے مرچیں لگی ہیں تو ٹھیک لگی ہیں اور نائی

تو باراتوں کی جان ہوتے ہیں۔ اسلام سلمانی صاحب بی آئے کے لیے ایک اور موقع موشگافی کا اور بیان بلکہ پریس کانفرنس کا تیار ہے۔ ہمارے ہاں شادیوں میں اصل اہمیت زیورات کی ہوتی ہے یا جہیز کی۔ یہ کافی ہو تو دلہا کا گنج ہونا اور دلہن کا گنج بھی ہونا چل جاتا ہے۔ ان کی صورتوں پر، آدی کا بچہ ہے، کہہ کر درگزر کا پھارا پھیرا جاسکتا ہے۔ درزیوں کے بازار میں جائے تو وہ بھی چاک گریبان بیٹھے ہیں۔ اپنے ہی کپڑے ادھیر کر رہے ہیں۔ بزازے کا بھی یہی حال ہے گا کہوں کا کال ہے اور پورا بازار میدان پانی پتی کی طرح استعمال ہے۔ مہندی اور کھوپڑے گھسی اور موباف کا کاروبار بھی سر دہے بلکہ پورا بازار ایئر کنڈیشنڈ معلوم ہوتا ہے۔ رانجھا بھری، بجا بجا کر بے حال ہو رہا ہے۔ ہیر الگ، بیٹی رورہی ہے۔ اشکوں سے منہ دھو رہی ہے۔ یہی حال اپنی اپنی لیلیٰ اور مجنوں کا ہے۔ آج کل خالی خولی عشق سے کام نہیں چلتا۔ شہر میں بی بی بھی فرہاد میاں سے یہ نہیں پوچھتی کہ کتنے پہاڑ کاٹے۔ یہ سوال کرتی ہے کہ زیور تو لے کلائے ہو؟ ایک شاعر کو بھی ان دنوں میں دیکھا کہ اداس جا رہا ہے۔ پوچھا۔ اے میاں کس غم میں گرفتار ہے؟ غم جاناں ہے کہ غم روزگار ہے؟ بولا اے حضرت! کیا بود و باش پوچھو ہو ہماری۔ سہرے لکھتے تھے۔ انعام پاتے تھے۔ لن ترانیاں اس پر مستزاد کہ دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا۔ ایک اور خراب حال کو سرب گریبان پایا۔ اس نے اپنا نام ”جہاں جیج نال“ بتایا کہ باراتوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ جہاں خیمہ اور چھو لدا ری دیکھی، شیر وانی ڈانٹ کر جا پہنچے اور ترنوالے کھا کر

بیڑے کھائے پان کے مزے دار
قلیان پئے مشکبو دھواں دھار

خود ہم بھی اس ٹیکس سے متاثر ہوئے ہیں۔ ہماری آنے والی کتاب ہی کھنائی میں پڑ گئی ہے۔ اسے زیور طبع سے آراستہ کرتے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایک سائز والوں کا پیادہ نہ آن پڑے کہ لاؤ ٹیکس دو اس پر پچیس فیصدی۔

اس بجٹ نے صرف سنا کا سونا، لیلیٰ مجنوں کا عشق اور ہماری کتاب ہی کھنائی میں نہیں ڈالے۔ اس کے نتائج اس سے زیادہ دور رس ہیں۔ بنا ہستی گھی کے دام بھی پڑھے۔ جو لوگ ڈالڈا کھاتے تھے اب فقط ماتا سے کام چلائیں گے۔ ماتا میں چکنائی تو تھوڑی بہت ہوتی ہے لیکن دماغن ڈی اتنی نہیں ہوتی۔ جوتوں پر ٹیکس لگنے سے بہت سے لوگ پریشان ہیں۔ جن لوگوں نے بی اے یا ایم اے پاس کیا ہے، وہ پوچھتے ہیں کہ ہم نوکری کی تلاش میں سڑکوں پر کیا بچھاتے پھریں گے۔ سیاسی پارٹیوں کے ہاں بھی بے روٹی کا ٹل ہوگا۔ اول تو وال مہنگی ہے۔ سونے کے بھاؤ بکتی ہے۔ خیر فراہم کر لیں تو بانٹیں گے کس میں؟ اس ڈر سے بعض سیاسی گروہ اپنی صفوں میں اتحاد رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

صدارت

”جی فرمائیے“

”حضور میں ہوں گجراتی ادبی منزل کا سیکرٹری تار محمد دکھیا۔ ہم گجراتی کے مشہور ادیب حضرت غنیمت گھڑیا لوی کی بری منار ہے ہیں۔ آپ صدارت فرمائیے گا“

”دکھیا صاحب۔ ہم انکار کر کے آپ کو مزید دکھیا تو بنانا نہیں چاہتے لیکن گجراتی ہم نہیں جانتے اور غنیمت صاحب کا نام آج ہی سنا ہے۔“

”جی یہ کوئی بات نہیں ہے۔ آج کل بہترین صدارت وہی لوگ کرتے ہیں جو موضوع یا ممدوح کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہوں۔“

”عجیب بات ہے مثالیں دے کر واضح کیجئے تار محمد صاحب“

”آپ نے سنا ہوگا۔ پچھلے دنوں بروہی صاحب نے اقبال کی شاعری پر ایک نہایت پر مغز تقریر کی بعد ازاں فرمایا صاحبو۔ میں نارود جانتا ہوں نہ فارسی“

”لیکن ہر کوئی بروہی صاحب تو نہیں ہو سکتا کہ جس چیز کے متعلق جانتا نہ ہو اس پر نہایت جامع، مانع اور مدلل تقریر کرے۔“

”لیکن جی بیگم وقار النساء نون نے تو یوم اقبال اور نذر الاسلام کے مجموعی جلسے کی صدارت کر ڈالی اور بڑی دلپذیر تقریر کی۔“

”بھئی ہم انہیں جانتے نہیں۔ کیا پتہ وہ اردو فارسی اور بنگلہ وغیرہ کی فاضل ہوں۔“

”جی انہوں نے وضاحت کر دی کہ مجھے یہ زبانیں نہیں آتیں اور میں نے ان شاعروں کو پڑھا بھی نہیں لیکن اتنا معلوم ہوا کہ عمل کی تلقین کیا کرتے تھے۔ پس اسے حاضرین جلسہ تم بھی عمل کیا کرو۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مت بیٹھے رہا کرو۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا ہے اسلام علیکم۔“

”بھئی ہماری مصروفیات ہیں ہمیں معاف کر دو۔“

”آپ ناحق گھبراتے ہیں انشا صاحب۔ گھبرائیے نہیں۔ یوں تو آپ کو معلوم ہے، ایسے موقع پر کیا کہا جاتا ہے۔ کہیں آپ رکیں تو یہ بندہ لقمہ دیے کو تیار رہے یا تو میں آپ کے کان میں بتا دیا کروں گا۔“

آپ پانی پینے کے بہانے سن لیں یا پرچی لکھ کر بڑھادیا کروں گا۔۔۔

ہم نے کہا ”اچھا بھئی آپ مجبور کرتے ہیں تو منظور، ورنہ ہمارا اب بھی یہی خیال تھا کہ.....“

جناب نثار محمد دکھیانے ہمارے گلے میں گونے کا چکیلا ہار ڈالا۔ جو غالباً اس سے پہلے کئی صدروں کے گلے کا ہار ہو چکا تھا اور اس کے علاوہ مختلف مگنیوں اور شادیوں وغیرہ کے موقع پر بھی استعمال ہو چکا تھا۔ بعد ازاں ہمارا اور ہمارے علم و فضل کی بیکرانی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہر چند انشاء صاحب گہمراقی زبان نہیں جانتے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ غنغب صاحب کا کسی اور زبان میں ترجمہ نہیں ہوا تاہم وہ غنغب مرحوم کے انکار اور شاعری پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے باوجود بے پناہ مصروفیتوں کے تشریف لاکر ہماری عزت افزائی کی ہے۔ اب میں انشاء صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ خطبہ ارشاد فرمائیں۔ ہم نے پانی مانگا، سیکریزی صاحب نے ایک گلاس پانی آگے بڑھایا۔ ہم نے کہا کہ پورا جگ چاہیے۔ وہ بھی آگیا۔ ہم نے سیکریزی صاحب کو ان کا فرض یاد دلایا اور پانی پی کر یوں رطب اللسان ہوئے۔

”صاحبو۔ حضرت غنغب گھڑیا لوی کو کون نہیں جانتا۔ پاکستان کے لیے ان کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں (سیکریزی نے پرچی دی۔ ان کا انتقال تو ۱۹۱۴ء میں ہو گیا تھا) حالانکہ وہ پاکستان بننے یا پاکستان کا نظریہ پیش ہونے سے بہت پہلے ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں داد شجاعت دیتے ہوئے کام آگئے تھے۔ (سرگوشی! ان کا انتقال ملیر یا سے ہوا تھا، لڑائی میں نہیں) ہمارا مطلب ہے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے دنوں میں ایک جان لیوا بیماری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے جان جاں آفریں کو سپرد کی:

نشان مرد مومن باتو گویم

چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

ہم جب ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں (پرچی! شاعر نہیں ناول نگار تھے) جس کو غالب کی طرح وہ ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے اور ان کی ناولوں طویل فہرست پر نظر ڈالتے ہیں (پرچی! انہوں نے صرف ایک ناول لکھا تھا ”چو ہے دان“) جن میں سے صرف ایک چھپا باتی کتہم عدم سے ظہور میں نہ آئے یا آئے تو چوہوں نے کھالے، تو ان کی عظمت ہمارے دل پر نقش ہو جاتی ہے ان کے کمال فن کا اندازہ کرنا ہو تو ایک نظر ان کے ناول چو ہے دان پر ڈالنی کافی ہے۔

(پرچی! چو ہے دان نہیں چمنستان،،)

واقعی پرچی پر چمنستان ہی لکھا تھا۔ ہم جانے کیوں چو ہے دان پڑھ گئے تھے۔ بہر حال اب ہم نے پانی پی کر ان کے حالات زندگی کی طرف سے گریز کیا۔

”گھڑیالہ جس کی نسبت سے وہ گھڑیالوی کہلائے ایک مردم خیز قہر ہے (پھر پرچی آئی، گھڑیالہ کوئی قصبہ نہیں غنغب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے) یہ بات ایک مشہور نقاد نے ایک مضمون میں لکھی ہے اسے پڑھ کر ہمیں بڑی ہنسی آئی کیونکہ گھڑیالہ نام کا کوئی قصبہ گجرات میں نہیں۔ اصل میں غنغب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے۔ یہ ادبی تاریخیں لکھنے والے ذرا بھی تحقیق نہیں کرتے، جوائنٹ سنٹ چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر حضرت شیوا چوہڑ کا نوئی کے بارے میں بھی ذکر غزوہ رود و لوی نے لکھا دیا تھا کہ وہ چوہڑا کرتے تھے حالانکہ چوہڑ کا نہ ایک قصبہ ہے جہاں کا چار مشہور ہے۔ شیوا صاحب بڑے شیوا بیان شاعر تھے۔ میں آپ کو چند اشعار سناتا ہوں جو صنعت مراعات انظیر میں ہیں۔ زباں پہ خدا یا کس کا نام آیا۔ یہ نظیر اکبر آبادی بھی خوب شاعر تھے (پرچی :- یہ جملہ غنغب صاحب کا ہے نظیر اکبر آبادی کا نہیں) لیکن افسوس یہ یوم نظیر اکبر آبادی کا نہیں ورنہ ہم ان کی نظم بخارہ نامہ کے چند بند آپ کو سناتے بلکہ بیذہب انبلاوی کا ہے (سرگوشی :- صحیح نام غنغب گھڑیالوی ہے) جن کا صحیح نام غنغب گھڑیالوی تھا۔ پس ہم اس دعا کے ساتھ اپنی تقریر کو مختصر کرتے ہیں کہ خدائی پود کے ادویوں کو ان کی شاعری یا ناول نگاری جو کچھ بھی وہ کرتے تھے اس کی تقلید کی توفیق دے تاکہ وہ بھی اسی طرح آنکھیں کھول کر مظاہر قدرت کا مشاہدہ کریں جس طرح غنغب صاحب کرتے تھے اقبال صاحب بھی کہہ گئے:

کھول آنکھ فلک دیکھ زمین دیکھ فضا دیکھ

سیکرٹری صاحب نے پرچی دی ”غنغب صاحب تو نابینا تھے“ لیکن یہ بعد از وقت آئی تھی اس لیے ہم نے ایک طرف ڈال دیا اور پانی کا ایک گلاس پی کر تالیوں کی گونج میں بیٹھ گئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل اقبال کا صحیح مقام بھی انگریزی زبان ہی میں متعین کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کسی نہ کسی غیر ملکی کو بلایا جاتا ہے۔ اب کے ایک یوم اقبال تو ایرانی کلچرل سینٹر میں منایا گیا۔ ایک ہم نے اپنا علم دوست احباب کے ساتھ مل کر اپنے کلب میں منایا۔ ہمیں صدارت کے لیے کسی غیر ملکی کی تلاش تھی۔ خوش قسمتی سے کسی نے ہمیں ہالینڈ کے ایک نکتہ داں سٹریجک روٹروڈم سے ملادیا اور وہ صدارت پر بھی راضی ہو گئے ہم نے کہا۔ آپ کو کچھ اقبال کے متعلق بتا دیں! بولے ”واہ اس مایہ ناز ہستی کو کون نہیں جانتا، اس نے فلسفہ خودی ایجاد کیا تھا نا۔ بس یہ بتا دیں کہ رہنے والا کہاں کے تھے، ہم نے کہا ”سیالکوٹ جہاں کھیلوں کا سامان بنتا ہے، فرمایا ”مر گئے یا ابھی مرنا ہے، ہم نے کہا ”آپ کی اور ہماری خوشی قسمتی سے مر گئے ہیں، بولے ”کیوں مر گئے؟“

ہم نے کہا۔ ”ہم خود بھی حیران ہیں کہ ملت کو ابتلا میں چھوڑ کیوں مرے،“

ہم نے افسانہ نگاری کیوں ترک کی

آلڈس ہکسلے سے کسی نے پوچھا کہ ادیب بننے کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔ اس نے بے تامل جواب دیا کہ ایک قلم، ایک دوات اور کچھ کاغذ۔ ایک رسالے میں اردو کی مشہور افسانہ نگار جیلہ ہاشمی کا انٹرویو شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے وضاحت کر دی ہے کہ کچھ کاغذ سے کیا مراد ہے۔ فرماتی ہیں کہ جب میرا افسانہ لکھنے کو جی چاہا تو میں نے اپنے والد کے حساب کتاب کے رجسٹر کی جلد توڑی۔ اور اس میں لکھنا شروع کر دیا، قیاس ہوتا ہے کہ اگر ان کے والد حساب کتاب نہ رکھا کرتے، جیسا کہ بعض لوگ نہیں رکھتے، اور جیلہ کے ہاتھ نہ پڑتا تو افسانہ نگار نہ بن سکتیں۔ جو حضرات اپنی بہنوں بیٹیوں کو افسانہ نگار بنانا چاہتے ہیں، انہیں چاہیے کہ فوراً یہی کھاتے خریدیں اور جو اپنی نور نظر کو اس سے محفوظ رکھنا چاہیں انہیں لازم ہے کہ اپنے رجسٹروں کو دوکان پر تالے کے اندر رکھا کریں۔

لیکن ہمارا تجربہ اس کے برعکس ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہم نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا افسانہ نگار کے طور پر کی تھی اور اس کے لیے نہایت عمدہ چکنے کاغذوں کی ایک کاپی مجلہ تیار کرائی تھی۔ ایک روز ہم کاپی کو افسانے کے ایک نازک موڑ پر بستر پر کھلی چھوڑ گئے۔ واپس آ کر کھولا تو صورت احوال یوں نظر آئی: ”امجد نے کہا۔ میری رانی بولو تمہیں کیا چاہیے۔ کہو تو آسمان کے تارے توڑ کر تمہارے قدموں میں لا بچھاؤں۔ تمہارا دامن بہار کے رنگین پھولوں اور کلیوں سے بھر دوں۔ بولو بولو کیا چاہتی ہو،“ رانی نے کہا ”امجد مجھے دنیا میں اور کچھ مطلوب نہیں فقط

بنو لے ڈیڑھ من

بھوسہ دس بھوری

نمک ایک ڈلا

گڑ ڈھائی من

چار پائی کا بان پانچ گھنٹے

گھی سات سیر

ہم نے جھنجھلا کر وہ صفحہ پھاڑ کے پھینک دیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے چچا بیک کوناک کی پھینک پر جمائے کچھ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ بولے بیٹا یہاں ایک کاپی میں کچھ حساب لکھا تھا میں نے۔ منڈی جارہا ہوں سودا لانے۔ کہاں گئی وہ کم بخت کاپی۔

ہمارے نقطہ نظر سے یہ افسانہ بہترین افسانوں میں سے تھا۔ اس کا کلائمکس یعنی نقطہ عروج اس کے آخر میں آتا تھا۔ یہ وضاحت ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ بعض افسانوں کا کلائمکس بالکل شروع میں آ جاتا ہے۔ آخری پیرا لکھتے لکھتے ہمیں ایک ضرورت سے تھوڑی دیر کو باہر جانا ہوا۔ واپس آئے تو افسانہ مکمل تھا۔

”امجد نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ میری غلام فاطمہ۔ اب میں گاؤں واپس آ گیا ہوں اور زندگی تمہارے قدموں میں گزاروں گا۔ رانی نے مجھ سے دعا کی۔ اب مجھے سچی محبت کی قدر ہوئی۔ صبح کا بھولا شام کو واپس آ جائے تو اسے بھولا نہ جانو۔ مجھے معاف کر دو۔ غلام فاطمہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ امجد۔ اب میری زندگی میں رہ گیا ہے چند آنسو، چند آہیں اور.....

قمیضیں بڑی پانچ عدد

پا جاے چھوٹے چار عدد

تکیے کے خلاف دس

تولیے دو

جھانڑن دو

کھیس چار خانہ دو عدد

کل ۲۵

ہم نے شور مچایا۔ یہ کیا غضب کر دیا!

بہن بولیں۔ ارے میاں کچھ نہیں۔ دھوبی کا حساب لکھا ہے۔ اس سے پہلے مرقع چغتائی کے حاشیے پر لکھا کرتی تھی۔ وہاں اب جگہ نہیں رہی۔ یہ کاپی خالی نظر آئی اس میں لکھ دیا۔ ہم نے کہا بہن اب یہ کاپی تم ہی رکھو۔ ہمارے کام کی نہیں رہی۔ چنانچہ اس روز ہم نے افسانہ نگاری کو خیر باد کہی اور شعر کہنے لگے۔ جس کی بنیاد یہ ہے کہ شعر لکھنے کے لیے کسی کاپی اور رجز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں دروازے کی چوکھٹ پر لکھا جاسکتا ہے قمیض کے کفوں پر لکھا جاسکتا ہے۔ سکتا کیا معنی ہم لکھتے ہیں۔

جیلہ ہاشمی کے انٹرویو میں ایک اور جگہ ہمیں ٹھکنا پڑا۔ انہوں نے فرمایا ”میں تو چاہتی ہوں کہ زیادہ سے

زیادہ ناول لکھوں۔ لیکن یہ نوکر بہت تنگ کرتے ہیں، ہم نے اس کا مطلب یہ لیا کہ نوکر لکھنے سے منع کرتے ہیں کہ بی بی آپ ہانڈی روٹی کیجئے۔ یہ کیا لکھنے لکھانے کے پیچھے پڑ گئیں۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں جیلہ بیگم سے ہمدردی ہے۔ زیادہ تر نوکر آج کل ایسے ہی گستاخ اور منہ پھٹ بلتے ہیں۔ ہمارا ایک نوکر بھی ہمیں مشورہ دیا کرتا تھا کہ شاعری و ادبی چھوڑیے۔ بزاز کی دوکان کھول لیجئے۔ اس میں بڑا فائدہ ہے۔ لیکن پانچواں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ ایک زمانے میں ہمیں خوشی قسمتی سے ایک ایسا نوکر بھی مل گیا تھا، جو ناول نویسی میں خاصی مدد دیا کرتا تھا۔ ہم کوئی باب ادھورا چھوڑ کر کہیں باہر چلے جائیں تو واپسی تک مکمل ہوتا تھا بلکہ کئی بار تو وہ موجودگی میں پیش کش کر دیا کرتا تھا کہ صاحب آپ لکھتے لکھتے تھک گئے ہوں گے۔ اگر آپ میری جگہ تھوڑی دیر فرش پر پوچی ماردیں تو میں ایک آدھ باب لکھ دوں۔

آپ پوچھیں گے وہ نوکر کہاں گیا؟ اس نے ہماری نوکری چھوڑ دی اور آسمان ادب پر آفتاب عالمتاب بن کر چکا۔ آج کون ہے جس نے تسنیم رومانی کا نام نہیں سنا۔ وہی تسنیم رومانی جو ”لابی زلفیں اور ڈوبتے دریا، نامی لافانی ناولوں کا مصنف ہے۔ ابھی پچھلے دنوں بازار میں اس سے منڈ بھینڑ ہو گئی تھی۔ ہم نے کہا جن میاں (اس کا پیدائشی نام یہی ہے پولیس کے روزنامے میں بھی یونہی لکھا جاتا ہے) میرا نوکر بھاگ گیا ہے، تم چاہو تو پھر آ جاؤ۔ بولا صاحب آج کل تو ”جلتی پرچھائیاں“ نامی فلم بنا رہا ہوں۔ بہت اچھی جا رہی ہے۔ آپ چاہیں تو اگلی فلم کے گانے کے لیے آپ کو نوکر رکھ سکتا ہوں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ کا ہاتھ تنگ رہتا ہے۔ پیسے اس سے زیادہ دوں گا جتنے آپ مجھے دیتے تھے۔

عدالت کی بے بی نے چھی کر دی ہے

برطانیہ میں مسز موزیکا نام کی ایک صاحبہ حال ہی میں مجسٹریٹ مقرر ہوئی ہیں۔ آل اولاد والی ہیں ماشا اللہ چار بچے ہیں۔ اور خبر کے ساتھ جو تصویر چھپی ہے، اس میں وہ ایک طفلک کو جو تادم تحریر ان کا سب سے چھوٹا بچہ ہے، اپنی گود میں لیے بوتل سے دودھ پلائی دکھائی گئی ہیں۔

یہاں تک تو اس خبر میں کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن مسز موزیکا کے متعلق آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ وہ مقدمات سننے کے دوران اپنے گود کے بچے کے پوٹے اور دوسرے کپڑے بھی دھویا کریں گی۔ اس کے علاوہ ان کا فرمانا ہے کہ میں اپنے دوسرے بچوں کے لئے کھانا بھی عدالت ہی میں پکایا کروں گی۔

خاتون مجسٹریٹیں ہمارے ہاں بھی ہیں لیکن ہمارے ہاں یہ آزادی کہاں؟ کھانا پکانا اور پوٹے دھونا تو ایک طرف ہماری عدالتوں میں سروتے سے چھالیا کاٹنے اور سل پر سالہ پیسنے تک کی اجازت نہیں۔ حتیٰ کہ بچوں کو بھی گھر پر چھوڑ کر آنا پڑتا ہے۔

بہر حال اب جو برطانیہ میں اتنی مراعات ملی ہیں تو ہم جو ہر معاملے میں مہذب ملکوں کی تقلید کرتے ہیں، امید کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی عدالتوں کے قواعد و ضوابط کو نرم کر دیا جائے گا۔ تاکہ خاتون مجسٹریٹیں و لمبے سے مقدمہ بھی سنتی رہیں اور گھر کے دھندے بھی بھگتاتی رہیں۔ پھر یہ نہیں ہوگا کہ بظاہر مقدمہ سن رہی ہیں لیکن دھیان گھر میں لگا کہ کب مقدمہ ختم ہو، کب جا کر آنا گوندھیں اور بچوں کے کپڑے دھوئیں۔ یہ وقت ابھی کچھ دور نظر آتا ہے لیکن چشم تصور سے بھی دیکھا جاسکتا ہے بلکہ ہم دکھاتے ہیں آپ دیکھئے:-

ایک طرف فائلوں کا ڈھیر ہے اور دوسری طرف ایک چولہا جس پر دیکھی چڑھی ہے یہ آلو گوشت کی اشتہا افزا خوشبو میں سے آ رہی ہے۔

ایک نظر ادھر ملزم پر بھی ڈالئے۔ بیٹھا زار و قطار رو رہا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اپنے کئے پر پشیمان ہے بلکہ مجسٹریٹ صاحبہ نے حکم دیا ہے کہ جب تک خالی بیٹھے ہو کچھ پیاز ہی کتر دو۔

تو حضرات باادب بلا لحظہ ہوشیار، یہ بی بی نیک پروین محمودیٹ درجہ اول کی عدالت ہے۔ ایوان عدالت میں یہاں سے وہاں تک رسیاں تتی ہیں جن پر بچے بچوں کے کرتے، نیکریں، بے، اور پوترے سوکھ رہے ہیں۔ کوئی کپڑا ٹھیک سے نہیں نچوڑا جاسکا تو اس سے پانی کے قطرے بھی ٹپک رہے ہیں۔ لہذا مدعی اور مدعا علیہ دونوں فریقوں کے آدمی سٹے سٹائے بیٹھے ہیں، خصوصاً وہ جو نمازی ہیں۔ اگرچہ اسی ابھی ابھی فٹائل کا چھڑکاؤ کر کے گیا ہے اور ایک طرف اگر بتیاں بھی سلگ رہی ہیں، پھر بھی گواہوں کے کنبہ کے پاس کچھ لوگ ناکوں پر رد مال رکھے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ پوترے آخر پوترے ہیں۔ خواہ محمودیٹ کے بچوں ہی کے کیوں نہ ہوں۔ کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتا تو بین عدالت نہ ہو جائے۔

اب ڈاکس کی طرف نظر کیجئے۔ ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ یہی تو بی بی نیک پروین ہیں۔ ادھر داہنے ہاتھ جو صاحب بیٹھے حق پل رہے ہیں اور توام والا پان کلمے میں دبائے ہیں وہ بچے کے باپ نہیں ہیں۔ بلکہ پیش کار صاحب ہیں۔ ان کی میز پر دیکھیے۔ بائیں ہاتھ پر ایک اسٹول پر ایلو میٹم کا ایک تسلا اور پانی کی بالٹی نظر آرہی ہے۔ تسلے میں بچوں کے کپڑے بھیکے ہوئے ہیں۔ ابھی استغاثے کا بیان ختم ہوگا تو انہیں دھونیں گی اور مقدمے کے فریقین رسیوں پر پھیلاتے جائیں گے تاکہ کاروائی جلد از جلد دوبارہ شروع کی جاسکے۔ محمودیٹ صاحبہ کی اپنی میز پر عدالت کی گھنٹی اور موگری کے علاوہ ایک نامکمل سویٹر، اون کے گولے اور سلاخیاں بھی نظر آرہی ہیں جب بچہ سو جائے گا تو اسے سرکاری وکیل کی گود میں دے کر انہیں اٹھالیں گی۔ چونکہ ہوشیار اور فرض شناس ہیں اس لیے سویز بننے کے ساتھ ساتھ مقدمہ بھی سستی جائیں گی اور منصفی کرتی جائیں گی۔

اب تو شاید یہ غصہ ناپید ہے لیکن انگریزوں کے عہد عدالت میں آزیری محمودیٹ ہوا کرتے تھے جن کو کم پڑھے لکھے لوگ اناڑی محمودیٹ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ قانون وغیرہ کی رسمی تعلیم کے جھنجھو میں یہ کم پڑتے تھے۔ بس عقل کے زور سے فیصلے کرتے اور شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلاتے تھے۔ انبالے میں میر حامد علی نام کے ایک بزرگ سے ہماری بھی یاد اللہ تھی جو اس عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک روز ان کے سامنے ایک مقدمہ آیا جس میں ایک شخص نے دوسرے کو سر بازار زد و کوب کیا تھا اور ضربات شدید پہنچائی تھیں۔ ملزم سے پوچھا گیا تو اس نے اقبال جرم سے انکار کر دیا۔ میر صاحب کو بہت کوٹیش آیا۔ بولے نابکار ایک تو مارتا ہے پھر جھوٹ بولتا ہے جس وقت ارتکاب جرم ہو رہا تھا عدالت خود وہاں کھڑی سبزی خرید رہی تھی۔

سو بی بی نیک پروین کی عدالت میں بھی یہ ہوگا کہ وہ پیش کار سے فرمائیں گی۔ منشی جی ڈراما رکیٹ والے

مقدمے کے فائل اور بچے کی چوکنی دینا اور دیکھنا ذرا دلچسپی میں کڑچھی پھیرتے جانا۔ میں ذرا فریقین سے حلف لے لوں تو پھر بگھار لگاؤں گی۔ بحث زور شور سے جاری ہوگی کہ یکا یک صدر عدالت سے اعلان ہوگا ”صاحبان کا کاروائی پانچ منٹ کے لئے ملتوی۔ عدالت کی بے بی نے تجھی کردی ہے عدالت اس کے اور اپنے کپڑے بدل کر ابھی آتی ہے،“ پھر جب وکیل استغاثہ طویل بحث کے بعد ملزم کے جرم کو پایہ ثبوت کو پہنچا کر عدالت سے درخواست کرے گا کہ اب مجرم کے لیے عبرتناک سزاجوز کی جائے تو مجسٹریٹ صلابہ یہ کہتی سنائی دیں گی ”اسے آگ پر چڑھا دو اور دھیمی آنچ پر بھونو“۔ ملزم کانپنے لگتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے ”حضور اتنی سخت سزا نہ دیجیے۔ میں بھی بال بچے والا ہوں،، اس پر عدالت مآب ڈانٹتی ہیں ”چپ رہو جی تم سے نہیں کہہ رہی ہوں۔ پیش کار سے کہہ رہی ہوں“۔ ہاں نشی جی اب قیے کی ہنڈیا آگ پر چڑھا دیجئے نا۔ اچھا تو وکیل صاحب آپ کیا فرما رہے تھے۔ میرا دھیان ادھر تھا۔ ذرا یہ گراپ واٹر کی بوتل تمہا دیجئے۔ اور اپنے دلائل ذرا دہرا دیجئے پلیز،،۔

عدالت ختم ہوئی تو بی بی نیک پروین نے برقعہ سنبھالا اور چل دیں۔ بچے کو سرکاری وکیل نے کاندھے پر بٹھایا اور دیگیچیاں پیش کار صاحب نے ایک نوکرے میں سنبھالیں۔ انصاف کے تقاضے بھی پورے ہو گئے اور گھر کا کام بھی ہو گیا۔ ہمارے نامہ نگار نے لپک کر پوچھا کہ ”بی بی جی آپ کیا سارے کام عدالت میں کر لیتی ہیں،،۔ بولی جی نہیں یہاں پر تو صرف پکانا رہندھا ہو سکتا ہے یا کپڑے دھوئے جاسکتے ہیں۔ جھازو دینے کا کام گھر جا کر کرتی ہوں۔ وہ عدالت میں نہیں کر سکتی۔ نہ رضائیوں میں ڈورے ڈالنے کے لیے یہاں کافی جگہ ہے۔

کسٹم کا مشاعرہ

کراچی میں کسٹم والوں کا مشاعرہ ہوا تو شاعر لوگ آدھ بھگت کے عادی، دندنا تے، پان کھاتے، موٹھوں پر تاؤ دیتے، زلف جانان کی بلائیں لیتے غزلوں کے پتے بغل میں مار کر پہنچ گئے۔ ان میں سے اکثر کلاتھ ملوں کے مشاعروں کے عادی تھے۔ جہاں آپ تھان بھر کی غزل بھی پڑھ دیں اور اس کے گز گز پر مکرر مکرر کی مہر لگا دیں تب بھی کوئی نہیں روکتا۔ پھر تانا بانا کزور بھی ہو تو ذرا سا ترنم کا کلف لگا نے سے عیب چھپ جاتا ہے۔ لیکن کسٹم والوں کے قاعدے قانون بڑے کڑے ہوتے ہیں۔ منظمین نے طے کر دیا تھا کہ ہر شاعر زیادہ سے زیادہ ایک غزل وہ بھی لمبی بحر کی نہیں، درمیانہ بحر کی بلا کسٹم محصول پڑھ سکے گا۔ جس کا حجم پانچ سات شعر سے زیادہ نہ ہو۔ بیچ یہ آن پڑا کہ مصرع ایک نہیں پانچ دیئے گئے تھے۔ وہاں دروازے پر تلاشی ہو گئی۔ سب کے تھیلے اور بستے باہر رکھوائے گئے۔ ایک صاحب نے نیفے میں ایک لمبی سی مثنوی اڑس رکھی تھی۔ ایک اپنے نموزوں میں رابعیاں چھپا کر لے جا رہے تھے۔ لیکن کسٹم کے پریوینڈ افسروں کی تیز نظروں سے کہاں بچ سکتے تھے۔ ان فرض شناسوں نے سب کو آنکا اور سب کے گریبانوں میں جھانکا۔ استاد ہدم ڈا بیوئی پر بھی انہیں شک ہوا۔ استاد نے ہر چند کہا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی پانچ سات شعر ہیں لیکن کسٹم والوں نے ان کے کرتے کی لانی آستین میں سے ان کے تازہ ترین دیوان مارا آستین کا ایک نسخہ برآمد کر ہی لیا۔ اتنی احتیاطوں کے باوجود سنا ہے بہت سے لوگ اپنا کلام ناجائز طور پر حافظے میں رکھ کر اندر گھس گئے اور موقع پا کر بلیک میں داد کھری کی۔ یعنی بلا سامعین کی فرمائش کے اسے دوبارہ سے بارہ پڑھا۔

ہمارے کرم فرما ملک اشعر اگھڑیاں فیروز آبادی نے ہمیں فون کیا، تم بھی آٹھوں گانٹھ شاعر ہو۔ موقع اچھا ہے۔ ایک غزل کہہ لو۔ گھڑیاں صاحب فقر گو شاعر اور گھڑیوں کے تاجر ہیں۔ فیروز آبادی اس نسبت سے کہلاتے ہیں کہ فیروز آباد تھا نے میں حوالا ت میں کچھ روز رہ چکے ہیں۔ ہم نے غذر کیا کہ ہمارے پاس شعر کہنے کے لئے کسٹم والوں کا پر مٹ یا مشاعرے کا دعوت نامہ نہیں۔ لہذا مجبوری

ہے۔ بولے:- اس کی فکر نہ کرو میں تمہیں کسی طور اس گل کر دوں گا۔ ہم نے کہا۔ ہم کوئی گھڑی تھوڑی سی ہیں۔ منقض ہو کر بولے:- یہ کیا تک تک لگا رکھی ہے۔ غزل لکھو۔

ہم نے اپنے کو شاعری کی چابی سے کوکتے ہوئے پوچھا۔ مصرع طرح کیا ہے؟ فرمایا:- ایک نہیں پانچ ہیں۔ ایک تو یہی ہے:

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

ہم نے کہا: اس کا قافیہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ ہونے تک۔ کونے تک۔ بولنے تک۔ کیا زرعی مضامین باندھنے ہیں اس میں؟

گھڑیاں صاحب نے وضاحت کی کہ نہیں، اس کے قوانین ہیں سر۔ خر۔ شر وغیرہ۔ ہمیں اس مصرعے سے کچھ شر کی ہوا آئی۔ لہذا ہم نے کہا کوئی دوسرا مصرع بتائیے۔ یہ نظیر اکبر آبادی کا تھا۔

طور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم

یہ بھی ہمیں نہ چا۔ ہم نے کہا، اگر اس کے قافیے ہیں:- سن کے۔ دھن کے۔ بن کے وغیرہ تو اس سے ہمیں معاف رکھئے۔

اس پر گھڑیاں صاحب نے ہمیں تیسرا مصرع دیا۔

ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

یہ کس کا مصرع ہے؟ ہم نے دریافت کیا۔

جواب ملا:- مہمل دہلوی کا۔

”مہمل دہلوی؟ یہ کون صاحب تھے؟“ ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔ پتہ چلا کہ سننے میں ہم

سے غلطی ہوئی۔ گھڑیاں صاحب نے مومن دہلوی کہا تھا۔ چوتھا اور پانچواں مصرع طرح بھی ہماری طبع

رواں کو پسند نہ آئے۔ پھر ہماری صلاح کل طبیعت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ایک مصرع لیں اور باقیوں کو چھوڑ دیں۔

بڑی ترکیب سے ایک غزل تیار کی جو بیک وقت ان پانچوں بحر و اور پانچوں زمینوں میں تھی۔ یوں کہ

ایک مصرع ایک بحر میں، دوسرا دوسری میں۔ ہمارا خیال تھا اس سے سبھی خوش ہوں گے۔ لیکن کوئی بھی نہ

ہوا۔ جانے مس بلبل کیسے نبھالیتی ہیں اور اس شاعر کا کیا تجربہ ہے جس نے اقبال کے کلام میں قلم لگا کر یہ

شاہکار تخلیق کیا ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تقدیریں نہ تدبیریں

جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اہا جی زنجیریں زنجیریں زنجیریں

لئے آنکھوں میں سرور۔ کیسے بیٹھے ہیں حضور

جیسے جانتے نہیں۔ پہچانتے نہیں

بعض محکمے شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں بعض کم۔ ایک ساز یعنی آبکاری کی فضا شاعری کے لئے زیادہ موزوں معلوم نہیں ہوتی۔ ہمارے دوست میاں مولانا بخش ساقی ٹکوری، پہلے اسی محکمے میں تھے۔ ایک روز کہیں ان کا ساقی نامہ کسی رسالے میں چھپا ہوا ان کے ڈائریکٹر صاحب نے دیکھ لیا۔ فوراً بلایا اور جواب طلب کیا کہ آپ سارے محکمہ کے کام پر پانی پھیر رہے ہیں۔ حکومت اتنا روپیہ ناجائز شراب کی روک تھام پر خرچ کرتی ہے اور آپ کھلم کھلا لکھتے ہیں۔

خدا را ساقی مجھے شراب خانہ ساز دے

یا نوکری چھوڑ دیجئے یا شاعری چھوڑیئے۔ شاعری تو چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ نوکری چھوڑ کر جوتوں کی دکان کر لی۔

کشم والوں کے مصرع ہائے طرح برے نہیں لیکن ہماری سفارش ہے کہ آئندہ کوئی محکمہ مشاعرہ کرائے تو مصرع طرح کو اپنے کام کی مناسبت سے رکھے۔ مثلاً کشم کے مشاعرے کے لئے یہ مصرع زیادہ موزوں رہے گا۔

داور حشر مرا نامہ اعمال نہ دیکھ

جج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

جیتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا۔ وغیرہ

اگلے بختے گوردھن داس کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے والوں کی طرف سے جو مشاعرہ ہو رہا ہے اس کے لئے ہم یہ مصرعے تجویز کریں گے۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب

یا اپنا گرہیاں چاک، یاد امن بڑاں چاک

اند کفن کے سر ہے تو باہر کفن کے پاؤں

دھوبی۔ ڈرائی کلیئر۔ ٹیلر ماسٹر حضرات مشاعرہ کرائیں تو ان کے حسب مطلب بھی اساتذہ

بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ منجملہ

دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند بکا دیکھ

موثر ذرا نیو حضرات تو اپنے بس ٹرک کی باڑی پر لکھا ہوا کوئی مصرع بھی چن سکتے ہیں۔ جیسے
سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے!

نے ہاتھ باگ پر ہے، نے پا ہے رکاب میں

سب سے زیادہ آسانی گورکھوں کے لئے ہے کیونکہ اردو شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ
کفن، دفن، گورکھی اور مردہ شوکی کے متعلق ہے۔ ہماری شاعری میں مردے بولتے ہیں اور کفن پھاڑ کر
بولتے ہیں۔ بعض تو منکر نکیر تک سے کٹ جاتی کرتے ہیں۔

چھیڑو نہ بیٹھی نیند میں اے منکر و نکیر

سونے دو بھائی میں تھکا ماندہ ہوں راہ کا

اسی طرح ہمارے شاعروں نے بہت کچھ حکیموں، ڈاکٹروں اور عطائیوں کے بارے میں کہہ رکھا ہے۔ کل
کلاں میڈیکل ایسوسی ایشن یا طبی کانفرنس والے یا جڑی بوٹی سنیا سی ٹونیکا ایسوسی ایشن کے سیکرٹری
سائیں اکسیر بخش مشاعرہ کرائیں تو حسب ذیل تیر بہدف مصرعے کام میں لاسکتے ہیں۔

یا الہی مت نہ جائے درد دل

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال

اور مر بیض عشق پر رحمت خدا کی۔ وغیرہ

فیملی پلاننگ کے محکمے نے پچھلے دنوں ڈھیروں نظمیں لکھوائی ہیں جن میں بعض میں ایسی تاثیر
سنی ہے کہ کسی جوڑے کو پانی میں گھول کر پلا دیں تو نہ صرف ان کو بقیہ عمر کے لئے چھٹی ہو جائے بلکہ ان کی
اگلی پچھلی سات نسلیں بھی لا ولد ہو جائیں۔ ہمارے محکمہ زراعت، محکمہ جنگلات، آبپاشی اور میلہ مویشیاں
والے بھی ان کی دیکھا دیکھی شاعری کے فروغ میں پیش از پیش سرگرم نظر آتے ہیں۔ ابھی کل ہی محکمہ
زراعت اور آبپاشی نے ہمیں ذیل کے مصرعے بھیجے ہیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی
 کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہ رہی ہے گنگا
 تو برائے فصل کردن آمدی
 جنگلات والوں کی پسند ملاحظہ ہو۔

پتہ پتہ بونا بونا حال ہمارا جانے ہے
 کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں
 مجنوں جو مر گیا ہے تو صحرا اداس ہے
 ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
 ایک مشاعرہ ہم ملتان کے چڑیا گھر میں پڑھ چکے ہیں۔ جس کی طرحیں حسب ذیل تھیں:-

لاکھ طوطے کو پڑھایا پردہ حیواں ہی رہا

کیا ہی کنڈل مار کر بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا

رگ گل سے لبلب کے پر باندھتے ہیں

بھکے ہو گئے۔ اب اہل حرفہ کی بھی تو ضرورتیں ہیں۔ کرپا نہ فروشوں کی عید ملن پارٹی ہونے

والی ہے، اس کے لئے بھی مصرع طرح تجویز کر دیں۔

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

بار ایسوی ایشن کے سالانہ مشاعرے کے لئے:-

اب جو خط آنے لگا، شاید کہ خط آنے لگا

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے گیا؟

ہا کر فیڈریشن والوں نے بھی ہم سے مصرع مانگا تھا۔ ایک نہیں دو حاضر ہیں۔

میں دل بیچتا ہوں، میں جاں بیچتا ہوں۔ اور

بیٹھے ہیں راہگزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

ایک مصرع جوتے والوں کی نظر ہے:-

پاپوش میں لگا دی کرن آفتاب کی

وکیل اس مصرع سے کام چلا سکتے ہیں

مدی لاکھ برا چاہے پہ کیا ہوتا ہے

اور قصاب حضرات کے لئے ہم نے

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلچر نکال کے

ایک زمانے میں ہماری شاعری نے بادشاہوں اور نوبوانوں کی سرپرستی میں ترقی کی۔ ایک مشہور شاعر فرخی کو تو بادشاہ وقت نے خوش ہو کر مویشیوں کا ایک گلدانعام میں دے دیا تھا۔ اس نے غالباً غزل گوئی چھوڑ چھاڑ دو دھ بیچنے کا پیشہ اختیار کر لیا کیونکہ پھر اس کے خاندان میں کوئی شاعر ہم نے نہ سنا۔ ہمارے زمانے میں دارقند والے، محکمہ زراعت والے، سیلہ مویشیاں والے اس فن کے فروغ کا ذریعہ ہیں۔ پھر کلاتھ ملوں والوں نے اس نیم جان کا پردہ ڈھکا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انکم ٹیکس اور کشم والے بھی شاعری کی سرپرستی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ ہمارے ایک دوست پولیس میں ہیں۔ انہوں نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ وہ بھی اپنا دھوم دھامی مشاعرہ کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ اس میں خرچ بہت پڑتا ہے۔ یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔ ہمارا پٹے والا جہاں طلب نامہ لے کر پہنچا، شاعر اپنے خرچ پر رکشہ میں بیٹھ بھاگا آئے گا۔ کھانا اسے سامنے کے تندور والے مفت کھلائیں گے اور شب ب سری کے لئے جگہ ہماری حوالات میں بہت ہے۔ البتہ سنا ہے مشاعرے میں ہونگ و غیرہ کرتے ہیں لوگ۔ ہم نے کہا۔ ہاں کرتے تو ہیں۔

بولے۔ اچھا۔ پھر تو آنسو گیس کا بھی انتظام رکھنا ہو گا۔ آپ آئیں گے مشاعرے میں یا

بھیجوں لال چمڑی والے کو تھکڑی دے کر؟

خطبہ صدارت حضرت ابن انشا

بچھلے دنوں ایک کتاب چھپی ہے۔ ”چلتے ہو تو چین کو چلے“ اس کے فاضل مصنف کا کیا عمدہ قول ہے کہ انسان کی صحیح قدر اس کے وطن سے باہر ہی ہوتی ہے جہاں اس کی اصلیت جاننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سفرو سیلہ النظفر کا مطلب بھی شاید یہی ہے۔ ان صاحب کا جب چین میں تعارف کرایا گیا کہ یہ اپنے ملک کے نامی گرامی ناول نویس ہیں اور فسانہ آزاد، گودان، آگ کا دریا، خدا کی بستی اور آنگن وغیرہ انہی کی تصانیف ہیں تو یہ ہر چند کہ ناول لکھنا تو برکنار ناول پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے فرط عجز و انکسار سے دوہرے ہو گئے۔ کسی بات کی تردید کرنا خلاف آداب جانا۔ ایک اور صاحب کسی کاروبار کے سلسلے میں کسی باہر کے ملک میں گئے اور ملک اشعرا ہو کر واپس آئے۔ آقائے حاجی بابا اصفہانی بھی اصفہان آنا خلاف مصلحت جانتے تھے۔ استنبول میں تو یہ ایک رئیس کے داماد ہو کر کھٹا دکھاتے تھے لیکن وطن آتے تھے تو پرانے گا کت بجائے سر آنکھوں پر بٹھانے کے یہی فرمائش کرتے تھے کہ خلیفہ ذرا میرا سر تو موٹو دجھو اور ہاں داڑھی بھی تراش دجھو۔ اللہ بخشے تمہارے باپ کا سا خط بنانے والا اب سارے اصفہان میں کوئی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ استنبول کی آب و ہوا کی تعریف کیا کرتے تھے اور جب تک زندہ رہے وہیں قیام کرنا پسند کیا۔

مقصود اس قصہ کا یہ کہ ہمارے اپنے ہی شہر اور اپنے ہی پرانے کالج میں مہمان خصوصی بن کر آنا ایک طرح کی سنگین غلطی بلکہ غلط کاری ثابت ہوتا لیکن ہم نے اطمینان کر لیا ہے کہ ہمارے اس زمانے کے اساتذہ میں سے کوئی کالج میں بچا ہے تو مرمت کے مارے ہماری کسی بات پر یہ نہ کہے گا کہ ہماری ملی ہمیں کو میاؤں۔

صاحبزادے تو ہم آجیں بھر بھر کر اپنے ماضی کی عظمت کی جو داستانیں چاہیں بیان کریں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس درس گاہ کے برآمدوں میں دو برس جوتیاں چمٹاتے ہوئے ہم نے نہ کچھ کھویا، سوائے عزت سادات کے۔ اور نہ کچھ پایا سوائے ڈگری کے۔ ہماری کلاں ایک طرح سے

تعلیم بالغاں کی کلاسیں تھیں۔ ہمارے اساتذہ نے ہمارا عیب و ثواب اور نفع نقصان ہمیں پر جھوڑ رکھا تھا کیونکہ ہمارے ہم سبقوں میں ایک دو توشاندہ صاحب اولاد بھی تھے۔

ان اساتذہ کے علم و فضل میں کلام نہیں لیکن ان کا فیض صحبت ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ ہم جیسے چھلے چھلائے اور دھلے دھلائے آئے تھے ویسے ہی واپس گئے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم قطب بنے اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تھے اور ہمارا ستارہ گردش میں رہا کرتا تھا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم خود گردش میں رہنے لگے اور ہمارا ستارہ کراچی میں بیٹھے بیٹھے آب و تاب سے چمکنا شروع ہوا۔ پھر اخبار جنگ میں آج کا شاعر کے عنوان سے ہماری تصویر اور حالات چھپے۔ چونکہ حالات ہمارے کم تھے لہذا ان لوگوں کو تصویر بڑی کرا کے چھاپنی پڑی اور قبول صورت، سلیقہ شعار، پابند صوم صلوة اولادوں کے والدین نے ہماری نوکری، تنخواہ اور چال چلن کے متعلق معلومات جمع کرنی شروع کر دیں۔ یوں عیب بینوں اور نکتہ چینوں سے بھی دنیا خالی نہیں۔ کسی نے کہا یہ شاعر تو ہے لیکن آج کے نہیں۔ کوئی بے درد بولا۔ یہ آج کے تو ہیں لیکن شاعر نہیں۔ ہم بد دل ہو کر اپنے عزیز دوست جمیل الدین عالی کے پاس گئے۔ انہوں نے ہماری ڈھارس بندھائی اور کہا دل میل امت کرو۔ یہ دونوں فریق غلطی پر ہیں ہم تو نہ تمہیں شاعر جانتے ہیں، نہ آج کا مانتے ہیں۔ ہم نے کسمسا کر کہا۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ بولے میں جھوٹ نہیں کہتا اور یہ رائے میری تھوڑی سی ہے سبھی سمجھدار لوگوں کی ہے۔

ابن انشا نام ہم نے نہ جانے کب رکھا تھا اور کیوں رکھا تھا۔ کیوں رکھا تھا کی توجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے اصلی نام میں ایک چوپائے کا نام شامل ہے۔ نیا نام رکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگ سید انشاء اللہ خاں انشا کی ریایت سے ہمیں بھی سید لکھنے لگے یعنی گھر بیٹھے ہماری ترقی ہو گئی۔ اسی نسبت سے دلی والوں نے ہمیں اپنا ہم وطن جان کر ہماری زبان پر کم اعتراض کئے اور ولی مرکنفائل ہاؤسنگ سوسائٹی والوں نے ایک پرفضا پلاٹ کی ہمیں پیش کش کی۔ لکھنؤ والوں نے البتہ ہماری زبان کے نقائص کے لئے اسی کو بہانا بنا لیا کہ ہاں دلی والے ایسی ہی زبان لکھا کرتے ہیں۔ پھر ایک روز ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے آکر ہمارا ہاتھ ادب سے چوما اور کہا۔ واللہ آپ تو چھپے رسم نکلے۔ آپ کا کلام پڑھا اور جی خوش ہوا۔ ہم نے انکسار برتا کہ ہاں کچھ ٹوٹا پھوٹا کہہ لیتے ہیں۔ آپ نے کون سی غزل دیکھی ہماری۔ حافظے پر زور ڈال کر بولے کچھ اس قسم کی ہے، کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں، ہم نے کہا۔ کہاں

پڑھی ہے۔ بولے۔ مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات میں منقول ہے۔

جنگ میں ”آج کا شاعر“ کے ضمن میں خواتین کے بھیجے ہوئے پسندیدہ اشعار بھی چھپا کرتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحبہ نے ہمیں فون کیا کہ ذرا چیک کر کے بتائیے یہ سارے اشعار آپ کے ہیں؟ بعض اوقات بی بیوں مختلف شاعروں کے اشعار کو خط ملط بھی کر دیتی ہیں۔ ہم نے کہا سنائیے۔ ان میں بھی پہلا شعر جو کوئی دس خواتین کی پسند تھا یہی تھا۔ کرباندھے ہوئے..... یہ غزل ہمیں ہمیشہ سے پسند رہی ہے لہذا ہم نے ایڈیٹر صاحبہ سے کہا کہ کسی کا دل توڑنے کی ضرورت نہیں اگر کسی کو ہمارا یہی شعر پسند ہے تو خیر چھاپ دیجئے۔ دوسرا شعر بھی اسی غزل کا تھا۔

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے۔ انشا
غیبت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں
ہم نے کھنکار کر کہا خیر یہ بھی ٹھیک ہے۔ آگے چلئے۔ اس سے آگے شعر تھا۔
یاد آتا ہے وہ حرفوں کا اٹھا تا اب تک
جیم کے پیٹ میں اک نقطہ ہے سو خالی ہے
ہم نے کہا۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ یہ شعر ہمارا ہو۔ مشتبہ بات ہے۔ اسے کاٹ دیجئے اس کے بعد نوبت
ان شعروں پر پہنچی۔

کہیں بچھڑا ہوا دیکھا جو اک سر خاب کا جوڑا
تو ڈھاریں مار کر رویا بٹ گرداب کا جوڑا

گلی غلیل سے ابرو کی دل کے داغ کو چوٹ
پر ایسی ہے کہ لگے تڑے جیسے زارغ کو چوٹ

شوق سے تو ہاتھ کو میرے مرد
میں ترا پنچہ مردوں کس طرح
اس پر ہم گھبرائے اور کہا حاشا دکلا ہمارے شعر نہیں۔ اس مرحوم کے ہیں کہ میرا شاء اللہ

خاں کا بیٹا تھا اور دلی کا تھا۔ پہلی بار افسوس ہوا کہ ہم نے نام یہ کیوں رکھا۔ اس سے تو وہ چوپائے والا نام ہی اچھا تھا۔ شیر محمد خاں۔ چھوٹوں موٹوں کی تو ایسا نام سن کر ہی ہلکی بند جاتی ہے۔

پروفیسر ایوب قادری نے کہ محقق آدمی ہیں اس تقریب سے ہم پر مضمون لکھنے کا بیڑا اٹھایا تو ایک دوست نے تجزی کی کہ انہوں نے انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں تمام پرانے تذکرے اور مخطوطے کھنڈال ڈالے، کہیں آپ کے حالات نہیں ملے۔ لہذا اب وہ آپ سے ملیں گے۔ اپنے پر مضمون لکھا جانے کا سن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ ہم نے کہا چشم ناروژن دل ناشار۔ قادری صاحب کے لئے کسی ایسے شخص پر مضمون لکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا جو ابھی مرانہیں اور قریب المرگ بھی دکھائی نہیں دیتا لیکن ریسرچ کا آدمی کبھی مار نہیں کھاتا۔ آئے تو سوالات سے مسلح ہو کر آئے۔ سب سے پہلے ہمارا اسم گرامی دریافت کیا وہ ہم نے خوشی سے بتا دیا۔ ولدیت بھی۔ عمر ہم اپنی موقع محل کے مطابق دو چار سال گھٹا کر یا بڑھا کر بتایا کرتے ہیں۔ یہاں بڑھا کر بتائی کہ اپنے مہمان خصوصی کو بالکل ہی بچہ نہ سمجھ لیں۔ کہاں پیدا ہوئے تھے اور کیوں پیدا ہوئے تھے، کا ہم کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔

شجرہ نسب مانگ رہے تھے۔ ہمارے پاس کہاں سے آتا۔ ہم نے کہا بزرگوں میں اپنے والد کا نام یاد ہے یا ایک اور مورث اعلیٰ کا کہ اپنے زمانے کے مشہور پیغمبر تھے۔ بولے کون، ہم نے حضرت آدم علیہ السلام کا نام بتایا تو عقیدت سے اودھ موئے سے ہو گئے۔ تعلیم کا پوچھا۔ کچھ ہوتی تو بتاتے۔ فرمایا تعلیم نہیں تو ڈگریاں تو ہوں گی۔ وہ ہم نے بتا دیں۔ کہنے لگے آپ سنا ہے یونیورسٹی میں اول آئے تھے؟ انکار کا کچھ فائدہ نہ تھا ہم نے اقبال کیا۔ بولے۔ اس سال ایک سے زیادہ طالب علم تھے کیا؟ اس سوال کو ہم نال گئے۔ پوچھا شاعری میں کس کے شاگرد رہے۔ ہم نے ماسٹر جنرل سنگھ دلیگیر اور چچو رام تشنہ اور شمس الدین چراغ ریواڑی کے نام لکھوا دیئے۔ قوم، گوتم، نوکری، تصانیف اور نہ جانے کیا کیا لکھ چکے تو بولے۔ ہمارے تحقیق کے اصولوں کے مطابق خاصی معلومات جمع ہو گئیں۔ یہ معاملہ کچار با کہ آپ کے بزرگ خراسان سے نہیں آئے تھے اور صاحب دیوان وغیرہ نہیں تھے لیکن خبر۔ اب ایک آخری سوال باقی ہے۔ آپ کی تاریخ وفات کیا ہے؟ یہ ہم نے بتانے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ کچھ طول اور افسردہ واپس گئے۔ خود ہمیں بھی افسوس ہوا کہ اس سلسلے میں ان کی تشفی نہ کر سکے حالانکہ ہمارے ہی بھلے کی کہہ رہے تھے۔

خیر صاحبان اب تو ہماری صدارت کا سفینہ کنارے پر آنگا۔ ستم و جورنا خدا کہنے کا کیا فائدہ۔
 آپ صاحبوں نے مجھے مہمان خصوصی بنایا۔ بہت شکریہ۔ اس میں اتنی تاخیر کی تو اس کا کچھ ملال نہیں۔
 ہمارے ملک میں جو ہر قابل کی قدر شناسی میں عموماً دیر ہو ہی جاتی ہے۔ واللہ ہمارا دل آپ کی طرف سے
 صاف ہے۔ یار زندہ محبت باقی۔ یہ کالج ہماری مادر علمی ہے اور اس سے ہمیں دلی محبت ہے۔ آئندہ بھی
 آپ حضرات کسی جلسے کی صدارت یا تقسیم اسناد کے لئے یا دفرائیں گے تو اپنی بے پناہ مصروفیات کو پس
 پشت ڈالنے میں عذر نہ ہوگا کیونکہ وہ انسان کیا جو کسی کے کام نہ آئے۔ داسے درے کی بات چھوڑیے کہ
 دنیا میں روپیہ ہی سب کچھ نہیں ہے، وہاں قدمے سخنے اس کالج کی خدمت میں درلغ نہ ہوگا۔ مجھے یہ دیکھ
 کر خوشی ہوئی کہ آج کے جلسے میں زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اخبار میں جلسے کا اعلان ہو
 گیا تھا جس میں ہمارا نام بھی درج تھا۔ بہر حال زیادہ مجمع سے اس فقیر گوشہ گیر کا جی ہمیشہ گھبراتا ہے۔
 تاہم میں ان اہل ذوق حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو منتظمین یا مضمون پڑھنے والوں یا
 سندت لینے والوں یا پانی پانے والوں کے علاوہ یہاں موجود ہیں۔ اگر کوئی ہیں تو انجیل الدین عالی
 صاحب کا شکریہ بطور خاص مجھ پر فرض ہے، جنہوں نے میرے ایما پر کالج والوں سے کہا کہ مجھ سے مہمان
 خصوصی بننے کی درخواست کریں اور اس کے لئے کالج کا پرانا طالب علم ہونے کا عذر یا عذر رنگ ڈھونڈا
 ۔ پھر وہ جلسے میں حاضرین کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اپنے اہل و عیال کو اپنی کار میں بھر کر لائے۔ یہ ان
 کا دوسرا احسان ہے۔ سچے دوستوں کی پہچان ایسے ہی موقع پر ہوتی ہے اور اب سیکرٹری صاحب سے
 گزارش ہے کہ انہوں نے در یوں، کرسیوں، شامیانے، کوکا کولا اور آج کے جلسے کے خرچ کی دوسری
 تفصیل تیار کر لی ہو تو مجھ سے الگ آکر ملیں۔ یہ ایک خصوصی معاملہ ہے اور اپنے پیارے کالج کی بات
 ہے ورنہ تو ایسے جلسوں کا خرچ عموماً میزبان خود ہی اٹھایا کرتے ہیں۔

دعوتوں پر پابندی

(۱)

بیچے آج سے سندھ کی حکومت نے ہمارے نوالے گننے شروع کر دیے ہیں یعنی پابندی عائد کر دی ہے کہ شادی کی تقریبات میں دس سے زیادہ مہمانوں کی دعوت نہیں کی جاسکتی۔ اگر کوئی مہمان نواز گھر میں احباب یا رشتہ داروں کو بلائے تو اس پر دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق ہوگا۔ یعنی پانچ سے زیادہ مہمان نہ بلا سکے گا۔ ہم تو خیر کسی کو بلا تے ہی نہیں، حکومت سندھ کا آرڈر نکلنے سے پہلے سے اس کی پابندی کر رہے ہیں، لیکن اپنے ان دوستوں سے ہمدردی ہے جو آئے دن ہمیں دعوتوں میں بلا تے ہیں۔ ایک لحاظ سے ہمیں اپنے آپ سے بھی دلی ہمدردی ہے کہ اب کوئی بلائے گا نہیں تو ہم جائیں گے کیسے۔ وہ جو شادیوں کے موسم میں ہم شیر وانی پہن کر اور معطر و مال باتھ میں لے کر جہاں چھولہ داری تھی دیکھی مہمانوں میں شامل ہو جایا کرتے تھے اور بسم اللہ کہہ کر کھانے کی قاب میں چچہ ڈال دیتے تھے، اس کا موقع بھی گیا۔ کیونکہ جو آدمی دس آدمیوں کو بلائے گا، وہ ان کی پہچان بھی ضرور رکھتا ہوگا۔ ممکن ہے شناختی کارڈ کا رواج بھی ہو جائے کہ مہمان اپنا تصویر لگا کارڈ دکھائے تب کھانا ملے گا۔

اس وقت بھی جب کہ اس پابندی کا آغاز ہوا ہے، ہمارے پاس احباب کے کئی کارڈ جمع ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم نے گھر میں کہہ رکھا ہے کہ فلاں فلاں تاریخ کو دال پکانا یا تم لوگ بھی کسی دعوت میں چلے جانا کیونکہ ہمارا کھانا باہر ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ ہمارا برابر کا حساب ہے۔ کبھی وہ ہمیں کھانے پر بلا تے ہیں کبھی ہم ان کے ہاں کھانے پر چلے جاتے ہیں۔ ہفتے میں تین دن اور دعوتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ جن کا سامان ہم اپنے کوہان میں بھر کر ہفتہ بھر چلاتے ہیں۔ جس دن کوئی دعوت نہ ہو، اس دن ہمیں لامحالہ خیال آتا ہے کہ ہم اپنی صحت کی طرف سے غافل ہو رہے ہیں۔ ڈانٹنگ شروع کرنی

چاہئے۔ اور آج ہی سے شروع کرنی چاہئے۔ اس میں خست وغیرہ کی کوئی بات نہیں۔ جو لوگ ہمیں جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہم دریا دل آدمی ہیں۔ بس اسے اتفاق ہی کہئے کہ جس دن ہماری کہیں دعوت ہو اس دن ڈانٹنگ کرنے کا وسوسہ کبھی ہمارے جی میں نہیں آتا۔

سوال یہ ہے کہ جو احباب ہمیں دعوت دے چکے ہیں۔ وہ کیا کریں۔ مثلاً ہمارے دوست اقبال صفی پوری نے اپنے فرزند نیک اطوار کی شادی کے دیسے میں ہمیں بلا رکھا ہے۔ ان کا ایک خوبصورت سا کارڈ آیا ہے اور اس کے انتظار میں ہم نے ابھی سے بھوک رکھ کر کھانا شروع کر دیا ہے۔ اب یا تو وہ ہمیں اس مضمون کا کارڈ بھیجیں کہ ”مکرمی میرے بیٹے کی شادی کا دلیمہ ۳ دسمبر کو ۸ بجے جناح کالج کے کمپنڈ میں ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ تشریف نہ لا کر اور ماحضر تادل نہ فرما کر ممنون فرمائیں۔ تاکہ یہ“ یا پھر اس کو نذر نیاز کے جلسے کی صورت میں دے دیں۔ کیونکہ حکومت کے اعلان میں ہے کہ خیرات کے سلسلے میں تقسیم کئے جانے والے لنگر، تبرک اور نیاز و فاتحہ کے کھانے پر اس پابندی کا اطلاق نہ ہوگا۔ تبو کے باہر خواجہ غریب نواز کے عرس کا پھر ریرا لہرایا جاسکتا ہے یا اس قسم کی تختی کہ یہاں حضرت ابن انشا کے اعزاز میں لنگر دیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ حکومت کے آرڈر کی رو سے اس پابندی کا اطلاق سوڈا واٹر، فروٹ، اسکولش، دودھ اور دیگر مشروبات، تازہ پھل، خشک میوہ جات، چھالیہ، پان آکس کریم، آلو کی چاٹ۔ آلو کے کباب اور مچھلی پر نہیں ہوتا۔ جو احباب ہمارے اعزاز میں لنگر دیں وہ ان چیزوں کا انتظام بھی رکھیں، کیونکہ ہم کھانے سے پہلے سوڈا پیتے ہیں۔ یہ اشتہا انگیز چیز ہے۔ پانی کی جگہ ہمیں فروٹ اسکوالش پسند ہے اور دودھ بھی غذائیت سے بھرپور چیز ہے۔ البتہ ہمارے گلاس میں شکر تین چمچ سے زیادہ نہ ڈالی جائے۔ دیگر مشروبات کو کاکولا وغیرہ کا بھی ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ تازے پھل ہمیشہ سے ہمیں پسند ہیں اور ہم کسی دعوت میں جائیں تو خشک میوہ جات ٹھونکنے سے پہلے چند کیلے اور سیب وغیرہ نوش کرنا ہمارے جسم کی وٹامن کی ضروریات کے لئے مناسب رہتا ہے۔ آکس کریم پستے کی ہمیں مرغوب ہے اور پان سادہ جس میں چھالیہ، کٹھا، الائچی، خوشبو، ناریل کا سفوف اور مراد آبادی تبا کو ہواور کچھ نہ ہو۔ آلو کی چاٹ اور آلو کے کباب پر ہم اصرار نہیں کرتے بل گھے تو کھالیں گے البتہ مچھلی دینی چاہئے کیونکہ جس کھانے یعنی لنگر میں مچھلی نہ ہو، وہ کھانا کیسے کھلا سکتا ہے۔ یوں بھی مچھلی اور لنگر دونوں کا سمندر سے تعلق ہے۔ ہمیں بھی لوگوں نے دعوت کا کھانا کھا کر اسی طرح کرسی میں دھستے دیکھا ہے جس

طرح جہاز نگر ڈالنے کے بعد بندرگاہ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہم نے حکومت کے کو حکم بہت غور سے پڑھا ہے۔ اگر حکومت کا کا بندہ ویسے کی دعوت کو نگر نہ تسلیم کرے تب بھی گرفت نہیں کر سکتا۔ بشرطیکہ یہ انتظام سبواور قاتلوں کے اندر ہو۔ حکم میں ہے کہ محکمہ خوراک کا کوئی بھی انسپکٹر کسی بھی عمارت۔ موٹر گاڑی یا بحری جہاز میں داخل ہو سکتا ہے اور کسی بھی شخص کی موٹر گاڑی یا بحری جہاز یا جانور کو روک سکتا ہے اور اشیا کو ضبط کر سکتا ہے۔ فرض کیجئے انسپکٹر بولینی کھانے کی خوشبو سونگھتا ہوا آتا بھی ہے تو اس سے ہم حجت کر سکتے ہیں کہ بابا کہاں منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو۔ یہ نہ عمارت ہے نہ موٹر گاڑی نہ بحری جہاز ہے اور نہ جانور ہے۔ معلوم ہوتا ہے تم نے ان چیزوں کی شکل کبھی نہیں دیکھی۔ اگر وہ بھی جتنی ہوا تو بے شک چھو لنداری اور قاتلین ضبط کر لے پھر یہ محکمہ خوراک اور رائج نظام الدین اینڈ سنز کا اندرونی معاملہ ہو جائے گا۔ ہمارا اس میں دخل نہیں رہے گا اور اگر کھانا ضبط کرنا چاہے تو بے شک ہمارے سامنے سے آلو کی چاٹ اور آلو کے کباب اٹھالے۔ ہم ویسے بھی کم خور ہیں۔ ایسی چیزیں نہیں کھاتے لیکن کھا کر پلٹ واپس دینی ہوگی۔ کیونکہ حکومت کے اعلان میں کھانا ضبط کرنے کا حکم ہے، پلٹیں اور برتن نہیں۔

یہ نظر احتیاط ہم مشورہ دیں گے کہ ویسے وغیرہ کی دعوت میں ایک دو قوال ضرور بلائے جائیں۔ جہاں مخبر نے خبر دی کہ محکمہ خوراک کا کارندہ گھوم رہا ہے اور مشتبه نظروں سے دیکھ رہا ہے وہ کان پر ہاتھ رکھ کر اپنا کاروبار شروع کر دیں۔ کس چیز کی کمی ہے مولا تیری گلی میں یا ہمیں نظر کرم کی بھیک ملے۔ ابی بھیک ملے۔ ہاں ہاں بھیک ملے۔ تاکہ باقاعدہ مزدور نیاز کی تقریب معلوم ہو۔ اگر ان ترکیبوں میں سے کوئی نہیں چلتی اور میزبان کو مثلاً ہمارے دوست اقبال صفی پوری کو حکومت کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر تین سال قید کی سزا ہو جاتی ہے تب بھی ایسی فکر کی بات نہیں۔ ہم ان سے جیل میں جا کر مل آیا کریں گے۔ کبھی کبھی ناشہ دان میں ان کے لئے کھانا بھی لے جایا کریں گے اور ان کی رہائی کے لئے محضر پر دستخط بھی کر دیں گے۔ ان کی شاعری کو جیل جانے سے جو عروج حاصل ہوگا اس کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ جناب فیض احمد فیض کے مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فیض صاحب جیل نہ جاتے اور دست صبا اور زنداں نامہ نہ لکھتے تو کبھی اتنے بڑے شاعر نہ ہوتے۔ ”رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی“ اور مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ“ وغیرہ لکھتے رہتے۔ چونکہ ہم نے آرزو کا دو تین بار مطالعہ کر کے اطمینان کر لیا ہے کہ مہمانوں کو کسی صورت نہیں پکڑا جائے گا لہذا ہم اقبال صفی پوری صاحب

کو مشورہ دیں گے کہ وہ دعوتِ ولیمہ ہرگز منسوخ نہ کریں اور اس میں اگر کوئی خطرات ہیں تو ان کا مردانہ وار سامنا کریں۔ اگر انہوں نے ہمیں محض اپنے کلام اور مشاعرے وغیرہ پر ٹالنے کی کوشش کی کہ یہ بھی ایک طرح کی موسیقی ہے اور موسیقی روح کی غذا کہی جاتی ہے، تو ایک تو اس منطق سے ہمارا پیٹ نہ بھرے گا۔ دوسرا خطرے ہے حکومت کہیں شاعروں اور موسیقی کی محفلوں پر بھی پابندی نہ لگا دے کہ اول تو یہ چیزیں ہوں نہیں اور ہوں تو سامعین کی تعداد اس سے تجاوز نہ کرے۔ ہمارا تو اس میں بھی نقصان نہیں لیکن شاعروں کو اچھا رہا ہو جائے گا۔

بٹیر کی نہاری

گزشتہ بدھ کی شام ہمارا صدر کے ایک نامی ریستوران میں جانا ہوا۔ بیر الپک کرایا۔ ہم نے پوچھا۔ ”کیا ہے۔“

بولا۔ ”جی اللہ کا دیاسب کچھ ہے!“

ہم نے کہا ”کھانے کو پوچھ رہے ہیں۔ خیریت دریافت نہیں کر رہے۔ کیونکہ وہ تو تمہارے روغنی تن دوش سے دیے بھی ظاہر ہے۔“

کہنے لگا۔ ”حلیم کھائیے۔ بڑی عمدہ پکی ہے۔ ابھی ابھی میں نے باورچی خانے سے لاتے ہیں ایک صاحب کی پلیٹ میں سے ایک لقمہ لیا تھا۔“

”لیکن آج تو گوشت کا نامہ ہے۔“

بولا ”ہوا کرے۔ یہ مرغ کی حلیم ہے۔ آپ کھا کے تو دیکھئے۔ فوراً بانگ دینے کو جی چاہے گا۔“

”نہاری ہے؟“

”جی ہاں ہے، مرغ کی نہاری بھی ہے، بٹیر کی نہاری بھی ہے۔“

”بٹیر کی نہاری“

بولا، ”جی ہاں اور اس کے علاوہ پدی کا شوربا بھی ہے۔ تیر کے سری پائے ہیں۔ مسور کی دال کے نکلے اور کباب ہیں۔ آپ کل آئیں تو بھینسے کے گوشت کا مرغ پلاؤ بھی مل سکتا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”بٹیر کی نہاری لاؤ فی الحال۔“

ہمارے ساتھ ہمارے ایک دوست تھے۔ دلی کے جیوڑے، نہاری آئی تو بولے۔ ”میاں ٹلیاں تو اس نہاری میں ہیں نہیں۔ ہم لوگ تو جب تک بلیوں کو پیالی کے سرے پر بجا بجا کر نہ چوسیں مڑا نہیں آتا۔“

بیرا جانے کیا سمجھا۔ ایک طشتری میں خلال اٹھالایا۔ ہم نے کہا۔ ”میاں خلال تو کھانے کے بعد درکار ہوتے ہیں۔ کچھ تیز ہے کہ نہیں؟“

بولا۔ ”حضور یہ خلال نہیں۔ نلیاں ہیں۔ بیڑ کی نلیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ویسے ہم آئینہ نلیوں کے شوقینوں کے لئے پلاسٹک کی نلیاں بنوا رہے ہیں۔ نانے کے دن نہاری اور شور بے کے ساتھ پیش کی جایا کریں گی۔ گودالان کے اندر آلوؤں کا ہوا کرے گا۔“

ہمیں معلوم نہیں کہ ہر چیز کا نعم البدل نکالنے والوں نے پلاسٹک کے بکرے بھی ایجاد کئے ہیں یا نہیں۔ ان کی ضرورت کا احساس ہمیں عید سے دو روز پہلے ہوا۔ وہ یوں کہ ہم دفتر جاتے برنس روڈ سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ دیکھا کہ ہجوم ہے۔ راستہ بند ہے۔ آدمی ہی آدمی۔ دبے ہی دبے۔ بکرے ہی بکرے!

ایک بزرگ سے ہم نے پوچھا۔ ”یہ کیا میلہ مویشیاں ہو رہا ہے۔ ہم نے اشتہار نہیں پڑھا اس کا۔ میلہ مویشیاں ہے تو ساتھ مشاعرہ بھی ضرور ہوگا۔ ایک غزل ہمارے پاس بھی ہے۔“

بولا۔ ”جی نہیں۔ یہ برنس روڈ کی بکرا بیڑی ہے۔ لیجئے یہ دنبہ لے جائیے۔ آپ کے خاندان بھر کو بل صراط سے پار لے جائے گا۔“

ہم نے پوچھا ”بد یہ کیا ہے اس بزرگ کا؟“

بولے۔ ”پانچ سو لے لوں گا۔ وہ بھی آپ کی مسکین صورت پر ترس کھا کر۔ ورنہ چھ سو روپے سے کم نہ لیتا۔“

ادھر سے نظر ہٹا کر ہم نے ایک اللہ لوک قسم کے بکرے کی طرف دیکھا جو مارے ضعف اور ناتوانی کے زمین پر بیٹھا تھا۔

ہم نے کہا۔ ”اس ذات شریف کے کیا دام ہوں گے؟“

اس کا مالک دوسرا تھا۔ وہ بھاگا آیا۔ بولا ”جناب آپ کی نظر کی داد دیتا ہوں۔ بڑی خوبیوں کا بکرا ہے۔ اس کی داڑھی پر نہ جائیے۔ ایک میسن گھرانے میں پلا ہے ورنہ عمر اس کی زیادہ نہیں۔ آپ سے دو چار سال چھوٹا ہی ہوگا۔“

ہم نے کہا ”یہ چپ چاپ کیوں بیٹھا ہے۔ چگالی تک نہیں کرتا۔“

بولے۔ ”دانتوں میں کچھ تکلیف تھی۔ پوری بیتیسی نکلوادی ہے۔ خیال تھا مصنوعی جیزر الگوانے

کا۔ لیکن اتنے میں عید آگئی۔“

”کتنے کا ہوگا۔“

”دوسرے دیکھئے۔ اتنے میں مفت ہے۔“

ہم نے اپنی جیب کو ٹٹولا اور کہا۔ ”سورپے سے کم کی چیز چاہئے۔“

بولے ”پھر آپ مرغ کی قربانی دیکھئے۔ چوپایہ نہ ڈھونڈئے۔“

اس سے کچھ آگے ایک کالا بکرا نظر آیا۔ کالا ہونے کی وجہ سے نظر بھی آگیا۔

ہم نے اس پر ہاتھ پھیرا لیکن اتنے میں ہوا کا جھوٹکا آیا اور یہ دور جا پڑا۔

ہم نے مالک سے کہا۔ ”یہ بکرا ہے یا بکرے کا خلاصہ؟“

مالک نے کہا۔ ”سائیں آج کل زمانہ ہی خلاصوں کا ہے۔ یہ تو خلاصہ ہے۔ ایسے ایسے

بکرے آپ کو دکھاؤں کہ آپ ان کو گیس پیپر کہیں۔ جانور کا ست قرار دیں۔ ہوا تیز ہے لہذا اپنی جیب

میں ڈال رکھے ہیں۔“

ہم نے کہا ”دکھاؤ تو“

انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی کھول کر کہا۔ یہ لیجئے۔

ہم نے کہا۔ ”ہمیں تو نظر نہیں آتا۔“

بولے۔ ”قرب سے دیکھئے۔ جھک کے دیکھئے۔ سنا بھی ہے، چالیس روپے میں ہو جائے گا۔“

ہم نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”اچھا کل سہی۔ اس وقت تو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

ان بزرگوں نے ایک مینڈھے کو ششکارا کہ صاحب کو دیر ہو رہی ہے ذرا پہنچا آئیو ان کے دفتر۔

وہ سینگ جھکا کر ہماری طرف لپکا۔

جب کوئی چیز نایاب یا مہنگی ہو جاتی ہے تو اسی کا بدل نکل ہی آتا ہے جیسے بھینس کا نعم البدل

موگ پھلی۔ آپ کو تو گھی سے مطلب ہے۔ کہیں سے بھی آئے۔ اب وہ مرحلہ آگیا ہے کہ ہمارے ہاں

بکرے اور دنبے کی صنعت بھی قائم ہو۔ آپ بازار میں گئے اور دکاندار نے ڈبا کھولا کہ جناب یہ لیجئے

! بکرا اور یہ لیجئے پمپ سے ہوا اس میں خود بھر لیجئے۔ کھال اس بکرے کی کیریلین کی ہے۔ اور اندر کمانیاں

اشین لیس اسٹیل کی۔ مغز میں فوم بڑ ہے۔ واش اینڈ ویر ہونے کی گارنٹی ہے۔ باہر صحن میں بارش یا دوس میں بھی کھڑا کر دیجئے تو کچھ نہ بگڑے گا۔ ہوا نکال کر ریفریجریٹر میں بھی رکھا جاسکتا ہے۔ آج کل قربانی والے یہی لے جاتے ہیں۔

رسالوں کا زمانہ گیا۔ اب ڈائجسٹوں کا دور ہے۔ لیکن ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے مزائیک کی نہاری ہی کا آتا ہے کہ بچارے کی جان گئی اور کھانے والے کو سواد نہ آیا۔ پھر زیادہ مصروف لوگوں کے لئے ڈائجسٹوں کے ڈائجسٹ نکلتے۔ خلاصہ، خلاصہ، خلاصہ۔ خیر بہت سی کتابیں ہیں بھی اس قابل کہ محض ان کا مطالعہ استعمال کیا جائے۔ ہمیں تو کوئی کسی ناول کے پڑھنے کی سفارش کرے تو ہم پوچھتے ہیں کہ صرف اتنا بتا دو کامیڈی ہے یا ٹریجڈی؟ آخری باب میں باجے گئے تھے ہیں یا ہیرو ہیروئن کی قبر پر کھڑے ہو کر نسوے بہاتا ہے اور آسمان سے رحمت کے پھول برستے ہیں۔ بچ کے مناظر سے ہمیں مطلب نہیں کیونکہ ان میں حد سے حد رقیب ہوگا۔ سو آخری سے پہلے باب میں اپنے کیفر کردار کو پہنچا ہوگا یا اس کے سن کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی یا جیل میں اکڑوں بیٹھا چنے کی دال سے جو کی روٹی کھا رہا ہوگا۔ ہمارے خیال میں اخباروں کے ڈائجسٹ بھی نکلنے چاہئیں کیونکہ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ بارہ بارہ چودہ چودہ صفحے پڑھے۔ لوگ تو بس تو س کا ٹکڑا منہ میں رکھ چائے کی پیالی پیتے ہوئے سرخیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ بڑا اخبار نکالنے کے لئے یوں بھی لاکھوں روپے درکار ہوتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ”سرخ“ کے نام سے ایک روزنامہ نکالیں اور پبلک کی خدمت کریں۔ ہمارے پاس بینک میں پچاس روپے ہیں۔ شاید زیادہ ہی ہوں۔ اب اہل نظر سے سرپرستی کی درخواست ہے۔

اس اخبار میں مزاحیہ کالم کی جگہ صرف یہ لکھا ہوگا۔ ”ہنسے۔“ ایڈیٹوریل کے کالم میں فقط ایک لفظ ہوگا۔ ”روئے۔“ منڈیوں کے بھاؤ کا کالم بھی ہوگا۔ لیکن وہ بھی ایک لفظی ”لٹے۔“ ریلیوں اور ہوائی جہازوں کے اوقات بھی ہم تفصیل سے نہ دیں گے۔ ان کی جگہ فقط ”جائیے“ کا لفظ ہوگا۔ ڈائجسٹ نئی چیز نہیں۔ کسی نے پرانے زمانے میں حضرت یعقوب اور یوسف کے قصے کا خلاصہ بھی سرخیوں میں لکھا تھا۔ ”پدرے بود۔ پسرے داشت۔ گم کرد۔ بازیافت۔“ آپ خود ہی سوچئے اصل بات اتنی ہی تو ہے۔ زلیخا کے قصے سے کتنوں کو دلچسپی ہے۔

روپیہ مکھانا

شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ خطائے بزرگان گرفتار خطا است۔ لیکن کیا کیا جائے ہماری تو ساری زندگی بزرگوں کی خطائیں پکڑتے اور ان کے مقولوں کو غلط ثابت کرتے گزر گئی۔ بزرگوں کو بھی کچھ ہم سے ضد معلوم ہوتی ہے کہ جو بات فرمائیں گے غلط فرمائیں گے۔ انہی میں ایک مقولہ یہ سننے میں آتا ہے کہ دولت آتی جاتی ہے۔ یعنی آتی ہے اور جاتی ہے، ہمیں اس کا یہ دوسرا روپ (جانے کا) تو دیکھنے کا اکثر اتفاق ہوا بلکہ ہر روز ہوتا ہے۔ لیکن آتی کس راستے سے ہے، یہ کبھی تحقیق نہ ہوا۔ کئی بار تو ہم اس راہ پر بھی امیدوار بیٹھے جو تری راہ گزر بھی نہیں لیکن بے سود۔ پھر بھی یہ سنا کہ یہ روپیہ ہاتھوں کی میل ہے۔ بے شک یہ درست ہوگا لیکن یہ نکتہ سمجھ میں نہ آیا کہ صرف دوسروں کے ہاتھوں کی میل کیوں ہے۔ آخر ہمارے بھی تو ہاتھ ہیں۔ ان پر بھی تو یہ میل جنسی چائیے۔ شیخ سعدی مرحوم نے تو گری کے موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا ہے حالانکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے انہیں خود اس سے کم ہی واسطہ پڑا۔ ایک شعر وہ ہمارے بارے میں بھی کہہ گئے ہیں

قرار برکف آزادگان نہ گیر دمال
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

آپ تو خیر فارسی جانتے ہیں۔ نہ جاننے والوں کے لئے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس طرح عاشق کے دل میں صبر اور چھلنی میں پانی نہیں ٹھہر سکتا۔ اسی طرح آزاد منش لوگوں کی ہتھیلی پر پیسہ نہیں نکلتا۔ ان میں سے دو باتیں تو ہماری آرزو وہ ہیں۔ صبر در دل عاشق والی اور مال والی۔ پانی والی بات کا تعلق چھلنی سے ہے۔ سو پانی جانے اور چھلنی جانے۔

روپے کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ملے تو براہ راست ملے۔ چھپر پھاڑ کے ملے۔ رستے میں پڑا ہوا ہاتھ آجائے یا والدین اپنا چراغ کچھ دن کو مستعار وے دے۔ کاروبار اور نوکری سے پیسہ ملا تو کیلا۔ ایسے تو ہر کوئی کما سکتا ہے۔ کام کرنے کی بچ ہمیں پسند نہیں۔ اس سے تو روپیہ ملنے کی خوشی آدمی

رہ جاتی ہے۔

آخر ایک روز مراد دلی بر آئی۔ ایک بزرگ خضر صورت ملے اور بولے۔ بچہ غم نہ کر۔ کچھ ہم فقیروں کی خدمت کر اور ہم سے ۱۸ کیرٹ گولڈ۔ یعنی تاندلیا نوالہ کا خالص سونا بنانے کا نسخہ حاصل کر۔ چونکہ انسان کچھ کھو کر ہی پاتا ہے، یہ بھی داناؤں کا مقولہ ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے جو کچھ ہمارے پاس تھا۔ ہم نے ان بزرگ کی خدمت میں کھویا۔ لیکن آخر وہ نسخہ کیسا ہاتھ آ ہی گیا۔ ان بزرگ نے بتایا کہ یہ نسخہ قارون بادشاہ سے ان تک دست بدست پہنچا ہے۔ ہر کسی کو وہ نہیں بتاتے اور ہم نے جو دوائے درے ان کی خدمت کی ہے اسے محصول ڈاک اور خرچہ اشتہارات کی مد میں شمار کیا جائے۔ یوں پیسہ لینا ان کے لئے حرام ہے۔

اس نسخے کے بعض اجزاء تو بڑی آسانی سے دستیاب ہو گئے لیکن بعض کی بہم رسانی میں کچھ دقت پیش آئی۔ شیر کے ناخن بھی مل گئے۔ اور بجو کی کھال بھی ایک بزرگ نے عنایت کر دی۔ لگز بجز کی ریزہ کی ہڈی کا براہہ بھی بڑی دوڑ دھوپ کے بعد آخر میسر آ گیا۔ اب فقط کانٹے والی تھوڑی سی بیٹ جمع کرنی تھی۔ جس کی شرط یہ تھی کہ چاند رات کی چودھویں کو بوقت نیم شب جب وہ نیم کے درخت پر استراحت کر رہا ہو تو اس کے گھونسلے سے حاصل کی جائے۔ پہلی دقت تو الوؤں کا مہاراجہ رنجیت سنگھ تلاش کرنے میں ہوئی۔ الوؤں، خصوصاً ان الوؤں سے جن کا شمار پرندوں یا جانوروں میں ہوتا ہے ہمارا واسطہ کم ہی پڑتا ہے۔ ایک الو ملا تو یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ دونوں آنکھیں درست ہیں۔ ایک اس نے یاد الہی میں بند کر رکھی تھی اور دوسری شکار کے لئے کھلی رکھی تھی۔ کئی دن کی دوڑ بھاگ کے بعد ایک آنکھوں کا گانٹھ کیت الو ملا تو وہ نیم کے درخت پر نہیں تھا۔ ایک ٹیکر کی پھنگ پر تھا۔ نیم کا درخت پاس ہی تھا۔ وہ چاہتا تو اس پر بیٹھ سکتا تھا، کوئی امر مانع نہ تھا لیکن ہمیں تنگ جو کرنا ہوا۔ ایک ہار نیم کی شاخ پر بیٹھا مل گیا تو قریب جانے پر معلوم ہوا کہ کوئی اور جانور ہے۔ اور جب نیم اور کانٹے والو کا قرآن السعدین ہوا بھی تو تاریخ چاند کی تیرہویں نکل آئی۔ خیر ہم نے شک کا فائدہ خود کو دیا کہ رویت بلال ہمیشہ سے جھڑکی چیز چلی آئی ہے۔ تیرہویں اور چودھویں میں چنداں فرق نہیں۔ لیکن پہلے تو اس کا گھونسلہ نہ ملا۔ ملا تو اس میں بیٹ نہ تھی۔

تمی وستان قسمت راجہ سوداز رہبر کال

یہ مل جاتی تو اس کے بعد فقط نو گز سے پیر کے مزار پر چالیس دن کا مراقبہ کرنے کی شرط رہ جاتی تھی جس کے بعد ان سب چیزوں کو کالی ہنڈیا میں گل حکمت کر کے سرمہ بنا کر اس کی ایک ایک سلائی رجب کی ۲۸ ویں کو بوقت طلوع آفتاب اپنی دونوں آنکھوں میں لگاتی تھی۔ اور اگر اس عمل کے بعد ہماری بینائی باقی رہ جاتی تو ہمیں ساری دنیا کا سونا نظر آ جاتا۔ اپنا سونا تو خیر سمیٹ لیا جاتا۔ باہر کے سونے کو شاید اسمگل کر کے لانا پڑتا۔ خیر اس کی فوٹ ہی نہ آئی۔

اس میں شک نہیں کہ دولت مند بننے کے بغض آسان تر نسخے بھی ہمارے ہاں مروج ہیں مثلاً ہنڈیا میں نوٹ ڈال کر ان کو دگنے کرنا لیکن اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ جب تک ہنڈیا میں کچھ ڈالا نہ جائے دگنا نہیں ہو سکتا۔ ایک باکمال بزرگ ہمیں بھی ملے۔ ہم نے کہا۔

بندہ پرور! ہمارے پاس نقد تو کچھ ہے نہیں۔ آپ سو روپے ہماری طرف سے ہنڈیا میں خود ہی ڈال دیجئے۔ یہ آپ کا ہم پر قرض تصور ہوگا۔ دگنے ہو جائیں تو ان میں سے اپنی رقم وضع کر لیجئے گا بلکہ دس پانچ روپے اوپر لے لیجئے گا۔ باقی پر ہم اکتفا کریں گے۔ کیونکہ لالچ ہماری طبیعت میں نہیں ہے۔ لیکن وہ نہ مانے۔

کچھ دن بعد ہمارے پاس ایک اچھی خاصی رقم آئی۔ دس روپے سے اوپر ہی اوپر تھی۔ اب ان بزرگ کو تلاش کیا تو اتفاق سے ان کے پاس ہنڈیا نہ تھی۔ کیونکہ جیل میں اس کے رکھنے کی اجازت نہیں۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہوا کہ پولیس آس پاس ہو تو روپے دگے نہیں ہوتے۔ عمل کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

انہی دنوں ایک صاحب نے یہ نسخہ بتایا کہ سیدھے سیدھے کسی رئیس کی فرزندگی میں چلے جاؤ اور عمر بھر چین کی ہنسی بجاؤ۔ اس میں پہلی قباحت تو یہی تھی کہ ہنسی خواہ چین ہی کی ہو، عمر بھر بجانا مشکل ہے۔ دوسرے جب کوئی رئیس ملا تو فرزندگی کا ذکر درمیان میں نہ لایا اور اگر کوئی یہ ذکر درمیان میں لایا تو پتہ چلا کہ وہ رئیس نہیں۔ ان مرطوں سے گزرنے کے بعد ہی ہم نے ذیل کاریگی کی کتابوں سے رجوع کیا۔ اور گھر بیٹھے دولت مند بننے کے تجربے کئے اور دفتر کی میز پر بیٹھ کر معے حل کرنے میں کمال حاصل کیا لیکن یہ داستان طویل ہے۔ پھر کسی موقع پر بیان ہوگی۔

مسئلہ بچوں کے ناموں کا

نومولود بچوں کے ناموں کا مسئلہ خاصا پریشان کن ہے۔ اتنے نئے نام کوئی کہاں سے لائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریڈیو پاکستان، زاہدان ریڈیو اور ریڈیو سیلون کے فرمائشی پروگراموں سے خاصی مدد ملتی ہے۔ لیکن وہ چند سوناموں تک محدود ہے۔ پرانے زمانے میں یہ مسئلہ پیش نہ آتا تھا۔ کیونکہ لوگوں کے نام عبدالغنی، عبدالغفور، سراج دین، فاطمہ بیگم، سکیہ خاتون اور رحمت بی بی وغیرہ ہوتے تھے۔ ان کا لامتناہی ذخیرہ اب بھی موجود ہے۔ قلت صرف نئے ناموں کی ہے۔ ہر کوئی اپنے بیٹے کا نام صریح خامہ اور بیٹی کا نام نوائے سروش رکھنا چاہتا ہے۔ اساتذہ کے دیوان بھی آخر کہاں تک ساتھ دے سکتے ہیں۔ فیملی پلاننگ پر جو ہمارے ملک میں اتنا زور دیا جا رہا ہے، اس میں صرف یہی ایک حکمت نہیں کہ خوراک کا توازن نہ ہو جائے، ناموں کے توڑے کا بھی مسئلہ ملحوظ ہے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

بہت دن ہوئے ایک صاحب ہمارے پاس بھاگے بھاگے تشریف لائے کہ کوئی نام سبکیں اور لپٹکیں کے قافیے کا بتاؤ۔ ہم نے کہا خیریت؟ بولے میں نے اپنے تاریخی ذوق کی بنا پر اپنے دو صاحبزادوں کے یہ نام رکھے تھے۔ بس غلطی کر گیا۔ یہ نہ سوچا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں ہے۔ ورنہ خاندان سبکیں کی بجائے خاندان مغلیہ کا انتخاب کرتا، جس میں بابر اور ہمایوں سے لے کر رفیع الدولہ اور رفیع الدرجات تک کی گنجائش ہے۔ ہم نے پوچھا رنگ کیسا ہے صاحبزادے کا؟ معلوم ہوا باپ کی طرح کا ہے۔ ہم نے سرگین کا لفظ تجویز کیا۔ وہ انہیں پسند نہ آیا۔ غمگین، اندوگین پران کو یہ اعتراض تھا کہ فال بد ہے۔ حالانکہ انہیں میں سے کوئی بڑا ہو کر نالائق نکل جائے یعنی شاعر بن جائے اور اپنے لئے رنجور، الم، افسوس، حسرت وغیرہ تخلص اختیار کر لے تو کوئی نہیں روکتا۔ رنگین، تماشین، دورین، خوردین وغیرہ بھی ہمارے ذہن میں آئے۔ لیکن ہمارے دوست کا اٹھنمینا نہ ہوا۔ اگلے روز ان کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک طرف میز پر عربی، فارسی اور ترکی لغت رکھے ہیں، دوسری طرف فیملی پلاننگ کے لٹریچر کا ڈھیر ہے۔ کبھی اسے دیکھتے ہیں کبھی اس پر نظر کرتے ہیں۔ چراکارے کند عاقل کہ باز

ہمارے ہاں ناموں کا ایک انداز یہ ہے کہ انگریزی کا قاعدہ سامنے رکھا اور اس کے حروف
 ججی میں سے ایک دو کو ججی سے اٹھا کر اس کے بعد خان، احمد یا دین وغیرہ لگا لیا۔ اے احمد، بی احمد، زید
 خان وغیرہ حتیٰ کہ شہروں اور عہدوں کے ناموں کا مسئلہ بھی اسی طرح حل کیا گیا ہے۔ ابھی کل ہم نے
 پڑھا کہ ڈی آئی خان میں مسٹر این ایم احمد نے پی ڈبلیو ڈی کے ایس ڈی او کا عہدہ سنبھالا۔ جن بچوں
 کا نام والدین نے پرانی وضع کے رکھے ہیں۔ وہ بھی اختیار کیا گاتے پھرتے ہیں کہ ”نام ہمارا ہوتا ڈبلیو
 ڈبلیو خان اور کھانے کو ملتے لڈو۔ پی پی پی برتھ ڈے ٹو یو۔“ ہمارے ادب میں ل احمد اور ن م راشد پہلے
 ادیب تھے جنہوں نے اردو کے قاعدے کی سرپرستی کی۔ ہمارے بزرگ اور مہربان اسے ڈی اظہر
 صاحب اب اس عمر میں آخر مسلمان ہوئے ہیں یعنی خود کو الف دال اظہر لکھنے لگے ہیں۔ بہر صورت یہ بھی
 ان کی اردو دوستی پر دال ہے۔ اردو حروف ججی میں ایک قباحۃ البتہ ضرور ہے۔ آپ احمد دین کو الف دین
 تو لکھ سکتے ہیں۔ بدر دین کو ب دین نہیں لکھ سکتے پڑھنے میں ازالہ حیثیت عرفی کا اندیشہ ہے۔

ڈبلیو خاں وغیرہ ناموں پر کئی بار ہمیں دھوکہ ہوا شاید لوگ مسیحی ہیں اور کسی میونسپٹی کے محکمہ
 صفائی میں نوکر ہیں۔ ہمیں اپنے مسیحی بھائیوں کی صلح کل روش پسند ہے کہ نہ مشرق کو ناراض کرتے ہیں اور
 نہ مغرب کو۔ سوئٹل منڈا سنگھ، جوزف خیر دین اور رابرٹ تھے خاں قسم کے نام ان کے ہاں عام ہیں۔
 ہماری گلی میں جو صاحب جھاڑ دیتے ہیں، ان کا نام ہے جارج تھیسے خان۔ اور اندرون خانہ صفائی کا
 چارج مس الزبتھ بدھورام کے پاس ہے۔ ان کے نام بن کر سلطنت انگلشیہ مرحوم کی عظمت و سطوت یاد
 آتی ہے جس میں یہ لوگ بھی برابر کے شریک تھے۔ آزادی سے پہلے جب کانگریسیوں نے ”ملک چھوڑ
 دو“ کی مہم چلائی اور روزانہ جلسے جلوس کا غوغا ہونے لگا تو ایک روز پنجاب کے کسی شہر میں دو بزرگ اس
 قوم کے، ایک کا نام پنیر دوسرے کا نام پال، بڑے انتہاک سے کوڑے کی ڈھیریوں کو جھاڑو سے سڑک
 پر پھیلارہے تھے کیونکہ پورے رقبے پر کوڑے کو یکساں تقسیم کرنے سے سڑک نسبتاً صاف معلوم ہونے لگتی
 ہے۔ اتنے میں ایک طرف سے نعروں کی آواز آئی۔ ایک نے ان میں سے ٹھٹک کر پوچھا۔ ”اوے پنیر
 ایہہ کی ہور ہیا اے“ یعنی یہ کیا ہورہا ہے۔ دوسرے نے جھاڑو سے ٹیک لگا کر غور سے سنا اور کہا۔ ”اوے
 پال! ہونا کی اے۔ ایہہ لوگ اجادی منکدے پئے نے، تے اسیں دیندے نہیں۔“ یعنی اے برادر ہونا

کیا ہے۔ یہ لوگ آزادی مانگ رہے ہیں اور ہم دے نہیں رہے۔

ناموں کی قلت کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ جو نام انسانوں کے ہونے چاہئیں وہ محکمہ ریلوے نے اپنے اسٹیشنوں کے رکھ لئے ہیں۔ رحیم یار خاں، راجہ رام، ہیر سنگھ وغیرہ۔ سندھ میں ایک اسٹیشن کا نام تو مع القاب کے ہے، نواب ولی محمد خاں۔ ہمارے ایک دوست بیان کرتے ہیں کہ مجھے ایک روز وہاں جانا تھا۔ ٹکٹ بابو سے کہا کہ مجھے نواب ولی محمد خاں کا ٹکٹ دو۔ اس نے کہا۔ آپ کون ہوتے ہیں۔ کیا نواب صاحب کے اردلی ہیں؟ ہمارے ایک آدمی کو ان کے ہاں نوکر رکھوا دیجئے گا۔ میں نے کہا یہ کسی آدمی کا نہیں، اسٹیشن کا نام ہے۔ بولے اچھا؟ معاف فرمائیے گا۔ نتیجہ اس جیس جیس کا یہ نکلا کہ گاڑی نے سیٹی دی اور ہمارے دوست کے دیکھتے دیکھتے چھوٹ گئی۔

سوچا جائے تو راہ مضمون تازہ ایسی بھی بند نہیں۔ نقش فریادی کسی ایسے بچے کا نام ہو سکتا ہے جو روتا بہت ہو اور لمبی ناک والی بچی کو مرقع چغتائی کا نام دے سکتے ہیں۔ زیادہ لمبے بالوں والی صاحبزادی کو بال جبریل کہنے میں ہرج نہیں۔ اور اگر کسی لڑکے کا نام ضرب کلیم رکھا جائے تو بڑا ہو کر حساب میں یقیناً ہوشیار نکلے گا۔ ہمارے دوست انتظار حسین کی شادی بعد بے شمار انتظار کے سال گزشتہ عالیہ بیگم سے ہوئی ہے۔ ان کو تو نہیں ان کے دوستوں کو فکر ہے کہ اس جوڑے کے بچوں کے نام کلاسیکی قسم کے ہونے چاہئیں، ہم نے بچے کے لئے فسانہ آزاد اور بچی کے لئے طلسم ہوش ربا تجویز کیا تھا۔ لیکن لوگ مطمئن نہ ہوئے۔ آخر اتفاق اس پر ہوا کہ لڑکا ہو تو ادب عالیہ نکلائے اور بچی ہو تو شب انتظار۔

خطبہ حضرت بھینس الملک

ایک بہرے میاں ایک صاحب کی عیادت کو گئے۔ راستے میں سوچتے گئے کہ وہاں کس قسم کی گفتگو ہوگی۔ میں پوچھوں گا کہ اب کیسی طبیعت ہے؟ بیمار کہے گا کہ الحمد للہ اچھی ہے۔ میں پوچھوں گا معالج کون ہے؟ وہ کسی ڈاکٹر یا حکیم کا بتائے گا۔ اس پر میں کہوں گا کہ اچھا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں شفا ہے۔ پھر میں پوچھوں گا کہ کھانے کو کیا بتایا ہے؟ بیمار جواب دے گا کہ دال کھجوری، کیونکہ عموماً بیمار کو یہی بتایا جاتا ہے۔ میں کہوں گا مناسب، وغیرہ۔

چنانچہ حضرت نے جاتے ہی علیک سلیک کے بعد بیمار کا پوچھا۔ اس نے کہا۔ بہت بری حالت ہے مر رہا ہوں۔ بہرے میاں بولے الحمد للہ۔ علاج کس کا ہے؟ بیمار نے چڑ کر کہا۔ ملک الموت کا، یہ بولے خوب۔ بڑا تجربہ کار معالج ہے۔ کھانے کو کیا بتایا ہے؟ بیمار بالکل ہی جل کر بولا ”خاک“۔ بہرے میاں نے کہا، بہت مناسب ہے بس یہی کھاتے رہئے۔ اچھا خدا حافظ۔

یہ قصہ جو مشہور مولانا روم کا ہے۔ ہمیں اس لئے یاد آیا کہ لاہور میں گزشتہ ماہ کچھ اس سے ملتی جلتی واردات ہوئی ہے۔ ایف۔ سی کالج نے اپنی جو ملی کی تقریب کی صدارت اور ایک نئے بلاک کے افتتاح کے لئے ایک بہت مشہور آدمی کو بلائے کی تجویز کی۔ جس کا نام آپ کچھ فرض کر لیجئے۔ چلئے اے بی خاں سہی۔ یہ بہت لائق فائق ہستی ہیں۔ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر رہے ہیں۔ تعلیمات کا بھی بڑا کام کیا ہے۔ اور ان کو بلائے کی تقریب یہ تھی کہ اس کالج کے اولڈ بوائے یعنی بڑھے بچے تھے۔ کونسل نے چٹھی لکھی کہ آپ جو ملی کے جلسے کی صدارت کر کے ہماری عزت افزائی فرمائیے اور طلبہ سے خطاب کیجئے۔ یہ چٹھی دفتر میں پوسٹ کرنے کے لئے دی گئی۔ ہند میں دفتر والوں نے پرنسپل صاحب کو بتایا کہ اے بی خاں صاحب نے بطیب خاطر آنا اور افتتاح کرنا منظور کر لیا ہے۔ ان کا خط ہم نے فائل میں لگا دیا ہے آپ تیاری کیجئے۔

چنانچہ تیاری شروع ہوئی۔ ایک زنانے کا خطبہ استقبال لکھا گیا کہ آپ کی ذات گرامی ملک ہی کے لئے نہیں، ہمارے کالج کے لئے بھی باعث فخر ہے۔ آپ نے وہ کام کیا جو رستم سے نہ ہوگا۔ ملک بھر میں تعلیم کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جا بجا کالج اور کتاب گھر قائم کر کے نور کی روشنی پھیلانا آپ ہی کا کام تھا۔ انگریزی ڈرامے پر آپ کی شہرہ آفاق تصنیف ولایت کی کتابوں کی نکر ہے۔ آپ نے اور آپ کی بیگم نے ملک میں ادبی ذوق کو عام کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ یوں آپ کے والد بھی بڑے نامور شاعر تھے۔ لیکن آپ نے تو بالکل ہی کمال کر دیا وغیرہ۔۔

جلے کے روز بڑے اہتمام سے لوگ ہارے کر دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ وقت معینہ پر ایک کار آئی جس میں سے ایک کالا کلونا بیگن لوٹا آدمی نکلا۔ اور ہار والے آدمی کے پاس جا کر بولا۔ ”لایئے ڈالیئے ہار“ پرنسپل صاحب نے پوچھا۔ یہ تو اے بی خاں صاحب کے لیے ہیں۔ اس شخص نے جیب سے کالج کی چٹھی نکال کر دکھائی اور کہا۔ بندہ اے بی خاں ہی تو ہے۔ میں ضلع فلاں میں اسٹنٹ وٹرنری سرجن ہوں۔ وہاں سے سیدھا آرہا ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے اولڈ بوائے ہونے کے ناطے یہاں بلایا اور یہ عزت بخشی ورنہ من آنم کہ من دانم۔ یہ رہا میرا خطبہ صدارت۔ اسے حاضرین میں تقسیم کر دیجئے۔“ اس کے بعد جب سے ایک فنیخی نکالی اور کہا۔ ”کہاں ہے فیتہ جسے کاٹنا ہے۔ جلدی کیجئے۔ مجھے واپس جا کر ایک نیل کا پرنیشن بھی کرنا ہے۔“

پرنسپل صاحب اور دوسرے لوگ سن ہو کر رہ گئے۔ لیکن کیا کر سکتے تھے۔ کیونکہ تھے یہ بھی آٹھوں گانٹھ اے بی خاں، اور اس میں شک نہیں کہ اس کالج کے اولڈ بوائے بھی تھے۔ قہر درویش ان کو لے جا کر کرسی صدارت پر بٹھایا۔ پرنسپل صاحب نے اپنا خطبہ استقبال یہ کر کے رکھ دیا۔ اور بے دلی سے زبانی کچھ کلمات ادا کئے۔ اب صاحب ممدوح کی باری تھی۔ انہوں نے بڑے دھڑلے کی تقریر کی کہ آج کل ملک کی سب سے بڑی ضرورت تندرست مویشی ہیں۔ لوگ اور باتوں کی طرف تو دھیان دیتے ہیں، کالج قائم ہو رہے ہیں، کارخانے لگ رہے ہیں، خارجہ پالیسی ٹھیک ہو رہی ہے لیکن افسوس کہ مویشیوں کی بیماریوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ خود میرے ضلع میں بیس فیصدی بھینسیں اچھارے کا شکار ہیں۔ اے نوجوانو، اس مرض کا انسداد ضروری ہے۔ اٹھو گرنہ حشر نہ ہوگا پھر کبھی۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پانی کا ایک گلاس پی کر رشتہ تقریر کو یوں جوڑا کہ آپ لوگوں کو

میری ذات سے سبق لینا چاہیے۔ ہر چند کہ میرا شمار اس کالج کے نالائق ترین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ لیکن آج میں اس تقریب کی صدارت کر رہا ہوں۔ پڑھائی اور چیز ہے لیاقت اور چیز ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی کو ایک کار کے دلف کر دیا ہے۔ اور وہ ہے مولیشیوں کی بہبود۔ مجھے خوشی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دی۔ ابا مرحوم اور دادا مرحوم اپنے اپنے زمانے کے نامور سلوٹری تھے۔ ان کے ہاتھ میں شفا تھی۔ جس گھوڑے یا گدھے پر ہاتھ رکھ دیا وہ تندرست ہو کر چہنہانے لگا۔ یہی حال میرا ہے۔ میرے کالج کو میری قدر افزائی کا خیال بڑی دیر سے آیا۔ لیکن آیا تو۔ دیر آید درست آید۔ اب اے عزیز طالب علمو، میری نصیحت۔ پلے باندھ لو۔ مولیشی پالو کیوں کہ مولیشی قومی دولت ہیں۔“

تقریر کے آخر میں صاحب مدوح نے کالج کے ہوٹل کے لئے ایک دو دھیل بھینس کے عطیے کا اعلان کیا اور فرمایا کہ اسے میری نشانی تصور فرمائیے۔ جب آپ اسے دیکھا کریں گے، میری یاد تازہ ہو جایا کرے گی۔ صدارت کے خطبے ہمیشہ علامہ اقبال مرحوم کے اشعار پر ختم ہوتے ہیں۔ ان صاحب نے بھی بیٹھنے سے پہلے حکیم الامت کے ایک حسب حال شعر کا سہارا لیا:-

جلسہ ختم ہوا۔ مہمان خصوصی رخصت ہو گئے۔ ڈاک بھیجنے والا کلرک معطل ہوا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ پرنسپل صاحب نے ہر چند کہ خطبہ استقبالیہ نہ کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ چھپا ہوا تھا اس لئے کالج کے دفتر نے تمام اولڈ بوائز کو ڈاک میں بھیج دیا۔ کچھ دن کے بعد انہیں اے بی خاں صاحب کا عتاب آمیز خط آیا کہ آپ لوگ اچھے آدمی ہیں۔ بلا تے مجھے ہیں خطبہ استقبالیہ میں کسی اور شخص کی تعریف کرتے ہیں۔ جانیے میں نہیں دیتا بھینس ایسے ناشکروں اور نالائقوں کو۔

ایک انار و صد بیمار

ہمارے ملک میں ڈاکٹروں کی کمی ہے۔ کراچی جیسے ترقی یافتہ شہر میں بھی سات سو آدمیوں کے پیچھے ایک ڈاکٹر کی اوسط ہے۔ جب کہ مغرب کے ملکوں میں ہر سو پچاس پر ایک ڈاکٹر ہوتا ہے۔ ایسے بھی دیس ہیں جن میں ہر پانچ سات آدمیوں کے پیچھے ایک ڈاکٹر ہے بلکہ ایک آدھ ملک تو ایسا بھی سنا ہے جہاں ایک ایک آدمی کے پیچھے دو دو ڈاکٹر ہیں۔ جدھر وہ جاتا ہے یہ اپنے تھیلے لٹکائے پیکاریاں بھرے ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔ دونوں کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ مجھ سے علاج کرائے۔ اگر مریض ایسا ہی ڈھیٹ ہوا کہ بہت دن بیمار نہ ہو تو ان ڈاکٹروں ہی میں سر پھنسل ہو جاتی ہے اور پھر یہ دونوں بیٹھ کر ایک دوسرے کی مرہم پٹی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو فیس دیتے ہیں اور یوں ان کا گزارہ چلتا ہے۔

بہر حال ہمارے لئے یہ ترقی کی منزل ابھی دور ہی ہے۔ افق کے اس پار ہے۔ ہمارے ہاں تو بیماروں کے لئے ڈاکٹروں کا ابھی اتنا اوسط بھی نہیں جتنا اناروں کا ہے۔ محاورے میں ایک انار و صد بیمار آتا ہے جو یک ڈاکٹر و صد بیمار کے مقابلے میں خاصی اونچی مقدار ہے۔ اسی لئے تو ڈاکٹر جتنوں کا علاج کر سکتا ہے کرتا ہے باقی انار کھاتے ہوئے مر جاتے ہیں۔ دنیا سے سفر کر جاتے ہیں۔

ایک بزرگ جنہوں نے پچھلے دنوں کراچی میں عطائیوں کی مردم شماری کی ہے فرماتے ہیں کہ صحیح محاورہ یک انار و صد بیمار ہے اور انار و اصل انار ڈی کا مخفف یا اسم مکمل ہے۔ یہ بات ہمارے بھی بتی لگتی ہے۔ کیونکہ کراچی قندھار تو ڈی ہے جو انار کے ذکر کا موقع ہو۔ پھر انار ہم نے فقط دو طرح کے دیکھے ہیں۔ سفید دانوں والے اور سرخ دانوں والے لیکن انار یا عطائی ہزار رنگ اور ہزار شبیہ ہوتے ہیں۔ ایلو پیتھی ہو، میو پیتھی، فٹ پاتھی، حکیم وید، عامل، کامل، منجم، بخار، طب چین والے۔ طب جاپان والے، تعویذ والے۔ انگوٹھیوں والے، ان سب کو ملا لیا جائے تو ہمارے خیال میں فی کس ایک کی اوسط پڑے گی۔ یعنی جتنے بیمار اتنے انار بلکہ کیا عجب دو کی پڑ جائے یعنی ایک کا دار و دو۔ اس ریل پیل کے ہوتے اگر ڈاکٹر کم بھی ہیں تو ہرج کی کچھ بات نہیں۔ قبرستان کی آباد کاری ہی تو منظور ہے سو دیر سویر سے

کیا فرق پڑتا ہے۔ مخدومی حضرت حفیظ جالندہری کے الفاظ میں۔

ناکامی عشق یا کامیابی! دونوں کا حاصل خانہ خرابی

خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی۔ کچھ لوگ ڈاکٹروں کے ہاتھوں مرنا پسند کرتے ہیں کچھ حکیموں کے ہاتھوں۔ کچھ ایک سے مایوس ہو کر دوسرے کو آزما رہے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں ایک بزرگ تھے۔ بیماری تو ان کو جانے کیا تھی۔ شاید گیس کی تھی۔ معدہ ان کا سوئی گیس کی ٹنکی بنا ہوا تھا۔ لیکن سارا سارا دن فار کو مایا اور حکمت کی کتابیں لئے اپنے مرض کے نئے نئے نام تلاش یا ایجاد کرتے رہتے تھے۔ پہلے ڈاکٹروں سے رجوع کیا، ان سے کچھ نہ ہوا۔ پھر ہومیو پتھوں کے پاس گئے، وہ بھی ان کا کچھ نہ پاؤ سکے۔ حکیموں کے جو شانڈے اور غیسانڈے بھی ان کے مرض زیست کا مدد ادا یا ازالہ نہ کر سکے۔ آخر فٹ پاتھ کے ایک سنیا سی بابا نے اپنے خاندانی ٹونکے سے ان کی مشکل آسان کی۔ کچھ گولیاں دیں جو ہمارے خیال میں بارود کی تھیں اور ایک شیش عرق کی تھی جو ستورے کے تیزاب کا اثر رکھتا تھا بلکہ شاید شورے کا تیزاب ہی تھا۔ ان بزرگ نے رات کو ایک ہی خوراک استعمال کی تھی کہ دوسرے دن کی ہمیں دفتر سے چھٹی لینی پڑی۔ آخر اتنے قدیمی مسائے کے جنازے کو کندھا تو دینا ہی تھا۔ ایک طرف ہم تھے۔ دوسری طرف سنیا سی بابا تھے۔ واپس آ کر ہم نے اپنے کندھے پر ماش کرنے کے لئے سانپ کی جوبی بھی انہی بابائی سے لی تھی۔

ہم نے جب کبھی کسی پیشہ ور کے متعلق کالم لکھا۔ یہی جواب ملا کہ ہم چونکہ اس کے ہم پیشہ نہیں ہیں اس لئے جلتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے ہمیں یہی طعنہ دیا۔ نقادوں نے ہم پر یہی حرف رکھا۔ اب شائد عطائی بھی یہی کہیں کہ ہم چونکہ عطائی نہیں اس لئے ان سے جلتے ہیں، ان کی قدر نہیں کرتے۔ ان کا یہ کہنا زیادتی ہوگا۔ ہم باقاعدہ اشتہار نہیں دیتے یا اپنے نام کے ساتھ فخر الاطبا یا بنگالی بابائیں لکھتے تو اس کی وجہ ہماری طبیعت کا انکسار ہے یا پھر یہ بات ہے کہ ابھی ہمارے سامنے روزگار کے ایسے راستے ہیں جو سیدھے سیدھے قبرستان نہیں جاتے یا لے جاتے ورنہ حکمی علاجوں اور ٹونکوں سے ہماری بیاض بھی خالی نہیں۔ ہمارے رفیق کار میاں رفیق الدین کے گھنے پر معمولی سی چھنی نکلی تھی۔ ہم نے اس کے لئے مرہم دیا تو وہ پھوڑا بن گئی۔ اس پر ایک پوڈریج پڑنے کو دیا تو اس کے آس پاس کچھ اور پھوڑے نکل آئے۔ آخر ان کے عزیزوں نے انہیں ہسپتال میں داخل کیا، وہاں آپریشن ہوا اور تین چار مہینے ہی میں وہ بھلے چنگے

ہو کر آ گئے۔ ہم دوا انہیں نہ دیتے تو ان کو آپریشن کی نوبت کیسے آتی اور انہیں صحت تام کیسے عطا ہوتی۔ یہ باریک باتیں ہمارے قاری تو سمجھ لیتے ہیں لیکن ان کے عزیزوں کی سمجھ میں نہ آئیں۔ پچھلے دنوں انہیں کھانسی ہوئی تھی۔ ہم نے نسخہ لکھ دیا کہ آم کے اچار میں چند قطرے گندھک کے تیزاب کے ذال کر تولہ بھرا فیم کے ساتھ چٹ کر جاؤ، مرض جڑ سے اکھڑ جائے گا۔ وہ تو راضی ہو گئے تھے لیکن کسی کیسٹ یا عطار نے نسخہ بگاڑ دیا۔ کسی کے پاس آم کا اچار تھا تو گندھک کا تیزاب نہ تھا۔ گندھک کا تیزاب تھا تو انیم نہ تھی۔ پھر ان عزیز کے ایک بڑے بھائی میز می طبیعت کے تھے۔ فرمانے لگے۔ آپ کیسے معالج ہیں۔ ہمیں مرض کو جڑ سے اکھاڑنا مقصود ہے۔ مریض کو نہیں۔ اب انہیں کیسے سمجھانے کہ ضرب مرض کی جڑ پر لگانی چاہیے۔ اگر مریض مذکور نہ ہوتے تو کھانسی کہاں سے آئی۔ معمولی دواؤں سے آج ان مریض کی کھانسی رفع ہو جائے تو کل کچھ اور ہو جائے گا۔ بخار ہو جائے گا۔ پھر دوا کے لئے بھاگتے پھریں گے۔ پرانے زمانے کے حکماء پائیدار علاج کیا کرتے تھے۔ آج کل تو تھمبو کرنے کا رواج ہے۔

خیر بہت سے مکملے والے ہمیں بھی عطائی یا عطا لاطباء کہنے لگے۔ اس لحاظ سے اس میں کچھ غلطی بھی نہیں کہ ہمارے تمام تر نسخے اور ٹونکے ایک سنیاخی بابا کا عطیہ ہیں جو جیل جاتے ہوئے ہمارے سپرد کر گئے تھے۔ جیل ان کو اس پاداش میں ہوئی تھی کہ انہوں نے ایک مریض کا حکمی علاج کیا تھا اور حکمی علاج میں تو یہی ہوتا ہے کہ اللہ کا حکم ہو تو مریض بچ جاتا ہے ورنہ..... ہمارے عطائی بھائی ایک یہ نسخہ اپنی گرہ میں باندھ لیں کہ علاج صرف ایسے مریضوں کا کیا کریں جن کے قریبی رشتہ دار پولیس میں نہ ہوں۔ مافلوں کے لئے اشارے کافی ہوتے ہیں۔

پچھلے دنوں کراچی کے اخباروں میں ایک حکیم صاحب کا مضمون چھپا کہ کراچی والوں کو مرچیں کھانی چاہئیں۔ ہم نے تو اسی روز ایک بوری منگالی اور کھانی شروع کر دیں۔ لیکن ان کے بعض حریفوں کے مرچیں لگیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ مرچ تو بڑی سیتانسی چیز ہے۔ اس آخری بیان کے خلاف ایک طرف مرچوں کے بیوپاریوں نے احتجاج کیا دوسری طرف بو اسیر کا علاج کرنے والوں نے برا منایا کہ یہ ہماری روزی مارنے کی ناروا کوشش ہے۔ ادھر ہم حیران ہیں کہ مرچوں کی باقی بوری کا کیا کریں۔ ڈاکٹروں میں اس قسم کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب کو نوسنیہ تشخیص ہوا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے کہا اس کو لحاف اڑھاؤ اس کے آگے انگیٹھی رکھو۔ دوسرے نے کہا ارے یہ کیا کرتے ہو۔ اس کے

سینے پر برف رکھو۔ وہ مریض مر گیا۔ اب یہ دونوں ڈاکٹر اس کا کریڈٹ ایک دوسرے کو دے رہے ہیں۔ ہم اس جھگڑے میں کیوں پڑیں۔ ہمارے نزدیک تو دونوں سچے ہیں۔

اخبار میں آیا ہے کہ کراچی کی بکرا پیڑھی میں ایک ڈاکٹر ہے کہ خود کو **M-B-D-S** لکھتا ہے۔ جانے اس کا کیا مطلب ہے۔ بکرا پیڑھی کے حوالے سے ہمارا قیاس یہ ہے کہ کوئی قصاب ہوگا۔ بقر عید کا کاروبار تو چند روز کا کاروبار ہے۔ اتنے دنوں خالی کیوں بیٹھے۔ الٹی چھری سے مریضوں کو کیوں نہ ذبح کرے۔ ممکن ہے کہ **D** کا مطلب ڈنگر ہو۔ دوسرے ڈاکٹر کے متعلق اس اخبار کا بیان ہے کہ اس نے اپنے نام ڈاکٹر فلان الدین کے نیچے موٹا موٹا لکھا ہے **M-B-B-S** لیکن نام اور ڈگری کے درمیان خفی لفظوں میں رقم ہے **BETTER THAN** یعنی بہتر از۔ اس سے معلوم ہوگا کہ ہمارے ہاں ایمانداروں کی کمی نہیں۔

پٹے سے سیکھے شیوہ مردانگی کوئی
جب قصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

دعوتوں پر پابندی

(۲)

مغربی پاکستان کی حکومت نے دعوتوں میں کھانے پلانے کے لئے دوسو مہمانوں کی پابندی لگا دی ہے۔ اس پر بعض لوگ بہت پریشان ہیں۔ ایک صاحب نے کہا غریب آدمی ہوں۔ لڑکی کی شادی کر رہا ہوں اور پچیس تیس آدمیوں کو بلانے کا ارادہ تھا۔ لیکن اب حکومت دوسو پر اصرار کر رہی ہے۔ کیا کروں؟ ہم نے انہیں سمجھایا کہ کہیں سے دوسو تک پورے کر دو۔ قانون کی پابندی تو لازمی ہے۔ لیکن اس نے استطاعت کا عذر کیا۔ ایک بار ایک ڈرائیور بھی چالیس میل کی رفتار سے بس دوڑاتا پکڑا گیا تھا۔ یہ کراچی سے باہر کی بات ہے۔ حاشا وکلا کراچی میں اس پر روک ٹوک نہیں۔ سنتری نے چالان کی کتاب جیب سے نکالنے ہوئے کہا۔ تم نے بورڈ نہیں دیکھا جس پر لکھا ہے کہ حد رفتار پچیس میل۔ بولا جناب میں اسی احتیاط کے چکر میں تو پکڑا گیا ہوں کہ حد رفتار پچیس میل کی حد سے نیچے نہ آنے پائے۔

دوسری طرف وہ لوگ پریشان ہیں جنہوں نے پانچ پانچ سو آدمیوں کو بلا رکھا تھا اب جو تخفیف کا کھلاڑا کھٹ سے آن گرا تو حیران ہیں کہ کس کو بلائیں کس کو ح کر یں۔ قانون سے بچنے کے طریقے تو بہت ہیں۔ لوگ خود سمجھدار ہیں ہمارے بتانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جو لوگ ذرا پابند قانون ہیں، پھر کارڈ چھوانے کے لئے پریسوں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ خود ہمارے پاس کل ایک کارڈ آیا۔ باہر تو اس کے نوید مسرت ہی لکھا ہے۔ اندر کا مضمون یہ ہے۔

عزیزی سلیقہ خاتون کے میاں دولت بخش سے نکاح کی خوشی میں اتوار کو غریب خانے پر ویسے کا انتظام کیا گیا ہے۔ براہ کرم شرکت نہ فرما کر ممنون فرمائیں۔

یہ احتیاط تو خیر میزبان نے کی ہے، مہمانوں کو بھی احتیاط لازم ہے۔ ہم نے سرکاری حکم نامہ تو پابندی کا نہیں پڑھا لیکن ایسا بھی تو ممکن ہے کہ پولیس چھاپا مارے تو میزبان صاف کہہ دے کہ جناب

کھانے والے تو یہ لوگ ہیں ان کو لے جائیے جہاں لے جانا ہے۔ میرا تو انہیں بلانا فرض تھا۔ خود ان لوگوں کو تو عقل چاہیے تھی۔ انہوں نے تو اخبار میں پابندی کا آرڈر ضرور پڑھا ہوگا۔ چلے آئے ہیں مفت کی کھانے۔

ہم نے غور سے تو نہیں پڑھا کہ کس کس قسم کی دعوتوں اور کس کس قسم کے کھانے پر پابندی لگی ہے۔ ہم کبھی کبھی مرزا غالب کی یاد میں دعوت مڑگاں کیا کرتے ہیں، اس میں اناج کا کوئی کام نہیں۔ فقط گوشت یعنی جگر لخت لخت و رک رک ہوتا ہے۔ منگل اور بدھ ناغے کے دن ہیں۔ اس میں ہم خود احتیاط کر لیتے ہیں۔ امید ہے نئی سرکاری پابندی کا اطلاق اس پر نہ ہوگا۔ آج کل رمضان کے دن نہیں ورنہ روزہ خور بھی پریشان ہوتے۔ ہم بزم ادب لالو کھیت کی طرف سے ایک مشاعرہ بھی کر رہے ہیں اور شاعر اکرام کے لئے تین سو دعوت نامے چھپوا لیے تھے کہ آئے اور اپنا کلام کا کر خود خوش ہوئے دوسروں کو خوش کیجئے۔ ایک لخت آرڈر پہنچا کر خبردار اگر دوسو سے زیادہ آدمی مدعو کئے۔ کیونکہ شاعری اور موسیقی کا شمار روحانی غذا میں ہے۔ پیشہ ور غمخواروں کو بھی سوچ سمجھ کر کہیں جانا چاہیے۔ سنا ہے شہر میں کل ایک میت ہو گئی تھی۔ ایک چھوٹے موٹے قومی لیڈر انتقال کر گئے تھے اور لوگ مصفیٰ بچھائے بیٹھے غم کھا رہے تھے۔ ایک سرکاری کارندے کا گزرا ادھر سے ہوا۔ پوچھا کیا بات ہے؟ ایک صاحب نے کیفیت بتائی۔ کارندہ فرض شناس قسم کا تھا۔ اس نے گنا دو سو بیس آدمی تھے۔ بولام لوگوں کو قانون کی خلاف ورزی کرتے شرم نہیں آتی۔ دوسو سے زیادہ آدمیوں کو ایک ساتھ کچھ بھی کھانے کی اجازت نہیں۔ خواہ غم ہی کیوں نہ ہو چلو تھانے۔

دعوتوں میں مہمانوں کی تعداد پر پابندی تو خیر کبھی کبھی لگتی ہے۔ دفعہ ۱۱۴۴ ایک عام بات ہے بلکہ اگر بہت دن نہ لگے تو تشویش ہونے لگتی ہے کہ جانے کیا بات ہے۔ اس کی زد میں تم ہوئے ہم ہوئے کہ میر ہوئے بھی آتے ہیں۔ جہاں پانچ سے چھ آدمی ہوئے گرفتار۔ ایک بار چنگ دیکھنے کے لئے چھ آدمی فٹ پاتھ پر ایک ساتھ کھڑے ہو گئے تھے فوراً قانون کی زد میں آ گئے۔ ایک جگہ فلم قید خانے کے لئے نکت گھر کے باہر قطار لگی تھی۔ پولیس والے لپٹ پٹ گئے کہ فلم پر سب سے کیوں ضائع کرتے ہو اہل قید خانہ بھی کچھ دور نہیں۔ ایک زمانہ میں تو اس دفعہ کی بہت لوگوں کے دلوں پر ایسی بیٹھی ہوتی تھی کہ پانچ سے چھ آدمی کھانے کی میز پر بھی نہ بیٹھتے تھے۔ ان ہی دنوں ایک بزرگ بھاگے بھاگے ہمارے پاس آئے تھے کہ پانچ بچے ماشاء اللہ پہلے سے ہیں۔ بیوی زچہ

خانے میں ہے۔ تھانے والوں سے کہیے کہ تعرض نہ کریں۔ اسی زمانے میں ہمیں خیال آیا تھا کہ اگر یہ دفعہ صحیح معنوں میں اور ذرا وسعت دے کر نافذ کی جائے تو فیملی پلاننگ کے محکمے کی ضرورت نہیں۔ فیملی پلاننگ والے تو درخواستیں کرتے اور استدعا ئیں کرتے پھرتے ہیں۔ تعدد اولاد پر دفعہ ۱۴۳ کا اطلاق ہونے لگا تو خود ہی پولیس والے صورت حال سنبھال لیں گے۔

کوڑے والی گلی سے کوچہ ابن انشا تک

ایک انگریزی اخبار میں ایک خبر دلپذیر باتصویر شائع ہوئی ہے جس سے معلوم ہوا ہے کراچی میں ایک سڑک کے دو دو نام ہیں اور ایک ایک نام کی دو دو سڑکیں ہیں۔ دو کی حد تک مضائقہ نہیں۔ ہم بھی گھر میں اس بچے کو جس کا ہم اسکول میں مرزا نصیر الدین جہاندار بیک ہے، نو نو کہہ کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور اپنے پرانے ہم سبق شیخ اسرار علی فاروقی قادری چشتی نظامی بلگرامی کو میاں مٹھو کہہ کے بلاتے ہیں کیونکہ اس زندگی مستعار میں کسی فانی انسان کے نام پر اس سے زیادہ وقت صرف کرنا ممکن نہیں۔ لیکن رپورٹر صاحب نے ایک سڑک ایسی ڈھونڈ نکالی ہے جس پر تین مختلف ناموں کے ٹھپے ہیں۔ ایک جگہ انگل روڈ لکھا ہے کہ پرانا نام ہے دس قدم پر ”ملبو الاروڈ“ کا بڑا سا بورڈ نصب ہے۔ تھوڑا آگے چلے تو اتنا ہی بڑا ”شہید سرور روڈ“ کا نشان ملے گا۔ اگر رپورٹر صاحب اتنی تحقیق کے بعد تھک نہ گئے ہوتے اور چائے پینے پر پس کلب میں نہ داخل ہو جاتے جو اسی سڑک پر واقع ہے تو عجب نہیں آگے ان کو اور بھی دو چار پٹے دوسرے ناموں کے ملتے۔ خیر تین بھی بہت ہیں۔ اب تک فقط مایا کے تین نام ہوتے تھے۔ اب سڑک بھی محاورے میں آگئی۔

ایک سڑک کے تین تین نام۔ سڑکا۔ سڑکو۔ سڑک رانم

لیکن اسی کراچی میں ایسی سڑکیں اور ایسے کوچے بھی ہیں جن پر ایک بھی بورڈ نہیں۔ ہماری ہی گلی کو لیجئے۔ اسے لوگ کوڑے والی گلی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ جمعدار لوگ ساری بستی کا کوڑا لا کر یہیں پھینکتے ہیں۔ بر محل ہونے کا باوجود یہ نام اچھا نہ لگتا۔ لہذا ایک روز اس امر کے اعتراف میں کہ ہم اردو کے مایہ ناز ادیب ہیں اور ہم نے قوم اور ملک کی بے لوث خدمت بھی بہت کی ہے۔ ایک سرے پر کوچہ ”حضرت ابن انشاء“ کی تختی لگا دی۔ ہمارا مقصد نام و نمود ہر گز نہ تھا۔ کیونکہ اس سے ہم دور بھاگتے ہیں۔ فقط لوگوں کی رہنمائی مقصود تھی۔ لیکن دوسرے روز کیا دیکھتے ہیں کہ کوچے کے دوسرے سرے پر گلی استاد

امام دین پہلوان کا بورڈ لگا ہے۔ لوگوں کو خود تو کچھ سوچنا نہیں ہاں نقل کے لئے ہشیار ہیں۔ ایک تو ہماری طبیعت میں غفور و اداری اور درگزر کا مادہ بہت ہے۔ دوسرے معاملہ ایک پہلوان کا تھا لہذا ہم نے سوچا کہ کچھ مضائقہ نہیں۔ اعلان کرادیں گے کہ ادھر پل کی طرف سے آئے تو کوچہ حضرت ابن انشاء میں مڑ جائیے اور پاپوش نگر کے قبرستان کی طرف سے آئیے (آپ کا زندہ ہونا شرط ہے) تو استاد امام دین پہلوان کی گلی کا نشان دیکھ لیجئے۔ لیکن پھر تو یہ ہوا کہ ہر شخص کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں کرسی کی ضرورت پڑ گئی۔ ہر شخص نے اس کوچہ کو اپنے نام نامی سے موسوم کرنے کا جتن کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ نبی بخش صدیقی داروغہ آب کاری کے گھر کے سامنے یہ گلی کوچہ شیخ نبی بخش صدیقی تھی اور جہاں ان کے گھر کی سرحد ختم ہوتی تھی وہاں ملک اللہ دتہ اسٹریٹ کا بورڈ لگا نظر آیا کیونکہ وہاں سے ملک اللہ دتہ تاجر جرم کا بنگلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی گھر سے کچھ آگے یہ گلی حوالہائی حاجیانی روڈ بنی اور اسی کا نام آگے چل کر گلی بندو خان شیر فروش اور کوچہ فخر الاطبا حکیم سید ارشاد علی نشتر نظامی سہارن پوری ہو گیا۔ نشتر صاحب کے گھر سے آگے جن صاحب کا گھر تھا انہوں نے ذاتی نام و نمود کو برادری کے مفاد پر قربان کیا۔ اور اپنی لائٹری کی رعایت سے کوچہ دھویاں کا بورڈ لگا دیا۔ یہ بورڈ باقی سارے بورڈوں سے بڑا اور نمایاں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ نبی بخش صدیقی کے لڑکے کی منگنی ٹوٹے ٹوٹے رہ گئی۔ اور آخر معززین کوچہ کے متفقہ فیصلے سے یہ سب تھکلیاں اتار لی گئیں۔

دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے۔

آئین پر ہماری رائے تو لی ہی نہیں گئی

نئے آئین کو اسمبلی نے منظور کر لیا اور لوگ باگ خوش خوش بھر رہے ہیں۔ جشن منا رہے ہیں۔ لیکن ہماری اطلاع کے مطابق ملک میں کم از کم چار افراد ایسے ہیں جن کو یہ آئین منظور نہیں ہے۔ ان میں ایک تو ہمارے راڈ صاحب ہیں جو اسمبلی کے اندر ہیں۔ باقی تین باہر ہیں۔ ان میں ایک بی بی ہیں بھاو پور کی، جن کا کہنا ہے کہ اسمبلی میں ۵۰ فیصدی عورتیں ہونی چاہیں۔ کیونکہ عورتوں کی آبادی ۵۰ فی صد ہے۔ دوسرے ہمارے بھتیجے پوہماں ہیں، جن کا کہنا ہے کہ نیا اسمبلی آئین نہیں ہے کیونکہ بالغ حق رائے دہندگی کی بنا پر بنی ہے، نا بالغوں کو سراسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ ان کا فرمانا ہے کہ اگر پچاس فیصدی نمائندگی مردوں کو اور پچاس فیصدی عورتوں کو دی جاتی ہے تو ڈیڑھ سو فیصدی کے قریب بچوں کو ملنی چاہیے جو فی خاندان تین کا اوسط ہے۔ اس آئین کو ناپسند اور نامنظور کرنے والے تیسرے اور آخری آدمی ہم خود ہیں۔ کیونکہ ہم نے ایک زمانے میں آئین کے لئے جو رہنما اصول پیش کئے تھے وہ اس میں شامل نہیں کئے گئے اور اگر شامل کئے گئے ہیں تو جملہ شرطیہ یعنی اگر مگر اور بشرطیکہ کے بغیر۔ حالانکہ یہی اگر مگر جمہوریت کی جان ہے اور ہر آئین و قانون میں ہوتی ہے تاکہ گلشن کا کاروبار چلا رہے۔

ہمارے رہنما اصول جو ہم نے ۱۹۷۰ء کے وسط میں پیش کئے تھے اور اس زمانے کی حکومت کے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ تھے، حسب ذیل تھے۔

- (۱) کسی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر جیل نہ بھیجا جائے گا۔ تاکہ حاکم وقت ایسا کرنا ضروری نہ سمجھے۔ !!
- (۲) تعلیم بالکل مفت ہوگی جب تک کہ بچہ گھر میں بیٹھ کر پڑھے۔ فیسوں اور چندوں کا سلسلہ پرانسی جماعت سے پہلے شروع نہ ہوگا۔ البتہ نرسیاں (پودوں والی نہیں بچوں والی) اور کنڈرگارٹن اسکول بچے کی تاریخ پیدائش ہی سے فیس وصول کرنے کے مجاز ہوں گے۔
- (۳) ہر فرد کے لئے روزگار کا بندوبست کیا جائے گا بشرطیکہ وہ کسی افسر یا سینئر کا عزیز اور قربت دار ہو اور زیادہ پڑھا لکھا نہ ہو۔

(۴) جاگیریں اور زمینداریاں محدود کردی جائیں گی انکے موجودہ مالکوں تک۔ کسان ہاری وغیرہ کسی قسم کا مطالبہ نہ کر سکیں گے۔

(۵) مزدوروں کو یونین بنانے کی آزادی ہوگی۔ بشرطیکہ وہ مالکان سے کوئی مطالبہ نہ کریں۔ موجودہ تنخواہ میں کام کرتے رہیں گے اور چھانٹی کی صورت میں شور نہ مچائیں۔

موجودہ آئین میں یہ ساری باتیں نامکمل صورت میں شامل ہیں یعنی اگر مگر بشرطیکہ تا آنکہ وغیرہ کے لوازم کے بغیر۔ بھلا ایسے آئین کو کون پسند کرے گا۔ سوائے غیر مفاد پرست طبقوں کے۔

۱۹۴۷ء سے اب تک آئین بنانا ہمارا اکل وقتی شغل رہا ہے۔ جن دنوں آئین نہ بن رہا ہوتا آئین بننے کی باتیں ہوتی ہیں اور جن دنوں باتیں نہ ہو رہی ہوں آئین بن جاتا رہا ہے۔ دوسرے ملک تو ایک آدھ آئین بنا لیتے ہیں، اس سے مدت العمر کام لیتے ہیں۔ امریکہ نے اب تک ایک ہی آئین بنایا ہے۔ حالانکہ کاروں کے ماڈل ہر سال نئے لاتا ہے۔ ہندوستان بھی ترقی کے اتنے دعوں کے باوجود ایک سے زیادہ نہیں بنایا اور برطانیہ میں تو قاعدے کا ایک بھی آئین نہیں۔ وہ میکنا کارنا ہی سے کام چلا رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں ایک آئین ۱۹۵۴ء میں بنا۔ ایک ۱۹۵۶ء میں پھر ایک ۱۹۶۲ء میں۔ جناب بیکٹی خاں کے زمانے میں تو اور ترقی ہوئی اور آئین سازی کو گھریلو دستکاری کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ جہاں پارا ڈی مل بیٹھے پہلے تو تاش کی گڈی کی جلاش ہوئی۔ وہ نہ ملی تو آئین بنانا شروع کر دیا۔ چار تارے چرخ سے ٹوٹے چرغاں ہو گیا۔ انکیشن کے دنوں ایک مولانا ناظم آباد کے حلقے میں تقریر کر رہے تھے کہ اے بھائیو۔ مجھے اسمبلی میں بھیجو تاکہ اسلامی آئین بنواؤں۔ ایک بدتمیز نے پوچھا حضرت قانون اور دستور کا فرق تو بتائیے۔ مولانا نے سوال کرنے والے کو اپنی شکل دکھانے کو کہا۔ کوئی نہ اٹھا تو فرمایا کہ سوال کرنے والا سوشلسٹ معلوم ہوتا ہے۔ آخر ان الفاظ میں وضاحت کی کہ دستور دستور ہے اور قانون قانون ہے۔ دستور قانون کیسے ہو سکتا ہے اور قانون دستور کیسے ہو سکتا ہے۔ لوگ عیش عیش کرتے چلے سے اٹھ گئے اور پنڈال خالی ہو گیا۔

انہی دنوں ایک لیڈر نے کراچی میں عورتوں کے ایک جلسے سے خطاب کیا اور فرمایا کہ مرد تو اپنی ہی کوشش کر کے ہار گئے۔ اب عورتوں کو چاہیے کہ میدان میں آئیں اور آئین بنائیں۔ وہ یہ کہہ کر اور زندہ باد کر کے چلے گئے۔ بی بیوں نے آؤ دیکھنا نہ تاؤ، اس کام میں جٹ گئیں۔ جسے دیکھو پکا ناگہانہ ہڈھٹا چھوڑ کر اس فکر میں ہے کہ دو ایوانی مقتدر رکھے یا ایک ایوانی جس کے اندر وہ بیٹھے اور مرد کو باہر رو بانی پر

بٹھائے۔ بے شک مرد بھی سیاست میں حصہ لیں لیکن سیاست درہاں کی حد تک۔ کسی کو آواز دو کہ بوا چلو، جامع کتاہ مارکیٹ میں کپڑے کی سیل لٹی ہے۔ تو وہ فوراً جواب دے گی کہ بی بی تم چلو میں ابھی آئین بنا کر اور ننھے کوچھی کرا کے آتی ہوں۔ جہاں دو نیک بیبیاں مل بیٹھیں گویا دبستان کھل گیا۔ سروت چل رہا ہے اور یہ بحث بھی کہ بنیادی حقوق کے باب میں کیا لکھا جائے۔ آیا مردوں کو کسی قسم کے حقوق دینے کی ضرورت ہے یا ان کا فرائض ہی سے کام چل جاتا ہے۔ بعض اوقات تو سر پھٹول بھی ہو جاتی تھی۔ ایک روز آنے آنے سامنے کے دو فلیٹوں کی بیگمات کو ہم نے دیکھا کہ ہاتھ نچانچا کر ایک دوسرے کے خاندان کے اسرار خودی اور رموز بے خودی فاش کر رہی ہے کہ اری تیرے باوانے بھی کبھی بتایا ہے آئین؟ ہم سمجھے کوئی مفت کا جھگڑا ہو گا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنجیدہ اختلاف ہو گیا ہے اس بات پر کہ دفاع اور کرنسی، مواصلات مرکز کے پاس رہیں یا صوبوں کے پاس۔

دیکھتے دیکھتے لوگوں میں سیاست کا ایسا مذاق پیدا ہوا کہ انہیں دنوں ضرورت رشتہ کے ایک اشتہار میں ہم نے دیکھا کہ لڑکی مطلوب ہے جو آئین سازی کی ماہر ہو محض گھنٹہ، پابند صوم و صلوة اور قبول صورت نہیں ہونی چاہیے۔ ماؤں کی دیکھا دیکھی بچوں میں بھی آئین سازی کا دلولہ ایسا بیدار ہوا کہ ادھر چھنی ہوئی اور انہوں نے ہانک لگائی کہ آؤ آئین آئین کھیلیں۔ کوئی بچہ شام کو دیر سے گھر آتا اور ڈانٹ پڑتی تو فوراً جواب دیتا، ابو میں تو سلو کے ساتھ باغ میں بیٹھا آئین بنا رہا تھا۔ جھوٹ نہیں، آپ پوچھ لیجئے اس سے۔ مجھے تو آپ کا ڈر تھا ورنہ میں اور سلو مرکز اور صوبوں میں تقسیم اختیارات ختم کر کے آتے۔

غیر صاحبان۔ اب جو آئین بن گیا ہے اور اس میں رائے کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے تو ہماری رائے بھی سنئے۔ ہم نے دیکھا کہ حقوق کی بات تو بھی کرتے ہیں فرائض کی بات کوئی بھی نہیں کر رہا اور اگر کرتا ہے تو بایں عنوان کہ حقوق میں لے لیتا ہوں، فرائض آپ کی نذر ہیں مگر قبول اقتدز ہے عز و شرف۔ اپنے مزدور اور محنت کش بھائیوں سے بھی اگر وہ ہمارا گھیراؤ نہ کریں عرض کریں گے کہ حقوق پر زور دیا جا چکا۔ اب چند سائے فرائض پر بھی تھوڑا زور ہو جائے کہ سوشلسٹ ملکوں میں یہی ہوتا ہے۔ اب جو کچھ ملے گا پیداوار میں سے ملے گا۔

اب موسم کا حال سینے

یہ جو ہم اتنے دن کالم نہیں لکھ سکے اس کی وجہ یہ نہیں کہ کہیں باہر چلے گئے تھے۔ جائیں ہمارے دشمن۔ ہم کیوں ملک سے باہر جائیں۔ بس۔ یہیں کراچی میں بیٹھے بارش کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں ہمارے چھاتا دوسرے میں برساتی۔ کوئی ہاتھ خالی ہوتا تو لکھتے۔ چھاتا تو ہم نے اسی روز تان لیا تھا جس روز پہلی بار ٹیلی ویژن پر ناؤ سر ضیاء الحسن صاحب نے بشارت دی کہ کل صبح نہ صرف مطلع ابر آلود رہے گا بلکہ گرج چمک کے ساتھ بارش بھی ہوگی۔ خیر ایک دن کی غلطی ہم سب کی معاف کر دیجے ہیں کیونکہ میر چشم آدمی ہیں۔ دوسرے دن خورشید طلعت صاحبہ نے اس بشارت کو دہرایا۔ ہم نے کہا یہ لڑکی جھوٹ نہیں بول سکتی کیونکہ ابھی اس کی عمر جھوٹ بولنے کی نہیں ہوئی۔ پس ہم نے گھر والوں کو لاکارا کہہ آج تو جو ہوا سو ہوا۔ اب یہ تمہاری سہل انگاری نہیں چلے گی۔ چار پائیاں اٹھا کر ڈرائیونگ روم میں رکھو (ہمارے ہاں اور کہیں جگہ نہیں) تاکہ بان بھیک کر اکر نہ جائے اور لان پر دریاں بچھا دو کیونکہ زیادہ پانی سے گھاس گل جاتی ہے۔

اس سے اگلے روز علی الصبح ہم اٹھ کر نہار منہ لمہار گانے بیٹھ گئے۔ جب گا گا کر کھلا بیٹھتا معلوم ہوا تو ہم نے پوچھا:-

”کیوں بھی لوگو بارش بند ہو گئی؟“

جواب ملا۔ ابھی شروع ہی نہیں ہوئی۔

تان سنی گولیاں منہ میں رکھ کر اور ایک اور تان اڑا کر (اسٹریٹ گھر آئے بدرا) ہم نے کہا

”بادل تو خوب گھر گھرا آئے ہوں گے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوگا۔“ بتی جلا دو احتیاطاً۔“

جواب ملا ”جی نہیں۔ بادل بھی نہیں آئے۔“

ہم نے کہا۔ ”کم از کم پروائی تو سگی ہوگی۔ نرم نرم پروائی۔ کول کوکی ہوگی۔ سپہیا بھی بولا ہوگا۔“

پی۔ پی۔ پی۔

معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ پانی بہا تک دعا دے کیا۔ غالباً احمد رضا قصوری گروپ میں

شامل ہو گیا۔

اگلی شام پھر خورشید طلعت نے بتایا کہ کل گرج چمک کے ساتھ بارش ہوگی۔ شاید اولے پڑنے کا بھی کہا تھا۔ کچھ یاد نہیں ہے۔ ہم احتیاط پسند آدمی ہیں۔ انٹرنیشنل ہیزکنگ سلیون کے خلیفہ اللہ داسہار پوری سے جا کر سر بھی منڈوا آئے کہ ویسے نہیں پڑتے تو یوں پڑیں۔ اپنے کمرے کی کھڑکیاں جو سڑک کے رخ کھلتی ہیں وہ ہم نے پہلی ہی روز بند کرادی تھیں تاکہ پانی اندر نہ آئے۔ ہمارے گھر والے کچھ ٹیڑھی طبیعت کے آدمی ہیں۔ حجت کرنے لگے کہ آپ خواخواہ خود کو ہلکان کر رہے ہیں۔ بارش نہ آئی نہ آئے گی۔ ہم نہ کہا تو یہ موسمیات والے اور ٹیلی ویژن والے جھوٹ کہتے ہیں؟ جواب ملا۔ دیکھا نہیں خورشید طلعت صاحبہ بارش کی بشارت دینے کے بعد خود بھی مسکرا رہی تھیں۔ ہم نے انہیں بتایا کہ وہ موسمیات والوں پر نہیں مسکرا رہی تھیں۔ ان کو ٹیلی ویژن کی طرف سے آرڈر ہوتا ہے، بات۔ بے بات مسکرانے کا۔ ہمارے گھر کے لوگ ایسے وہی ہیں کہ منڈیر پر بھنیر ہی چھوڑ کر ابھی آ بیٹھے تو یہ جان کر کہ سادون آیا اور بارش ہوگی مال پوڑوں کے لئے آٹا گھولنے بیٹھ جاتے ہیں اور موسمیات والوں نے جو ہزاروں لاکھوں روپوں کی مشینیں موسم کا حال معلوم کرنے کے لئے لگا رکھی ہیں ان کو کھڑاگ سمجھتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ آدمی ایک دن غلط بیانی کر سکتا ہے دو دن کر سکتا ہے۔ آج تیسرا دن ہے۔ کان دھر کر سن لو۔ آج تو انہوں نے نہایت ہی وثوق سے کہہ دیا کہ پورے جنوبی علاقے میں گرج چمک کے ساتھ بارش ہوگی۔ جل تھل ہو جائے گا۔ لوگ ڈکیاں کھاتے پھریں گے۔ اس پر ایک عزیز نے کہا: جنوبی علاقے کا مطلب آپ نے کراچی کیوں فرض کر لیا۔ مراد پاکستان کے جنوب سے ہے۔ جہاں سمندر ہے۔ خط استوا ہے۔ لٹکا ہے۔ بلکہ ممکن ہے جنوبی علاقے سے مراد خط استوا سے جنوب کا علاقہ ہے۔

ہم ایسے کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ دوسرے دن صبح چھانٹا لے کر بارش کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ آپ کہیں گے کمرے کے اندر چھانٹا لے کر بیٹھنے کا کیا مطلب؟ آپ لوگ نہیں جانتے۔ گرمی میں جب بارش آتی ہے تو بہت آتی ہے۔ دیواریں رسنے لگتی ہیں اور چھتیں ٹپکنے لگتی ہیں اور ہمارے پاس ایک ہی سوٹ ہے۔ کوئی نو یا دس بجے ہوں گے کہ ایک صاحب آئے، نچڑتے ہوئے۔ ہم نے کہا۔ بھٹی تم

بڑے بیوقوف ہو۔ ایسی بارش میں گھر سے چھاتے بغیر نکل آئے۔ ارے بارش کی پیش گوئی نہیں سنی تھی کیا؟ اب دیکھو تم نے فرش خراب کر دیا۔ سارا پانی تمہارے انگر کھے کا ہمارے قالین پر بہہ گیا۔ بدخیزی سے بولے۔ ”جناب یہ بارش نہیں پسینہ ہے اور یہ قالین نہیں دُری ہے۔“

ہمارے تین کی ایک وجہ یہ تھی کہ کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن والوں نے اخباروں میں لمبا چوڑا اشتہار چھپوا دیا تھا کہ موسلا دھار بارش کی وجہ سے بجلی خراب ہو جائے تو فلاں علاقے والے ہمارے فلاں ایمر جنسی سنٹر پر فون کریں اور فلاں علاقے والے فلاں ایمر جنسی سنٹر کو کاروائی سے یاد فرمائیں۔ سنا ہے اخبار والوں نے بھی پارسل والی تصویریں بارش کی نکال رکھی تھیں اور ادارے بھی لکھ کر کا تب کو دے دیئے تھے کہ بارش سے جھوپڑیوں کا از حد نقصان ہوا ہے۔ ایڈمنسٹریشن والے اپنے فریضہ سے غافل ہیں۔ حالانکہ ان کو ٹیلی ویژن پر بارش کا اعلان سننے ہی رضائیاں اور کھانے کی دیکھیں لے کر مختلف کالونیوں میں پہنچ جانا چاہے تھا۔ قصہ پارسل کی تصویروں کا یہ ہے کہ اخبار والے ایک سیٹ بارش کی تصویروں کا رکھتے ہیں تاکہ دوسرے اخباروں سے پیٹے نہ رہیں۔ آپ نے شاید غور سے نہ دیکھا ہو یہ تصویریں جن میں دو آدمی گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چھاتے لئے سڑک پار کر رہے ہوتے ہیں یا پانی میں پھنسی ہوئی موٹریں اور پانی میں کھیتے ہوئے بچے اور گرے ہوئے مکان اور جھوپڑیاں ایک بار بنائی جاتی ہیں اور برسوں کام آتی ہیں۔ کیونکہ ہر بارش میں فوٹو گرافر کا نکلنا مشکل ہے۔ کسیرہ پانی سے خراب ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ریڈیو والے دراز میں سے نکال کر جھٹ سے ریکارڈنگا دیتے ہیں اور آپ اپنی سادہ لوحی میں سمجھتے ہیں کہ بھائی چھیلا لپٹا لے ڈالا مائیکروفون کے سامنے اسٹوڈیو میں بیٹھا گا گا کر بے حال ہو رہا ہے۔

ایک دن تو ہم نے حضرت آرزو لکھنوی کا نسخہ بھی آزمایا۔

آج یہ کس نے ساغر پھینکا موسم کی بے کیفی پر

ایسا برسا ٹوٹ کے ناول ڈوب گیا میخانہ بھی

ساغر کا مطلب ہے پیالہ۔ پیالے تو ہمارے ہاں کوئی نہیں ہیں اور اگر چائے کی پیالیوں سے

مطلب ہے تو انہیں ہمارے گھر والے تالے والے والی الماریوں میں رکھتے ہیں۔ ایک گلاس مل گیا تو اسی کو ہم

نے کھینچ مارا۔ المونیم کا گلاس تھا۔ آواز ہوئی تو لوگ بھاگے بھاگے آئے۔ بولے آج پھر ملی آگئی تھی دودھ پینے؟ ہم نے جب دیکھا کہ آسمان پر بادل کے ٹوٹ کر برسنے کے آثار ابھی ہوئے انہیں ہوئے تو کہا۔ ہاں ملی ہی تھی بڑی نابکار ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ شراب والے ساغر سے مراد ہے اور پھینکتے سے اس میں شراب ہونی چاہیے چاہے دسی ہو۔ اور آس پاس میخانہ بھی ہونا چاہیے۔ میخانہ نہیں ہوگا تو ڈوبے گا کیا؟ تو یہ قصور ہمارا ہی تھا۔ نسخہ کے سارے اجزاء ہم نہیں کئے۔ تاہم مایوسی کی کیا بات ہے۔ پوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔

صاحبو۔ اتنا ہم نے اس لئے لکھ دیا کہ بہت دن سے لکھا نہیں تھا۔ اور صورت قدرت کی طرف سے یہ بنی کہ ایک مہربان دوست اس پر تیار ہو گئے تھے کہ ہمارا چھٹا تانے کھڑے رہیں گے تاکہ چھت ٹپکنے پر ٹپکا ہمارے سر پر نہ آئے۔ دم تحریر بھی وہ کھڑے ہیں لیکن کہہ رہے ہیں کہ میں تھک گیا ہوں۔ اب اپنا چھٹا تانہ خود تھا مینے۔ لا بھیجی لا۔ دے دے چھٹا تانہ میں۔ ارے قرون اولیٰ کے دوست تو اپنے دوستوں پر جان تک قربان کر دیتے تھے۔ تو گھڑی بھر کو چھٹا تانہ بھی پکڑ کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اچھا بھی ہم قلم ہاتھ سے رکھتے ہیں۔ اور چھٹا تانہ مٹتے ہیں اور ہماری تان سنی گولیوں کی شیشی کہاں گئی؟ مل گئی۔ اب جا بھاگ جا۔ ہمارا گانے کا نام ہو گیا ہے۔

امر کھمزد گھر آئے بدر.....